غالب اور انقلابِ ستاون

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن
ایم اے، پی ایچ۔ ڈی
پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لائل پور

سنگِ میل پبلی کیشنز
چوک اردو بازار۔ لاہور

[۱۹۷۴ء کی داؤد ادبی انعام یافتہ کتاب]

طبع دوم، باضافہ و ترمیم: ۱۹۷۶ء

بار اوّل : ۱۹۷۴ء

نیاز احمد
نے نذرت پریس، لاہور
سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت : =/۱۸ روپے

مُندرجات :

حرفے چند بر طبعِ دوم :	ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن	صفحہ ۷
دیباچہ بر طبعِ اوّل :	ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن	۹
۱ - اِنقلاب ستاون کے روزنامچۂ غالب "دستنبو" کا تعارف		۲۳
۲ - "دستنبو" کا اُردو ترجمہ مع حواشی		۷۵
۳ - اِنقلاب ستاون اور خطوطِ غالب		۱۱۹
۴ - اِنقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویّہ		۱۷۳
ضمیمہ (۱) :	غالب کا ایک نادر مضمون درباب تباہیٔ شہرِ دہلی	۱۹۹
ضمیمہ (۲) :	ملکہ وکٹوریہ کا اعلان اور بیگم حضرت محل کا فرمان	۲۰۵
ضمیمہ (۳) :	نثرِ غالب درباب تحسین و تائیدِ سرکارِ انگریزی	۲۱۵
کلماتِ استقبال :		۲۱۹
اِشاریہ :	INDEX	۲۵۷

اُستادِ محترم

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب قبلہ

کی نذر

ع

"بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

مشاغل:

ریسرچ اسکالر، ترقی اُردو بورڈ، کراچی	۱۹۶۳ — ۶۴ء
لیکچرار شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، بہاول نگر	۱۹۶۴ — ۶۵ء
لیکچرار شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور	۱۹۶۵ — ۶۶ء
لیکچرار شعبۂ اُردو، ایف سی کالج، لاہور	۱۹۶۶ — ۱۹۷۳ء

موجودہ مصروفیت: وائس پرنسپل، پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج، لائل پور

تصنیفات و تالیفات:

۱۔	بابائے اُردو — احوال و افکار	طبع دوم: ۱۹۷۶ء،	۱۹۶۴ء
۲۔	سید وقار عظیم (سوانحی خاکہ)		۱۹۶۷ء
۳۔	نقدِ عبدالحق		۱۹۶۸ء
۴۔	خیالستان (ترتیب مع مقدمہ)	طبع دوم: ۱۹۷۶ء،	۱۹۶۸ء
۵۔	اِشاریۂ غالب[1]		۱۹۶۹ء
۶۔	مطالعۂ یلدرم[2]		۱۹۷۱ء
۷۔	غالبیات کا تحقیقی مطالعہ[3]		۱۹۷۲ء
۸۔	غالب اور انقلاب ستاون[4]	طبع دوم: ۱۹۷۶ء،	۱۹۷۴ء
۹۔	آپ بیتی ۔ ... صدیقی	طبع دوم: ۱۹۷۶ء،	۱۹۷۴ء
۱۰۔	ذکرِ عبدالحق		۱۹۷۵ء
۱۱۔	فرموداتِ عبدالحق		۱۹۷۶ء

مستقل پتا: بہاول نگر: رحمٰن اسٹریٹ نمبر ۱، بہاول نگر

لاہور: پوسٹ بکس ۹۹۷، لاہور۔ ۲

---

[1] "اشاریۂ غالب" پر ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے عطا کیا۔
[2] "مطالعۂ یلدرم" پر ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اساتذہ میں عالمانہ تحقیق و تصنیف کا پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے عطا کیا۔
[3] اس مقالے پر ۱۹۷۲ء میں جامعہ سندھ نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند عطا کی۔
[4] "غالب اور انقلاب ستاون" پر داؤد ادبی انعام مبلغ پانچ ہزار روپے عطا کیا گیا۔

حرفِ چند (برطبع دوم):

ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن

کتاب کا پہلا ایڈیشن ایک سال کے اندر اندر ختم ہوگیا اور علی گڑھ کی اصطلاح میں موٹی عقل کے "عافیت سوز" اور بھاری بھر کم ہم پیشہ اور اُن کے ایک نیم ہم نوا" دراز قد ناقد" بھی کتاب کی کسی نہ کسی خوبی کے معترف ہوئے اور اسے یکسر نظر انداز نہیں کرسکے۔ اس ایک آدھ استثنیٰ کے علاوہ جہاں دل کی تنگی کا مظاہرہ ہوا، بحیثیتِ مجموعی اس کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

اس کتاب کو داؤد ادبی انعام سے ممتاز اور سرفراز کیا گیا، ریڈیو اور ٹی وی پر اسے دور و نزدیک زیرِ بحث لایا گیا، بزرگوں اور دوستوں نے اس پر حوصلہ افزا کلمات تحریر کیے اور ملک ہی نہیں، بیرونِ ملک میں بھی اِسے کھلے دل سے سراہا گیا —— اس طرح کی بعض تحریروں سے چند اقتباسات اب "کلماتِ استقبال" کے تحت کتاب اور صاحبِ کتاب کی توقیر بڑھا رہے ہیں۔

O

اِس موقع پر ہجوم در ہجوم مجھے جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی یاد بے اختیار کیے دے رہی ہے جن کے "کلماتِ استقبال" کے ساتھ کتاب پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ افسوس کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۷۵ء کو اُن کے انتقال سے غالب شناسی کے ایک کلاسیکی دور کا خاتمہ ہوگیا اور "الہامی کتاب" کے نام سے کلامِ غالب کا جو نیا معتبر ایڈیشن اُن کے پیشِ نظر تھا، وہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ بایں ہمہ غالب پر اُن کا موجود کام، اور غالب سے وابستہ اُن کا نام، اَمٹ ہے، جسے زوال نہیں۔ "غالب اور انقلابِ ستاون" پر اُن کا تاثر اُن کی آخری ادبی تحریر اور تبرک کے طور پر، اب ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

O

یہ ایڈیشن، نئے ماخذات کی روشنی میں ضروری ترمیم اور اضافے کے بعد پیش کیا جارہا ہے۔ اس اشاعت میں سرکارِ انگریزی کی تائید اور تحسین میں غالب کی ایک کمیاب تحریر (مطبوعہ: اودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۳- اپریل ۱۸۶۲ء) بطورِ ضمیمۂ سوم ایزاد کی گئی ہے۔ اس بار کتاب کا اشاریہ بھی شاملِ اشاعت ہے، اس کا تقاضا ہوا تھا اور یوں بھی اس کی بے حد ضرورت تھی۔ اُمید ہے کہ بصورتِ موجودہ کتاب زیادہ مفید اور پسندیدہ قرار پائے گی۔

بہاول نگر

۸۔ اگست ۱۹۷۵ء

دیباچہ:

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

پیشِ نظر کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے فارسی روزنامچے "دستنبو"[1] کے تعارف پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ "دستنبو" کے اردو ترجمے پر مبنی ہے۔ تیسرا حصہ سن ستاون کے بارے میں غالب کے غیر رسمی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ اس کا ماخذ غالب کے خطوط ہیں، اور آخری حصہ کتاب میں انقلاب ستاون اور غالب کے شعری رویے سے بحث کی گئی ہے۔

(۱)

"دستنبو" اپنے مضمون و موضوع اور اندازِ نگارش و گزارش ہر دو کی بنا پر تصانیفِ غالب میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ غالب نے یہ کتاب [illegible] آزادی کے دنوں میں روزنامچے کے انداز میں لکھی۔ کتاب میں بعد توطیہ و تمہید ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک مصنف کی سرگذشت بیان ہوئی ہے۔ بہ حیثیت اقتضائے مقام، کتاب میں عام واقعات و حالات اور زیرِ بنائے

---

[1] "دستنبو": (دَش۔ تَم۔ بُو) پنجۂ [illegible] جس [illegible] میں لے کر سونگھتے ہیں، شمامہ۔

(فرہنگ عامرہ، طبع چہارم، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۲۴۴)

"دست انبو و دست انبوی"۔ رک: "دست انبویہ" (یار دست انبو بدستم داد و دستم بو گرفت)۔

"دست انبویہ: گلولہ ای باشد مرکب از عطریات کہ آنرا بجہت بوییدن بر دست گیرند و بہ عربی شمامہ خوانند۔ و بہ میوہ ای راکہ توان بوییدہ عموماً۔ و نباتی باشد کوچک و گرد والوان شبیہ بہ خربزہ کہ آنرا دستنبوی گویند خصوصاً۔"

(برہان قاطع جلد دوم، مرتبہ دکتر محمد معین، تہران ۱۳۳۱ شمسی، ص ۸۵۶)

DASTAMBU : A Posy of Flowers.

[Ghalib—Life and Letters, London, 1969, p. 132

by : Ralph Russell and Khurshid ul Islam]

تقریب شہر و سپاہ کی رُوداد بھی آگئی ہے، اور یہ سرگذشت ایسی فارسیٔ قدیم میں بیان ہوئی ہے جس میں نہ خود غالب کی کوئی اور کتاب لکھی گئی اور نہ "دستنبو" کے لکھے جانے کے بعد سے آج تک برِعظیم پاک و ہند میں کسی اور نے کوئی کتاب اس زبان میں لکھی۔

O

رُوداد نگاری کی کیفیت بیان کرتے ہوئے، غالب نے "دستنبو" میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ:

"اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا اُن حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گذر رہے ہیں، یا اُن واقعات کا ذکر ہے جو سُننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی ہوں گی یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ میں دار و گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، اور سچائی میں نجات ڈھونڈتا ہوں۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب نے خدا کی پناہ نہیں چاہی بلکہ انگریز ناخداؤں کی پناہ چاہی جنہوں نے دار و گیر کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ غالب نے اپنی نجات ضرور ڈھونڈی لیکن یہ فی الوقت انہیں سچائی میں دکھائی نہیں دیتی تھی، اس لیے اُنہوں نے حالات کو جہاں تہاں نہ صرف "کچھ کم کر کے" بلکہ رنگ آمیزی کے ساتھ "بڑھا چڑھا" کر بھی پیش کیا۔

O

"دستنبو" پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں مطبع مفیدِ خلائق، آگرہ سے چھپی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پریس کی آزادی مسدود کی جا چکی تھی، ۱۳ جون ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل لارڈ کیننگ کے حکم پر جدوجہد آزادی کی تائید و ترغیب کے "جرم" میں ایک سخت پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا تھا۔ اخباروں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ انضباطی کارروائیاں عمل میں آ رہی تھیں۔ طابع، ناشر اور ایڈیٹر دار و گیر کا نشانہ بن رہے تھے۔ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اپنے ایک مراسلے (مورخہ ۴ جولائی ۱۸۵۷ء) میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو بغاوت کے حالات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"کلکتے کے ایک لیتھوگرافک پریس کا اجازت نامہ بھی ہم نے منسوخ کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس چھاپے خانے کا تمام سامان ضبط کر لیا جائے۔ یہ قدم ہم نے اس وجہ سے اُٹھایا کہ اسی چھاپے خانے میں ایک فارسی اخبار ۔۔۔ چھپتا تھا جس میں ۔۔۔ وہ انتہائی باغیانہ مضامین شائع ہوئے تھے[1]۔"

---

1. Parliamentary Papers, Vol. 44, pt., I, p. 363
(بحوالہ: اٹھارہ سو ستاون اور اخبارات، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، ص ۴۰۴)

"باغیانہ مضامین" کی اشاعت پر مقدمات چلائے جا رہے تھے، پریس کے اجازت نامے منسوخ ہو رہے تھے۔ اخبار جبری بندش کی زد میں آ رہے تھے اور بجائے خود پریس بھی سرکار ضبط ہو رہے تھے۔ ان حالات میں کسی ایسی کتاب کی اشاعت و طباعت کی ہند میں کیا گنجائش ہو سکتی تھی جو انگریز حکام عالی مدار کی تائید میں نہ ہو۔ چنانچہ جب ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے اپنے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا کہ :

"میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے ...... اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

تو تفتہ کا تذبذب میں پڑ جانا قدرتی اور یقینی امر تھا، غالب استادِ شاہ تھے، کہیں یہ رُوداد شہر بہادر شاہ کی تائید و تحسین اور کمپنی بہادر کے اقدامات کی تردید و تنقیص میں نہ ہو؟ تازہ عاید پریس ایکٹ کی موجودگی میں از قسم "باغیانہ" کسی تحریر اور وہ بھی کتابی حجم کی تحریر کی طباعت و اشاعت کے لیے کسی پریس کو آسانی سے کیوں کر تیار کیا جا سکتا تھا؟ تفتہ نے جواباً اس نوع کے خدشات کا اظہار کیا۔ اس پر غالب نے انہیں "دستنبو" کے اوراق بھیجے اور کتاب کے اندازِ نگارش و گزارش کی حقیقت اِن لفظوں میں بیان کی :

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہوا۔ اِس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے، اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں، اس واسطے ہے کہ اُس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر (لارڈ کیننگ) کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے جناب ملکہ معظمۂ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرزِ تحریر کیا ہو گی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہو گا؟"

(بنام: تفتہ، مابین ۱۷ اور ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء)

اس معنی خیز اور اطمینان بخش وضاحت کے بعد کتاب کی اشاعت میں رُکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ بایں ہمہ احتیاطاً :

"صاحبِ مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ (دستنبو کا مسودہ) آگرے کے حکام کو دکھایا (چھاپنے کی) اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔"

(بنام: مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اور کتاب "دستنبو" نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپ گئی ــــــ

اس پس منظر میں دیکھیے کہ "دستنبو" جون، ۱۸۵۷ء کے جابرانہ پریس ایکٹ کے باوجود چھپ سکی، صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع نامطبوع نہ ہوا اور انگریز حکام نے پیشگی ملاحظے کے بعد "بکمال خوشی" اس کے چھاپنے کی اجازت دی تو اسی بنا پر کہ "دستنبو" میں غالب بقول شخصے انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انہوں نے مصلحت کے قلم سے اسے لکھا ہے:

"دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے۔ مگر یہ چار جزو کا رسالہ (دستنبو) جو اب بھیجا ہے۔ اس کا دیکھنا ضرور در کار ہے۔ فارسی قدیم اور پھر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ، بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ"

(غالب، بنام: نواب محمد یوسف علی خاں، والئ رامپور، نومبر ۱۸۵۸ء)

حقیقت یہ ہے کہ کتاب، یک طرفہ، مدحیہ، تائیدی اور تحسینی ہے۔ اس میں انگریز حکام سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زورِ بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت میں صرف ہوا ہے۔

O

"دستنبو" کی غرضِ تصنیف، قلعہ معلیٰ سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹانا اور تحریکِ آزادی کو "رستخیز بے جا" قرار دے کر انگریز حکامِ با اختیار کی نظر میں سُرخرو ہونا تھا۔ اور سُرخرو ہونا، محض سُرخرو ہونے ہی کے لیے نہیں تھا، حکامِ وقت کو اپنی وفاداری کے یقین دلانے کی غایتِ اصلی، پنشن کے اجرا کی آرزو، اور خطاب و خلعت پانے کی تمنا تھی:

"کاش! میری ان تین خواہشوں، یعنی: خطاب و خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آ جائے، جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے...... اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دُنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا"

(خاتمۂ دستنبو)

انگریز حکام کے لئے "دستنبو" کی پُرتکلف جلدوں کے اہتمام اور انصرام، قصیدۂ تہنیتِ فتحِ ہند کی تصنیف، اس کے شہرت پا جانے کی آرزو و تدبیر، ملکۂ انگلستان اور عالی مقام حکام تک کتاب پہنچانے کی جلدی اور ذی شان صاحبانِ انگریز سے روابط بڑھانے اور رہ و رسمِ مراسلت کی فکرِ تجدید کی تفصیلات سے غالب کے خط بھرے پڑے ہیں۔ یہ سب ہوا تیں اپنے مقصودِ اصلی: پنشن، خطاب اور خلعت کے لیے راہ ہموار کرنے کی ہی کڑیاں ہیں۔ چنانچہ ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی اِس

کتاب کے مندرجات کو "حقیقتِ واقعی" کے بمنزلہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس سرگزشت کی تسوید و تحریر خاص مصلحتوں کی تابع رہی ہے۔ جس نے بطور کتابِ تاریخ اس کی اہمیت و افادیت کو شدید ضرر پہنچایا ہے بایں ہمہ اِس کی یہ اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ اس سے غالب کے کچھ سوانح پر روشنی پڑتی ہے، اور بالخصوص اُن کے افتادِ مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

O

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رُوداد نثر میں بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔"

(غالب، بنام: انورالدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"فارسی، بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسیٔ قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں رہا، تا بہ ہندوستان چہ رسد؟"

(غلام نجف خاں (؟)، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم، اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔"

(منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء)

"بطریق لزوم مالایلزم، اس کا التزام کیا ہے کہ بزبان فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسماء کے کہ وہ بدلے نہیں جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے۔"

(یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

"کتاب مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی۔"

(سرورق: دستنبو، نومبر ۱۸۵۸ء)

O

کتاب کو بالقصد اور بالاعلان قدیم فارسی میں پیش کرنا حکمت سے خالی نہیں تھا۔ اِس "وزنا مچے" کو دساتیر کی جناتی زبان میں لکھ کر غالب نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلی بات تو کمالِ فن کا اظہار و اشتہار،

یعنی غالب نے "دستنبو" کو اپنے اس احساس کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ فارسی کے علم میں یکتا و یگانہ ہیں اور خالص فارسی زبان پر جیسی قدرت اور دسترس انہیں حاصل ہے، آج اُس کی نظیر اور مثال، کیا ہند اور کیا پارس، کہیں نہیں۔

دوسری بات یہ کہ غالب جس معاشرے کے فرد تھے، وہ پرانے نظام کا حامی اور نئی عملداری سے نفور تھا۔ جمیع اہلِ ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، بہادر شاہ ظفر سے کسی نہ کسی درجے میں عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور ان کے دل بادشاہ کی عزت اور عظمت سے یکسر خالی نہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی ذاتی اہلیت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ "اُس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ ڈوبتا ہوا سورج سہی، لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصے سے سلطنتِ مغلیہ کے مدِمقابل آگئی تھیں (۱۸۵۷ء میں) بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں"[1]

شاہ کے مقابلے میں، فرنگیوں کے لیے، اہلِ ہند کے دل میں گو پہلے بھی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی دار و گیر نے اُن کے دلوں میں فاصلہ بہت ہی بڑھا دیا۔ انگریز حکام کی بے جواز تائید و تحسین میں کتاب لکھنے کا نتیجہ معاشرے میں انگشت نمائی کا باعث ہو سکتا تھا، اس سے بچنے کے لیے غالب نے یہ سرگزشت متعارفہ اور مُروّجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے، فارسیٔ قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسیٔ قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہلِ ہند کے لئے سربستہ راز رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے عہد کی متعارفہ اور مُروّجہ فارسی کی جگہ، بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی میں یہ رُوداد لکھنے میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس نادر و یگانہ روشِ تحریر کو اپنے کمالِ فن کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا اور دوسری مصلحت اس میں یہ تھی کہ معاصر اہلِ ہند کے لئے کتاب، قفلِ ابجد ہو کر رہ جائے۔ انگریز حُکام کو تو، جو اس کتاب کے مخاطب تھے، بہر نوع اپنے فارسی خواں عملے کے ذریعے اِس قفل کو کھلوانا ہی تھا، غالب کی چال یہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرزِ تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے سربستہ راز رہے تاکہ وہ اُن میں معصوم' اور ہدفِ ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔

۱- خلیق احمد نظامی، مُقدّمہ: ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۳۱

غالب کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ ایک طرف انگریز حکام نے اُن کے کمال فن کی داد دی۔ پنشن کی بحالی کی سفارش ہوئی۔ عالی مقام حکام سے رہ و رسمِ مراسلت بدستور جاری ہو گئی، اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہو گئی، قلعۂ مُعلّیٰ سے تعلق کی صفائی ہو گئی۔ عذرِ بے گناہی مسموع ہُوا۔ اک گونہ سکون ہوا۔ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ، پائی پائی مل گیا۔ آئندہ کے لئے خرخشہ نہ رہا، پچھلا خلعت بحال ہو گیا اور دوسری طرف کتاب اہل ہند میں بالعموم نہیں سمجھی گئی۔

(۲)

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سُن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہو گا، کیونکر کہوں کہ صاحب ("دستنبو" کی) اس عبارت کو سمجھے ہوں گے؟ اس کی جو حقیقت ہو مُفصّل لکھو ـــــ"

(غالب، بنام، آرام، ۱۳ اگست ۱۸۵۸ء)

"مبالغہ اس کتاب (دستنبو) کی تصحیح میں اس لئے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔"

(بنام: مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ کتاب (دستنبو) جو مُرسل الیہ کے مطالعے میں ہے۔ پھر بہ نسبت اُس دوسری کتاب کے قسمت کی اچھی ہے۔ یعنی خود ملاحظہ فرمارہے ہیں اور اگر کہیں پوچھنا ہو گا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔"

(بنام: بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

"جن کو اس (دستنبو) کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہلِ علم میں سے ہیں۔ لیکن یہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بیگانہ و ناآشنا ہے۔ خدا کرے، وہ جو اس کی سیر پر مامور ہیں ان اوراق کو بہ مشورت آپ کے دیکھا کریں۔ اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔

(بنام: بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

غالب کا احساس یہ تھا کہ "دستنبو" کی عبارت کو محض درست پڑھنا بھی بڑی بات ہے۔ فہم عبارت تو بہت دور کی بات ہے۔ سو وہ بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے اور طرزِ تحریر نادر نہ سہی، بیگانہ و ناآشنا ضرور ہے۔ اس لیے اہلِ علم و فضل بھی اس عبارت پر سے سرسری گزر سکتے ہیں اور ایسا ہی ہوا کہ کتاب اچھے اچھوں کی سمجھ سے بالا رہی۔ یہ اسی شعوری کوشش کے

ساتھ لکھی بھی گئی تھی۔۔

"دستنبو" مشیر الدولہ رائے امید سنگھ بہادر کی مالی اعانت سے چھپنا شروع ہوئی تھی۔ وہ دہلی کالج کے فارغ التحصیل اور والیِ اندور کے اتالیق تھے۔ لیکن "دستنبو" کی عبارت فہمی غالب کے نزدیک اُن تک کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ "دستنبو" رائے صاحب کو باقاعدہ پڑھائی جائے[1]۔

غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، منشی شیو نرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر، اور اُن کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل" تشکیل دے[2] دی تھی۔ جو آگرہ میں کتاب کی تحریر، تصحیح، تزئین، تصحیف، تجلید اور طباعت و اشاعت کے لئے سرگرمِ عمل تھی۔ ترتیب و کتابت اور اشاعت و طباعت کی ساری جزئیات ان اصحاب کے باہم مشورے سے طے پاتی تھیں۔ ایک ایسی شہادت موجود ہے کہ یہ "کونسل"، جو غالب کے بعد کتاب سے سب سے زیادہ متعلق تھی، "کتاب کی حقیقت" جاننے سے[3] معذور رہی۔

عہدِ غالب میں، جب کہ ہر طرف فارسی ہی کا چلن تھا، کتاب فہمی کی یہ سطح اور شرح رہی ہو تو روز بروز فارسی سے ناآشنا ہونے والی اُردو دنیا میں، اب اس کے سمجھنے والے جتنے ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر مروجہ اور غیر متعارفہ فارسی میں ہونے کی بنا پر "دستنبو" عہدِ موجودہ کے لیے عملاً خزانۂ دربستہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے براہِ راست اخذِ مطالب کرنے والوں کی تعداد آج بہت زیادہ نہیں۔

اِس ندرت اور ضرورت کے پیشِ نظر اگلے صفحات میں "دستنبو" کے تفصیلی تعارف کے ساتھ ساتھ پوری کتاب کا اردو ترجمہ بھی دیا جا رہا ہے تاکہ عام قاری بھی اس کتاب کے نہاں خانے میں جھانک کر جان سکے کہ غالب نے اس میں کہا کیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ "دستنبو" کا اِتنا مفصل جائزہ اور اس کا اردو ترجمہ کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ نامۂ غالب بنام تفتہ، مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء، یکم ستمبر ۱۸۵۸ء

۲۔ خطوط غالب، مولانا غلام رسول مہر، جلد اوّل، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۷۰، ۷۶، ۱۹۲، ۱۹۵

۳۔ نامہ غالب، بنام آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء

(۳)

"صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے.... اور پھر کام کیسا، کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خُدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل (دستنبو) کی طباعت پر توجہ فرماؤ۔" (غالب بنام تفتہ، ۱۳ ستمبر ۱۸۵۸ء)

غالب نے "دستنبو" کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور بنایا، اور یہ مقاصد و مطالب انگریزوں سے وابستہ تھے۔ اس لئے انہوں نے انگریزوں کی معقولیت کے گن گائے ہیں۔ اُن کے مظالم کے لئے جواز پیدا کئے ہیں، زیادتیوں کو بہت کچھ کم کر کے بیان کیا ہے اور اُن کی سختیوں کو فطری و معمولی قرار دیا ہے۔ جب کہ دیسی سپاہیوں کو شوریدہ سر، دیوانہ و آوارہ، بدباطن، بے رحم قاتل بتایا ہے اور انہیں خبیث، خنزیر اور نمک حرام فسادی ٹھہرایا ہے اور اُن کے طرزِ عمل کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ دراصل یہ کتاب قومی نقطۂ نظر سے لکھی ہی نہیں گئی۔ یہ اپنی مدافعت اور انگریز حکومت کی خیر خواہی میں ہے۔

اس کے برعکس ۱۸۵۷ء کے "فتنہ و فساد" کا ماتم کئی برس تک بطورِ خاص خطوطِ غالب کا موضوع رہا جو زیادہ تر اس احساس کے بغیر لکھے گئے کہ یہ کبھی چھپیں گے بھی۔ اس لئے اس موضوع پر خطوں میں غالب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بڑی حد تک اُن کی غیر رسمی اور سچی رائے ہے جس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

"دستنبو" اور خطوطِ غالب میں موجود متعلقہ مواد کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہم غالب کو کشمکش کا شکار پاتے ہیں۔ جذبات کا مطالبہ اور تھا، مصلحت کا تقاضا کچھ اور..... خطوں میں انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے حقیقی جذبات اور اُن کا سوزِ دروں چھلکا پڑتا ہے ـــــ "دستنبو" میں حقیقی جذبات ہنگامی مصلحت کے بوجھ تلے دب گئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹھیک کہا ہے کہ:

> "گو ضرورت و احتیاج نے انہیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹ پر گرا دیا تھا، اور مدحیہ قصیدے (نظم و نثر میں) لکھوائے تھے، تاہم میرزا صاحب "مشفق و مہربان" کے خطابات اور ساٹھ ستر روپے (کی پنشن اور) خلعت اُس زخمِ کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا، جو حوادثِ غدر سے اُن کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے، علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ کے موقعوں پر۔"
>
> (غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۶۷)

یہ تفصیلات ایک ایسے شخص کے قلم سے ہیں جو پُرزور اُسلوب کا مالک تھا، اس لیے متاثر اور متوجہ کرتی ہیں۔ یہ اس لیے بھی اہم ہیں کہ ہند اسلامی تمدن کے آخری ترجمان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ پھر یہ اطلاعات اس لیے بھی قابلِ توجہ ہیں اور عینی شہادت کا درجہ رکھتی ہیں کہ لکھنے والے نے دلی میں بیٹھ کر اُس وقت فراہم کی ہیں جب موجِ خوں سر سے گذر رہی ہے۔

یہ مواد بجائے خود تاریخ نہیں، لیکن تاریخ کے معتبر ماخذ کی حیثیت سے بے حد قیمتی ہے۔ یہ دہلی اور اہلِ دہلی کی تباہی کا دلگداز مرثیہ اور اُن کے طرزِ احساس کا نادر مرقع ہے جس کے نقوش کی بنیاد پر انقلاب ستاون کی معروضی تاریخ مُرتب کی جاسکتی ہے۔

جدوجہد آزادی کے ضمن میں خطوطِ غالب کے بیانات جابجا "دستنبو" کے مندرجات سے مختلف اور متصادم ہیں، اور یوں دونوں کے تقابلی مُطالعے سے غالب کی سیرت و شخصیت کی تحقیق و تعیین کا ایک نیا پیمانہ ہاتھ آتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے "حادثۂ کبریٰ" اور "مصیبتِ عظمیٰ" پر غالب کے دلی جذبات اور اصلی محسوسات کا اظہار اُن کے خطوں میں ہوا ہے ـــــــ انقلابِ ستاون کی جوجستہ جستہ رُوداد، خطوطِ غالب میں چھپی لیکن منتشر ہونے کی بنا پر چھپی ہوئی تھی اور اس انقلاب کے اثراتِ مابعد کی جو جھلکیاں غالب کے خطوں میں محفوظ لیکن بکھری ہوئی تھیں، زیرِ نظر کتاب کے تیسرے حصے میں، انہیں مُرتب اور یکجا کر دیا گیا ہے۔

(۴)

آخری حصۂ کتاب میں اِس اَمر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اس حادثۂ کبریٰ پر غالب کا شعری ردِعمل کیا رہا اور اس مصیبتِ عظمیٰ کا اُن کے شعر اور بحیثیتِ مجموعی اُن کی شعرگوئی پر کیا اثر پڑا؟ غالب معروف معنوں میں اُردو شاعر اور نثر نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انقلاب ستاون نے ہم سے شاعرِ غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور، اِس انقلاب کے بعد ہوا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ غالب کو اس تناظر میں پیش کیا جارہا ہے۔ اُمید ہے کہ کتاب کا یہ حصہ بھی شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

○

انقلاب ستاون کے موضوع پر غالب نے اپنے خطوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سے الگ دہلی کی تباہی کے بارے میں، غالب کی فقط ایک اردو تحریر ملتی ہے۔ یہ اُن کا ایک مختصر مضمون ہے جو انھوں نے دہلی سوسائٹی کے ایک جلسے (منعقدہ ۱۱ اگست ۱۸۶۵ء) میں سوسائٹی کے سرپرست کرنیل ہملٹن کمشنر دہلی کے ایما پر پڑھا۔ اس نادر تحریر کو کتاب کے ضمیمۂ اوّل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہند میں کمپنی راج کا خاتمہ ہوگیا اور ملکہ وکٹوریہ کے ایک اعلان کے مطابق برِعظیم براہِ راست تاجِ برطانیہ کے زیرِنگیں آگیا۔ اس پر غالب کا ردِّعمل ایک تہنیتی قطعے اور قصیدے کی صورت میں سامنے آیا جب کہ ملکۂ وکٹوریہ کے اعلان کے جواب میں اودھ کی ملکہ بیگم حضرت محل نے ایک ایسا فرمان جاری کیا جس کا ایک ایک حرف حضرت محل کی بیدار مغزی اور روشن ضمیری پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اعلان اور فرمان دیدنی ہے۔ یہ دستاویزیں جس شکل میں مل سکیں ضروری حواشی کے ساتھ بطور ضمیمۂ دوم، آخرِ کتاب میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یقین ہے کہ یہ تحریریں توجہ سے پڑھی جائیں گی اور سامانِ بصیرت فراہم کریں گی۔

O

انقلاب ستاون سے متعلق غالب کی چار نادر قلمی تحریروں کے عکس (صفحہ ۱۱، ۱۸، ۱۱، ۱۷۲) اور غالب کے حوالے سے تین تصاویر (صفحہ ۱۹۸، ۲۰۴، ۲۱۴) بھی شاملِ کتاب ہیں۔ یہ سب تحریریں اور تصویریں راقم کے ذاتی ذخیرۂ غالبیات کی زینت ہیں اور پاکستان کی حد تک پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ انھیں شوق اور دلچسپی سے دیکھا جائے گا۔

O

یہ کتاب برِعظیم کے نامور اور بزرگ ترین غالب شناس، مصوّرِ مشرق محمد عبد الرحمٰن چغتائی صاحب کے کلماتِ استقبال کے ساتھ سامنے آرہی ہے، اس لطفِ خاص کا شکر کیوں کر ادا کیا جاسکتا ہے! سیّد عابد علی عابد نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ: "دراصل یہ نزولِ برکات اور صدورِ حسنات ہے کہ ہم میں چغتائی جیسا فن کار موجود ہے جسے مغرب کے نقاد بھی چوٹی کا مصوّر تسلیم کرتے ہیں، اور جس کی تصاویر کی نمائش یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں ہو چکی ہے۔"

"مرقعِ چغتائی" (۱۹۲۸ء) اور "نقشِ چغتائی" (۱۹۳۵ء) کے نام سے دیوانِ غالب کی دو مصوّر

اور سدا بہار اشاعتوں کی ترتیب و تزئین اور کلامِ اقبال کے مصوّر ایڈیشن عملِ چغتائی (۱۹۷۰ء) کا سازندہ جاوید اور عہد آفریں کارنامہ انجام دینے کے بعد آج کل چغتائی صاحب کے پیشِ نظر یہ ہے کہ وہ "الہامی کتاب" کے نام سے کلامِ غالب کا ایک نیا ایڈیشن شائع کریں۔ اِس کا عنوان اُنھوں نے "کارِ چغتائی" تجویز کیا ہے۔ یہ کام، جس کی طرح وہ ڈال چکے ہیں، اُن کی آرزو کے مطابق پورا ہوگیا، اور خدا کرے پورا ہو جائے تو یہ بڑا کام ہوگا اور نہ صرف "بجنوری کی تنقید اور الہامی کتاب کی بشارت کو پورا کرے گا" بلکہ خود صاحبِ کار و کتاب کو بھی لازوال تر بنا دے گا۔

O

زہرا نے اپنے کالج کی معلّمی اور خانہ داری کے دوہرے بکھیڑوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے آرام و اطمینان کا ایسا ماحول فراہم کیا جس کے بغیر توجہ اور یکسوئی سے لکھنے پڑھنے کا کوئی کام کر لینا مجھ سے ممکن نہ ہوتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تشکر کے الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب زہرا کی رفاقت اور اعانت ہی کا حاصل ہے؛

روشن اسی کے دم سے ہیں شام و سحر مرے
پَرتو اسی کا کچھ مرے افکار میں بھی ہے

O

کاغذ کی اِس گرانی اور کمیابی کے زمانے میں نیاز احمد صاحب کا اس نیاز مند کی کتاب چھاپنا ——— ہو سکے کیا مدح: "فکر اچھی پر ستائش ناتمام"

O

کتاب طباعت کے لیے جا رہی ہے، یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے لیکن اِس مرحلے پر غالب کے رشتے سے کچھ رفتگاں کی یاد مجھے بے چین کیے دے رہی ہے۔ پچھلے دو اڑھائی برسوں میں آگے پیچھے دیکھتے ہی دیکھتے مولانا غلام رسول مہر (وفات ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء)، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء)، ڈاکٹر ایس ایم۔ اکرام (۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء)، ڈاکٹر شوکت سبزواری (۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء) اور پروفیسر حمید احمد خاں (۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء) راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ آج انھیں اپنے درمیان نہ پاکر دل خون ہو ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل میں غالب شناس کے طور پر جو آٹھ دس قد آور نام اُبھرے اُن میں مولانا غلام رسول مہر

ڈاکٹر ایس ایم اکرام، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور پروفیسر حمید احمد خاں کا اپنا ایک الگ اور منفرد مقام ہے۔ یہ اسما گزشتہ نصف صدی سے غالبیات پر چھائے ہوئے تھے اور سند چلے آ رہے تھے۔ جیسے آثار ہیں کہا جا سکتا ہے کہ غالب کو ایسے رچے گڑھے ہوئے لسانی اور تہذیبی شعور اور شغف رکھنے والے قدیم اور جدید علوم کے جامع اب کبھی نصیب بھی نہ ہوں:

اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

غالبیات کے ان مُسلّمہ اکابر سے مجھے ایک نسبت رہی ہے ـــــ مولانا غلام رسول مہر کی ذات سے کیسی کیسی عزیز اور حسین یادیں وابستہ ہیں۔ غالب کے رشتے سے وہ مجھ پر جیسی مہر و مرحمت فرماتے تھے جتنا وقت دیتے تھے اور جس لطف و عنایات کا مجھے مورد رکھتے تھے[۱]، اس کا میں نے کبھی اپنے آپ کو اہل نہیں جانا؛ اس پر فخر جتنا بھی کروں کم ہے!

غالب پر ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام کے کام نے مجھے ہمیشہ بہت متاثر اور مطمئن کیا۔ اُن کی طلبِ علم اُن کے علم سے بھی بڑھی ہوئی تھی جس نے اُنھیں کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ یہ طلبِ مزید ہی کا فیض اور انعام ہے کہ ان کی ہر کتاب کا نیا ایڈیشن بجائے خود ایک نئی کتاب کا لطف بہم پہنچاتا ہے! اکرام صاحب کے عالمانہ انہماک کی قسم کھائی جا سکتی ہے لیکن مَیں اُن کی "متعلمانہ" خو بو اور جستجو کا بھی قائل اور گھائل رہا ہوں۔ غالب کے حوالے سے وہ متعدد بار غریب خانے پر تشریف لائے اور مجھے مسرور اور مفتخر کیا! ۱۸ جنوری ۱۹۷۳ء کو اکرام صاحب کے جسدِ خاکی کا آخری دیدار کرتے ہوئے بے اختیار حالی کا یہ شعر زبان پر آتا تھا:

دیکھ لو آج، پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت!

مجھے خوب یاد ہے اسی روز نمازِ جنازہ کے بعد پروفیسر حمید احمد خاں نے پُرسا دینے کے انداز میں مجھے گلے لگایا تو مَیں پھوٹ بہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ بارہ چودہ مہینے بعد مجھے خود حمید احمد خاں صاحب کو بھی رونا پڑے گا! پروفیسر حمید احمد خاں سے اگرچہ صرف آٹھ دس برس کا تعلق تھا لیکن یہ کس درجہ عزیز اور کس قدر دیرینہ اور محکم معلوم ہوتا تھا! اُن کی خوئے دل نوازی نے مجھے اپنی نظر میں آپ معتبر اور محترم بنا یا۔

۱۔ میری کتاب "اشاریۂ غالب" پر مولانا غلام رسول مہر کا مضمون، مطبوعہ "نقوش" لاہور، شمارہ ۱۱۶، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، ص ۳۰۰ ـــ ۲۱۴، میرے حال پر مہر صاحب کی عنایات ہی کی ایک کڑی ہے۔

مجھے ایک مختصر سی مدّت کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں اُن کی رفاقتِ کار کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اُن کے رکھ رکھاؤ اور وضع داری، تہذیب و شائستگی کی کتنی ہی پرتجمّل اور پرافتخار یادیں ہیں، جن سے ذہن منوّر اور معمور ہے، لیکن یہ اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ غالب میری منزل ہے، یہ دریافت بڑی حد تک پروفیسر سید وقار عظیم اور پروفیسر حمید احمد خاں کی ہے۔ اُنھوں نے مجھے کام پر لگایا، بڑھایا اور بظاہر میرے لیے عمر بھر کی راہ متعین کر دی۔

پروفیسر حمید احمد خاں نے کم لکھا، لیکن جو لکھا، وہ کم رتبہ نہیں، اظہار میں احتیاط اور صحت و کمال اور اہتمام کا خیال ہمیشہ ان کا عناں گیر رہا۔ یہ ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس ہی تھا، جس نے اُن کے قلم پر ایک روک لگا دی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ لکھا اُس پر کہیں اُنگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ غالب کی حیات، شخصیت، اُن کی نظم و نثر یا بحیثیتِ مجموعی غالب کے فن پر پروفیسر حمید احمد خاں کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ معنویت سے بھرپور ہے اور علمی معیار کا درجہ رکھتا ہے۔

ترقیِ اُردو بورڈ کراچی سے اپنی منصبی وابستگی کے زمانے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری سے شخصی سطح پر باہم اعتماد، اور محبت کا جو تعلق قائم ہوا، وہ آخر دم تک برقرار رہا اور قوی تر ہوتا گیا۔ سبزواری صاحب کا علم ہی بے کراں نہ تھا، ترسیلِ علم کا بھی اُنھیں ایک طرح سے، کہہ لیجئے کہ جنون تھا۔ اُن کی صحبت اور رفاقت سے میں نے توفیق بھر فیض پایا۔ ابتداءً مولوی عبدالحق، ہم دونوں کا محبوب اور مشترک موضوع تھا، پھر غالب کا تذکرہ بھی رہنے لگا۔ غالب کے فلسفے اور فکر و فن پہ سبزواری صاحب کو نفسِ مطمئنہ حاصل تھا۔ اب سوچتا ہوں تو غالب سے اپنی قربت میں منجملہ اور اصحاب اور اسباب کے، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی ہم نشینی کا بڑا دخل محسوس ہوتا ہے:

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

○

اِسی لیے کہتا ہوں کہ "کتاب طباعت کے لیے جا رہی ہے، یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے، لیکن اس مرحلے پر غالب کے رشتے سے کچھ رفتگاں کی یاد، مجھے بے چین کیے دے رہی ہے"۔

شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج۔ لائل پور

۱۸۔ جون ۱۹۷۴ء

"دستنبو" کا تعارف

غالب کی زندگی میں "دستنبو" کی اشاعتیں
"دستنبو" کا موضوع اور حدِ موضوع
"دستنبو" تجویز سے طباعت تک
دستنبو کی جابجا ترسیل
انگریز حکام سے راہ و رسمِ مراسلت کی تجدید
پنشن کے اجرا کی اُمید
"دستنبو" اور نئے انعام کی آرزو
"دستنبو" میں ملکۂ وکٹوریہ کی مدح کا قصیدہ
طبعِ اول کا سرورق
طبعِ اول کے خاتمے کی عبارت
مہر اور تفتہ کے قطعاتِ تاریخ
تتمہ کا کتاب سے تعلق
"دستنبو" کی زبان: فارسیِ قدیم
فارسیِ قدیم کے اختیار میں حکمت
"دستنبو" اور اردو خطوط کی جمع و ترتیب
طبعِ اول کا انگاس اور خاتمہ
"دستنبو" کے مندرجات کی حقیقت
"دستنبو" کی غرضِ تصنیف اور اہمیت
"دستنبو" کے دوسرے ایڈیشن کی غایت
"دستنبو" کی تیسری اشاعت "در کلیات"
انیسویں صدی کی بعض دیگر اشاعتیں
"دستنبو" کے ایک قلمی نسخے کی نشاندہی

"دستنبو" غالب کی زندگی میں تین بار شائع ہوئی ۔ دوبارہ جداگانہ اور ایک بار "کلیاتِ نثرِ غالب" کے ساتھ ان تین اشاعتوں کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں :

۱۔ طبع اول : مطبع مفید خلائق، آگرہ، نومبر ۱۸۵۸ء
نگران اشاعت : تفتہ، حقیر، مہر، اور آرام
ضخامت : ۸۰ صفحات
مسطر : ۱۳ سطری

۲۔ طبع دوم : مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی، ۱۸۶۵ء
باہتمام : منشی بھندن لال
ضخامت : ۱۱۱ صفحات
مسطر : ۱۵ سطری

۳۔ طبع سوم در : "کلیاتِ نثرِ غالب" :
مطبع نولکشور، لکھنؤ، جنوری ۱۸۶۸ء
باہتمام : منشی نولکشور
ضخامت : ۲۳ صفحات (صفحہ ۱۸۹ تا ۲۱۲)
مسطر : ۲۹ سطری

"دستنبو" طبع اول (۱۸۵۸ء) کے سرورق پر کتاب کے موضوع اور حدِ موضوع کو ان کلمات سے ظاہر کیا گیا ہے :

"کتاب مستطاب نایاب ------ جس میں مصنف نے اپنی سرگذشت ابتدائے ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے"

پہلی بات تو یہ کہ غالب نے صرف "اپنی سرگذشت" ہی نہیں لکھی، بہ حیثیت اقتضائے مقامِ کتاب

میں عام واقعات وحالات اور بربنائے تقریب شہر وسپاہ کی روداد بھی درج کی ہے اور دوسری بات یہ کہ اس سرگذشت کا آغاز ۱۸۵۷ء کی ابتداء سے نہیں ہوا، بلکہ کتاب بعد تو طیہ وتمہید ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہوتی ہے:

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد نثر میں لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے اور اس میں صرف اپنی سرگذشت اور مشاہدے کے بیان سے کام رکھا ہے۔" (نامۂ غالب بنام: انورالدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو یہاں فساد شروع ہوا۔ میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل، زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگذشت لکھنی شروع کی، جو سنا گیا، وہ بھی ضمیمۂ سرگذشت کرتا گیا۔" (چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء)

"میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی ویکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روئیداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔" (منشی ہرگوپال تفتہ، ۷ اگست ۱۸۵۸ء)

"مئی کی گیارہویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک پندرہ مہینے کا حال میں نے لکھا ہے۔" (یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

لہ شفق کو (اوپر) لکھ چکے ہیں کہ "دستنبو" میں اپنی سرگذشت اور "مشاہدے" سے کام رکھا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ فساد شروع ہونے کے پہلے دن ۱۱ مئی ہی سے انہوں نے گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا تھا تو پھر "مشاہدے" کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ غالب نے قلعۂ معلّیٰ کی حاضری بیک قلم ترک نہیں کی جیسا کہ والیٔ رامپور کے نام اُن کے ایک فارسی خط مورخہ ۱۴ جنوری ۱۸۵۸ء سے ہویدا ہے۔ غالب کی مصلحت بیں طبیعت کے پیش نظر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے بیک آن ترکِ تعلق کر لیا ہوگا۔ بعض معاصر شہادتیں بھی اس امر کی موجود ہیں کہ غالب "فساد" کے ایام میں قلعے جاتے رہے ہیں۔ عبداللطیف اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ: ۱۹ رمضان ۱۲ مئی ۱۸۵۷ء صبح کے وقت مرزا اسداللہ خاں غالب، ایوان شاہی میں آداب بجا لانے کے لئے حاضر ہوئے اور زمیں بوسی سے سرخروئی حاصل کی اور ایک خرمہرہ پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے ہر روز کے لئے مرتبۂ "خانہ زادی" سے بہرہ اندوز ہوئے۔" (ترجمہ، صفحہ ۱۲۳) "عبداللطیف نے ۱۹ ذی الحجہ ۱۱ اگست ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں لکھا ہے کہ نجم الدولہ نواب اسداللہ خاں غالب نے ایک قصیدہ لکھ کر سنایا اور خلعت زیب تن کیا" (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف، مرتبہ ومترجمہ خلیق احمد نظامی دہلی ۱۹۵۸ء) نیز رجوع کیجیے، غدر کی صبح شام، حسن نظامی، دہلی ۱۹۷۶ء، صفحہ ۱۶۹۔

"مئی سال گزشتہ سے جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد میں نے لکھی ہے۔ یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔" (ترجمہ خاتمۂ دستنبو)

"یکم اگست (۱۸۵۸ء) تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

(میر مہدی مجروح، ۸ راگست ۱۸۵۸ء)

"میں نے بعد توطیہ و تمہید آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی سرگزشت لکھی ہے اور بہ حیثیت اقتضائے مقام، وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔" (بنام نامعلوم، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

"میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سو ابتداء ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔"

(منشی شیو نرائن آرام، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب کے خطوں میں، دوسری تصانیف کے مقابلے میں "دستنبو" کا ذکر اور اس کی اشاعت کی روداد بالتفصیل محفوظ ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں آیا ہے جس کے مکتوب الیہ کا نام معلوم[1] نہیں۔ غالب لکھتے ہیں:

"میں نے بعد توطیہ و تمہید آغاز مئی ۱۸۵۷ء سے اپنی اپنی سرگذشت لکھی ہے اور بہ حیثیت اقتضائے مقام وقائع بھی اس میں درج کیے ہیں۔ شیو لزوم مالا یلزم مرعی رکھا ہے، یعنی فارسی بے آمیزش لفظ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان بھی نہیں۔ تا بہ ہندوستان چہ رسد؟ چالیس صفحے لکھ چکا ہوں۔ اتمام میں انتظار یہی ہے کہ جبن

---

[1] رسالہ "تصویر جذبات" کے ایڈیٹر سید احمد عزیز کیفی نے اس خط کو اپنے رسالے، شمارہ فروری ۱۹۲۴ء میں شائع کیا اور لکھا کہ یہ خط اُن کے جد امجد کے نام ہے لیکن اپنے دادا کا نام نہیں بتایا۔ اس رسالے سے صفدر مرزا پوری نے اس خط کو اپنی تالیف مرقع ادب (ج ۲، ص ۲۴-۲۵) میں نقل کیا اور اس طرح یہ خط غالب کے مختلف مجموعۂ مکاتیب کا حصہ بنا۔ فاضل لکھنوی نے (اُردوئے معلّٰی، صدی ایڈیشن، ص ۹۸۹-۹۹۰) اسے شیو نرائن آرام کے نام قرار دیا ہے جو صریحاً غلط ہے، اس لئے کہ آرام سے غالب کا تعارف تفتہ کے ذریعے ہوا اور اس خط کی تاریخ تحریر کے کئی ہفتے بعد ہوا۔ بعض داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے یہ خط حکیم غلام نجف خاں کے نام معلوم ہوتا ہے۔ یہ جس کسی کے نام بھی ہے اُس سے غالب کی پرانی مراسلت ہے، نیا تعلق نہیں۔

کا مقدمہ طے ہو چکے، ملے یا جواب ملے اور میں بہر حال کسی جگہ اقامت گزیں ہو لوں، ہاں اس کے وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانب اجانب سے معلوم ہوگا، وہ ناچار لکھوں گا۔ یہاں کوئی چھاپہ خانہ نہیں ہے اگر اجازت دو گے تو بعد اختتام ان اوراق کو تمہارے پاس بھیج دوں گا تاکہ ہزار جلدیں طبع ہو کر اجڑی ہوئی قلمرو ہند میں پھیل جائیں۔"

۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء تک غالب چالیس صفحے لکھ چکے تھے۔ اتمام میں انتظار یہ تھا کہ پنشن کا معاملہ طے ہو لے اور عزم یہ تھا کہ وقوع تک جو کچھ قابلِ تحریر جوانب اجانب سے ہوگا وہ اسے قلمبند کریں گے لیکن انہی ایام میں منشی امید سنگھ اندور والے دلی آئے، ایک دوست انہیں غالب کے ہاں لے آئے۔ انھوں نے مسودہ دیکھا اور مالی اعانت سے کتاب چھپوانے کا قصد ظاہر کیا۔ اس ہنگامِ رستخیز میں طباعت کا انتظام ہونا عجائبات میں سے تھا۔ غالب نے "خوبان روزگار" منشی امید سنگھ کی اس پیش کش کو قیمت خیال کیا اور پنشن کے مقدمے کے طے پانے کا انتظار کیے بغیر "اس تحریر کو علی الاطلاق ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء" پر ختم کر دیا:

"منشی امید سنگھ اندور والے، دلی آئے تھے۔ سابقۂ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا (آگرہ میں) ...... بھائی! میں نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے ...... کیا کرتا، اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔ منشی امید سنگھ، اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے مسودہ، اُن کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون؟"

(بنام میر مہدی مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

مجروح کے نام ایک خط مرقومہ ۸ر اگست ۱۸۵۸ء میں غالب لکھتے ہیں کہ:

"صاحب! ہم نے گھبرا کر اِس تحریر فارسی کو تمام کیا، دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آئندہ لکھنا موقوف کیا۔"

"دستنبو" کے سلسلے کا پہلا مفصل خط تفتہ کے نام ہے۔ یہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کا ہے اور ان معنوں میں اہم ہے کہ اس سے "دستنبو" کے قلمی نسخہ کے کتابیاتی کوائف احاطۂ علم میں آتے ہیں اور کتاب کے انداز و اہتمامِ نگارش اور اشاعتِ کتاب کے بارے میں غالب کی توقعات اور ہدایات کا پتہ چلتا ہے:

"اب ایک اور امر سنو: میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک

رویدادِ شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال۔ نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام بدلے نہیں جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے، نہ چھدرا، نہ گنجان، اوراق پے مسطر پر اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس سطر اور کسی میں بائیس سطر بلکہ کسی میں انیس سطر بھی آئے چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جز میں آ جائے یہاں کوئی مطبع نہیں ہے، سنتا ہوں کہ ایک ہے اس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو، اس تہی دستی اور بے نوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں۔ لیکن صاحب مطبع، اتنے پہ کیوں مانے گا اور البتہ چاہیے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پان سات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین یا چار آنے قیمت پڑے، کاپی تو ایک ہی ہوگی، رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی، متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی، حاشیے پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہ ہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا تکرار کرو اور حساب معلوم کر کے مجھ کو لکھو ——— ضرور! ضرور! ضرور!"

تفتہ نے کتاب کا مسودہ دیکھا نہیں تھا۔ غالب نے بہت کچھ لکھا، لیکن کانٹے کی اس بات کی وضاحت رہ گئی کہ "رویدادِ شہر" کس کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے؟ یہ نئی عملداری کی تنقیص میں ہے ؟ یا قلعۂ معلٰی کی تائید میں؟ جس سے غالب کا تعلق ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ۵ر دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں غالب، تفتہ کو لکھ چکے تھے کہ:

"مفصّل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ مُلازمانِ قلعہ پر شدت ہے۔ باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں۔"

اور یہ باز پرس اور دار و گیر افراد و اشخاص ہی سے خاص نہیں تھی۔ طباعتی ادارے اور اخبار بھی شدت اور دار و گیر کا نشانہ بن رہے تھے۔ ۱۳ر جون ۱۸۵۷ء کو اخبارات پر پابندی لگادی گئی اور اخباروں کے اُن قواعد اور قوانین کو منسوخ کر کے جو ۱۸۳۵ء سے بلا کسی ضرورتِ ترمیم کے نافذ چلے آرہے تھے اور جن کے نتیجے میں آغاز نفاذ سے مئی ۱۸۵۷ء تک کے قریب بائیس برس کے طویل عرصے میں "اخباروں کے ایڈیٹروں اور حکومت کے افسروں میں تصادم کا کوئی قابلِ ذکر

واقعہ پیش نہ آیا[1]" ایک نیا سخت پریس ایکٹ نافذ کر دیا گیا۔ اس کارروائی کے پس پشت گورنر جنرل کا یہ ذہن اور احساس کام کر رہا تھا کہ :

"اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندوستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔"

(گورنر جنرل لارڈ کیننگ، ۱۳ر جون ۱۸۵۷ء)

جیسا کہ محمد عتیق صدیقی نے لکھا ہے "دارالحکومت کلکتہ جو انگریزی اور دیسی اخباروں کا بھی بہت بڑا مرکز تھا اور جو دار و گیر کی دوڑ میں بھی کسی اور علاقے سے پیچھے نہ رہا تھا۔ وہاں کے متعلق پارلیمنٹری کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ :

"بہت سے ہندوستانی اڈیٹر اس ایکٹ (پریس ایکٹ) کی زد میں آئے۔ باغیانہ مضامین چھاپنے کے جرم میں دوربین، سلطان الاخبار اور سماچار سدھا بھرشن کے طابع و ناشر پر سوپریم کورٹ میں مقدمات چلائے گئے۔۔۔۔ ایک اور اخبار "گلشن نوبہار" کا چھاپہ خانہ بحق سرکار ضبط کر کے اخبار بند کر دیا گیا[2]۔"

"باغیانہ مضامین" کی اشاعت پر مقدمات چلائے جا رہے تھے، پریس ضبط ہو رہے تھے اور اخبار جبری بندش کی زد میں آ رہے تھے۔ اس پس منظر میں کسی ایسی کتاب کی طباعت و اشاعت کی ہند میں کیا گنجائش ہو سکتی تھی جو کمپنی بہادر کے حکام کی تائید میں نہ ہو۔ چنانچہ جب ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء کے مذکورہ خط میں اُستاد شاہ غالب نے تفتہ سے کہا کہ :

"میں نے۔۔۔۔ رویداد شہر یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے۔۔۔۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

تو منشی ہرگوپال تفتہ جو خود بھی غالب کے شاگرد تھے، تذبذب اور مشکل میں پڑ گئے ہوں

---

[1] محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویسی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، صفحہ ۳۵۸

2. Natarajan : History of Indian Journalism, p. 68 also : Barns : Indian Empire, p. 257

(بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی، ایضاً، صفحہ ۴۰۳)

تو عجب نہیں کہ یہ روداد' انگریز عملداری کی تنقیص میں نہ ہو؟ تازہ ایکٹ پریس ایکٹ کی موجودگی میں از قسم "باغیانہ" کسی تحریر اور وہ بھی کتابی حجم کی تحریر کی طباعت اشاعت کے لئے کسی پریس کو آسانی سے کیوں کر تیار کیا جا سکتا تھا؟ غالباً تفتہ نے اس نوع کے اندیشوں کا اظہار کیا تو جواباً غالب نے انہیں "دستنبو" کے اوراق بھیجے اور لکھا کہ:

> "چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا ہے، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں' اس واسطے ہے کہ اُس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نظر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعہ اُن کے' جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کر دوں گا۔ اب سمجھ لو کہ طرز تحریر کیا ہو گی؟ اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہو گا؟"

اس معنی خیز اور اطمینان بخش وضاحت کے بعد' تفتہ کے خدشات جاتے رہے اور کتاب کا مسودہ انہوں نے طباعت کے لئے مطبع مفید خلائق' آگرہ کے مالک و مہتمم منشی شیو نرائن آرام کے سپرد کر دیا:

> "صاحب! عجب تماشا ہے تمہارے کہنے سے منشی شیو نرائن صاحب کو خط لکھا تھا، سو کل اُن کا خط آیا اور انہوں نے "دستنبو" کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو اُن کے پاس لے نہ گیا ہو گا آخر تمہیں نے بھیجا ہو گا۔ یہ کیا۔ تم نے مجھ کو' اس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا؟ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو' کتاب مطبع میں حوالے کر دی۔"

یہ محض وہم تھا تفتہ الگ نہیں ہوئے۔ وہ کتاب کی طباعت سے تا آخر وابستہ رہے اور کتاب اُن کی نگرانی میں چھپی۔ کتاب کے مندرجات اور "انداز تحریر" نے تفتہ کے اطمینان کے باعث، صاحب مطبع نے چھاپنے سے پہلے احتیاطاً مسودۂ کتاب آگرے کے حکام کو بھی دکھا لیا اور کتاب حکام کے پیشگی ملاحظے کے بعد ان کی اجازت سے چھپنا شروع ہوئی:

> "صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ' چھاپنا شروع کیا، آگرہ کے حکام کو دکھایا' اجازت چاہی۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دی۔" (مجروح' اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اس سے پہلے ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں مجروح کو کتاب کا نام تجویز کر لینے کی اطلاع دے چکے ہیں:

> "کتاب کا نام "دستنبو" رکھ دیا۔ آگرے میں چھاپی جاتی ہے۔"

انور الدولہ شفق کے نام اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی روداد لکھی ہے اور وہ پندرہ سطر سے چار جزو کی کتاب آگرے کو مطبع مفید خلائق میں چھپنے کو گئی ہے "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔"

مجروح کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۸ء سے معاملت کی بعض اور جزئی تفصیلات سامنے آتی ہیں:

"میاں کیا باتیں کرتے ہو؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں، لحاف توشک کی فکر ہے، کتابیں کیا چھپواؤں گا؟ منشی امید سنگھ نے وہ نسخہ دیکھا، چھپوانے کا قصد کیا، آگرے میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ آٹھ آنے فی جلد قیمت ٹھہری، پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں پچیس روپے چھاپے خانے میں بطورِ ہنڈوی بھجوا دیے.... پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔"

کتاب والیٔ اندور کے اتالیق، رائے امید سنگھ کی، ان معنوں میں مالی اعانت سے چھپ رہی تھی کہ وہ پچاس جلدوں کے پیشگی خریدار ہوئے تھے جن میں سے چالیس انہوں نے غالب کو ہدیۃً دے دینا تجویز کیا تھا۔ رائے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب نے تفتہ کو ہدایت کی ہے کہ:

"تم اس رقعہ کو دیکھتے ہی اُن کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں رہیں، حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو ان کا حکم ہو بجا لانا، اُن کو (دستنبو) پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کر دیں گے، وہ لے لینا، جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بموجب اُن کے حکم کے میرے پاس ارسال کرنا۔"

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے، عیاذاً باللہ! میں ان سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔"

۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط بنام منشی شیو نرائن میں بھی ان رائے صاحب کا ذکرِ خیر آیا ہے:

"ایک خریدار پچاس جلد کے وہاں پہنچے ہیں۔ واسطے خدا کے مرزا تفتہ سے کہیے کہ اُن کو ملیں،"

یعنی امید سنگھ بہادر اندور والے، وہ پہلی اینٹ میں پولیس کے پچھواڑے رہتے ہیں۔"
تفتہ رائے صاحب سے مل لیے اور کار برآری میں کامیاب ہوئے:

"رائے اُمید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی۔ حق تعالےٰ ان کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔" (تفتہ، ۳ر ستمبر ۱۸۵۸ء)

۳۱ر اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں منشی شیونرائن آرام کو کتاب کی تزئین اور تصحیح کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کتاب دو جزو یا چار جزو کی ہو۔ چھ جزو سے کم نہ ہو۔ سطر دس گیارہ سطر کا ہو، مگر حاشیہ تین طرف سے بڑا رہے۔ شیرازہ کی طرف کا کم ہو۔ اس کے سوا یہ ہے کہ کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامہ کی حاجت نہ پڑے، آپ خود متوجہ رہیے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیے گا تو وہ بھی شریک رہیں اور مرزا تفتہ تو مالک ہی ہیں۔ کاغذ "شیورام پوری" ہو، خیر، مگر سفید اور مہرہ کیا ہوا اور لعاب دار ہو۔ پھر یہ کہ حاشیہ پر جو لغات کے معنی لکھے جائیں تو اس کی طرز تحریر یا در تقسیم، دل پسند اور نظر فریب ہو، حاشیہ کا قلم، بہ نسبت متن کے قلم کے، خفی ہو۔۔۔"

یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو، کتاب، مطبع میں حوالے کر دی، اب اس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے درگزرا، سینکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے۔"

"جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز" تفتہ کو ارشاد ہوتا ہے:

"صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بہ دل توجہ فرماؤ ۔۔۔۔ میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ عبارت دو جزو میں آجائے میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو، لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں۔ اس کی روش دل آویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔"

تصحیح پر زور اس وجہ سے تھا کہ "عبارت کا ڈھنگ نیا ہے": اور تزئین کی فکر اس لیے تھی کہ کتاب کو حکام عالی مقام کی نظر گزارنا تھا:

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے اگر غلط ہو جائے تو وہ عبارت نری خرافات ہے۔ یا رب یہ سبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع ہوں کہ وہ تکلیف سہیں اور ختمِ کتاب تک متوجہ رہیں۔ منشی شیونرائن صاحب نے کاپی میرے دیکھنے کو بھیجی تھی، سب طرح میرے پسند آئی۔ چنانچہ اُن کو لکھ بھیجا ہے اگر ہو سکے تو سیاہی ذرا اور بھی رنگت کی اچھی ہو۔"

(مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حضرت! چار جلدیں یہاں کے حکام کو دوں گا اور دو جلدیں ولایت کو بھیجوں گا۔ اللہ اللہ کیا غفلت ہے اور کیا اعتماد ہے زندگی پر، بہر حال یہ ہوس تھی اور شاید اب بھی ہو کہ ان چھ جلدوں کی کچھ تزئین و آرائش کی جاوے، آپ اور بھائی صاحب اور ان کا فرزند رشید منشی عبداللطیف اور منشی شیونرائن، یہ چاروں صاحب فراہم ہوں اور یہ اجلاس کونسل یہ امر تجویز کیا جائے کہ کیا کیا جائے۔"

(مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"خلاصہ یہ کہ ان جلدوں میں سے دو جلدیں ولایت کو جائیں گی۔ ایک جناب فیض مآب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر اور ایک آقائے قدیم لارڈ الن برا بہادر کی نذر اور چار جلدیں یہاں کے چار حاکموں کی نذر کروں گا۔"

(منشی شیونرائن آرامؔ، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء)

آرام کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک غالب کو یہ علم نہیں تھا کہ "چھاپہ شروع ہو گیا یا نہیں؟ اور اگر شروع نہیں ہوا تو کیا سبب؟" اس کے دو تین روز بعد غالب کے پاس تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ غالب نے ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تقطیع، شمار سطور، کاپی کے حسن ضبط، صحت الفاظ، عرض، قلم، خط، طرزِ تصحیح اور جدول وغیرہ پر خوشنودی کا اظہار کیا ہے اور کاغذ، کاپی کی سیاہی اور رنگت نیز جلدوں کی تزئین اور آرائش کے باب میں ضروری ہدایات دی ہیں:

"تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے ہیں۔ شاید میرے دکھانے کے واسطے بھیجے گئے ہیں، ورنہ دستور یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مصنف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح، سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اس کا بھی چھاپا اسی طرح ہوگا۔ غرض کہ تقطیع اور شمار سطور اور کاپی کا حسن ضبط اور الفاظ کی صحت، سب میرے پسند، صحت الفاظ کا کیا کہنا ہے واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر اچھا ناصل منتے۔ یعنی

سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اُس کو بجنسہٖ صحیح کردیں گے۔ خدا کرے اِنجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تقسیم چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دلپسند اور نظر فریب ہوگی۔ کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ "فرنج" کاغذ اچھا ہے۔ چھ جلدیں جو نذرِ حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو "شیورام پوری" پر اور چاہے نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں، اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلفِ محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں، اچھے کاغذ پر نہ ہوں؟ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ، زائد پڑتا ہو تو خیر، دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیورام پوری پر ہوں باقی جلدوں میں تمہیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب! اگر ہو سکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور درخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔"

لیکن خاص جلدیں جو حکام کی نذر کرنا تھیں۔ ایک مرحلے پر چھ کے بجائے سات ہو گئیں، ان کی تفصیل اور مرسل الیہ کے اسمار کی تفصیل مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام غالب کے ایک خط مرقومہ ۱۸ر ستمبر ۱۸۵۸ء سے معلوم ہوتی ہے:

"رات، ایک بات اور خیال میں آئی ہے لیکن چونکہ تحکم درکار فرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی، ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی۔ ان کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد، پھر سمجھا چاہیئے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں؟ نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی، یہ میری کیا بد قسمتی ہے کہ جناب ایڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورنمنٹ کی نذر انہیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب، ایک جلد، اُن کی نذر بہت ضروری ہے آپ گنجائش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں ایک اور بھی ایسی ہی بنوالیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ پانچ بنوالیں گے۔ یہ عرض مقبول اور یہ گستاخی کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔"

کتاب کی تزئین و طباعت کی اطلاع ملی تو اشتیاقِ دید کو شاعرانہ اسلوب میں اس طرح بیان کیا:

"کتاب کا حسن کانوں سے سُنا۔ دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا...، مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر، یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق، آنکھوں کو کب تک ملے گا؟"

(بنام: تفتہ، ۱۶ر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

سات طلائی لوح کی پر تکلف جلدوں کے علاوہ جو حکام عالی مقام کو نذر جانا تھیں۔ ایک مزید خاص نسخے کی فرمائش، خاص اپنے لیے صاحبِ مطبع، منشی شیو نرائن سے کی گئی۔ جنہیں ۱۹ اکتوبر کے خط میں لکھ چکے ہیں کہ برخوردار منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو؟ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزندِ دلبند ہو۔"

"دو جلدیں پر تکلف اور پانچ جلدیں بہ نسبت اُس کے کم پر تکلف، میرزا حاتم علی صاحب کے عہدۂ اہتمام میں ہیں۔ اس سے ہم کو اور تم کو کچھ کام نہیں۔ وہ جیسی چاہیں، بنوا کر بھیج دیں، تم ایک جلد، بس۔ زیادہ صرف کیوں کرو؟ اپنے طور پر اپنی طرف سے جیسی چاہو بنوا کر بھیج دو۔ میں تم کو اپنے پیارے ناظر بنسی دھر کی نشانی جانتا ہوں۔ اس کو تمہاری نشانی جان کر اپنی جان کے برابر رکھوں گا۔ باقی حال، اپنے خاندان اور تمہارے خاندان کا اور باہم ملاپ اپنا اور بنسی دھر کا بڑے ہو ناسب تم کو لکھ چکا ہوں، مکرر کیا لکھوں؟"

(شیو نرائن آرام، ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب کا اندازہ یہ تھا کہ کتاب کی طباعت اکتوبر میں انجام پا جائے گی:

"پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ ("دستنبو" کا) ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے"
(مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

۲۳ اکتوبر ۱۸۵۸ء تک انہیں کتاب کے چھاپے کے خاتمے کی اطلاع نہیں ملی تھی:

"اب چھاپا تمام ہو گیا ہو گا وہ پانچ اور دو سات کتابیں جو میرزا صاحب کی تحویل میں ہیں وہ اور وہ ایک جلد جو تم نے مجھ کو دینی کی ہے، وہ سب لوح اور جلد کی درستی کے بعد پہنچ جائیں گی، مگر چالیس سرسری جو مجھے چاہئیں ہیں، وہ تو آج کل میں روانہ کر دو، اور ہاں میری جان یہ چالیس کتابوں کا پشتارہ کیوں کر پہنچے اور محصول اس کا کیا ہو گا؟ اور یہ بھی تو بتاؤ کہ وہ دس جلدیں رائے امید سنگھ کے پاس کہاں بھیجی جائیں گی؟ میرزا تفتہ۔۔۔۔ اُن کا اندور نہ ہونا اور پھر شاید آگرہ اور دلّی کا آنا مجھ کو لکھ چکے ہیں۔"

(بنام، شیو نرائن آرام، ۲۳ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

کتاب کا چھاپا تمام ہو چکا، اب بے تابی سے اُن کا انتظار ہے تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں:

"صاحب! کتابیں کب روانہ ہوں گی؟ دوالی بھی ہو لی۔ اگر گنگا جانے کا قصد ہو تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا اور ہاں یہ نہیں سمجھا کہ میرزا مہر کی بنوائی ہوئی سات کتابیں بھی انہیں کے ساتھ بھیجو گے یا وہ اپنے طور پر جداگانہ روانہ کریں گے؟ وہ تم نے اپنی بنی ہوئی کتاب کا آٹھ دن کا وعدہ کیا تھا اور اس وعدے سے یہ بات تم کو [illegible] سات دن پہلے روانہ ہوں گی اور وہ ایک کتاب بٹنے کے بعد سو وہ ہفتہ بھی گزر گیا۔ یقین

ہے کہ اب وہ سب کب پہنچیں اور شاید کل پرسوں آجائیں۔"

(بنام: شیو نرائن، ۹ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"مہتمم مطبع کا خط پرسوں آیا تھا، وہ لکھتے ہیں کہ تمہاری چالیس کتابیں بعد لینے منہائی سات جلدوں کے اسی ہفتے میں تمہارے پاس پہنچ جائیں گی۔ اب حضرت ارشاد کریں کہ سات جلدیں کب آئیں گی؟ ہر چند کارگروں کے دیر لگانے سے تم بھی مجبور ہو، مگر ایسا کچھ لکھو کہ آنکھوں کی نگرانی اور دل کی پریشانی دور ہو، خدا کرے ان تینتیس جلدوں کے ساتھ یا دو تین روز آگے پیچھے، یہ سات جلدیں آپ کی عنایت بھی آئیں، تا خاص و عام کو جا بجا بھیجی جائیں۔"

(بنام: حاتم علی بیگ مہر، نومبر ۱۸۵۸ء)

کتاب بالآخر چھپ گئی اور غالب کے حصۂ رسد کی چالیس کتابوں میں سے تینتیس انہیں ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو مل گئیں، بے حد خوش ہوئے اور تفتہ کو لکھا:

"کل جمعہ کے دن ۱۲ تاریخ نومبر کی، تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیو نرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع سیاہی، چھاپا سب خوب، دل خوش ہوا، اور شیو نرائن کو دعا دی۔"

لیکن اُن کا جی، اُن سات کتابوں میں گڑا ہوا تھا، جن کا طلائی کام اور انگریزی جلد کے ساتھ تیار ہونا مقصود تھا۔ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب! تینتیس کتابیں، بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی، کل جمعہ کے دن ۱۲ نومبر کو پہنچیں کاغذ اور سیاہی اور خط کا حسن دیکھ کر میں نے اندھے یقین جانا کہ طلائی کام پر یہ کتابیں طاؤس بہشت بن جائیں گی، حوریں ان کو دیکھ کر شرمائیں گی۔ یہ تو سب درست، مگر دیکھیے کہ مجھ کو ان کا دیکھنا کب تک میسر ہو۔ آپ بہ گمان تساہل کا گذرے، یہ تو کیوں کر ہو، ہاں! صحاف جلد کے بنانے کی نسبت سے میرے حق کا جلاد نہ بن جائے، یعنی مدت مناسب سے زیادہ دیر نہ لگائے۔ اور ہاں حضرت! کچھ ایسی پختگی پارسل کے وقت کر لیجیے گا کہ یہ پارسل آشوب تلف سے محفوظ رہے۔ بہت عزیز اور بہت کام کی چیز ہے۔ مجھ کو وہ ایک ایک مجلد اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یا الٰہی! یہ خط راہ میں ہو اور وہ ساتوں کتابوں کا پارسل تیرے حفظ و امان میں مجھ تک پہنچ جائے اور یہ نہ ہو تو بھلا یہ ہو کہ اس خط کا جواب لکھیے اس میں مرقوم ہو کہ آج ہم نے کتابوں کا پارسل روانہ کیا ہے۔"

(خطوط غالب، مہر، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، جلد ۱، صفحہ ۲-۲)

خاص جلدیں ابھی پہنچی نہیں ہیں کہ کتاب کے سادہ نسخے تقسیم بھی ہو گئے۔ خاص نسخوں کی پل پل راہ تکی جا رہی ہے۔

"صاحب تینتیس کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم بھی ہو گئیں۔ سات کتابیں میرزا مہر کی بھیجی ہوئی موافق اُن کی تحریر کے، آج شام تک اور مطابق منشی شیونرائن کی اطلاع کے کل تک، میرے پاس پہنچ جائیں گی اور منشی شیونرائن نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی بھی اطلاع دی ہے۔"

(بنام، تفتہ، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

"دیکھیے مرزا مہر (کتابیں) کب روانہ کرتے ہیں۔ اگر بھیج چکے ہیں تو یقین ہے کہ آج یہاں آ پہنچیں، آج نہ آئیں، کل آئیں۔ کل سے میں شام تک راہ دیکھتا ہوں۔"

(بنام، شیونرائن، ۱۸ر نومبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو وہ سات خاص مجلد بھی غالب کو مل گئے، منشی شیونرائن کو مطلع کیا:

"کل جمعہ کے دن ۱۹ر نومبر ۱۸۵۸ء کو سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے، واقعی جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا، اُسی روپ کی ہیں۔"

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"کل جمعہ کے دن ۱۹ر نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرائش ہے۔ آفتاب کی سی نمائش ہے۔"

مہر کو، ان جلدوں کی تزئین اور آرائش پر بہت ہی کھلے دل سے داد دیتے ہوئے لکھا کہ:

"کل جو جمعہ، روزِ مبارک و سعید تھا، گویا میرے حق میں روزِ عید تھا۔ چار گھڑی دن رہے، نامۂ فرحت فرجام اور چار گھڑی کے بعد، وقتِ شام:

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب، بر محل پہنچا

آدمی کو موافق اُس کی تمنا کے آرزو بر آنی بہت محال ہے۔ میری آرزو ایسی بر آئی کہ وہ برتر از وہم و خیال ہے۔ یہ بناؤ تو میرے تصور میں بھی نہیں گزرتا تھا۔ میں صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی، دو کی لوحیں زریں اور پانچ کی لوحیں سیاہ قلم کی ہوں گی۔ واللہ! اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس رقم کی ہوں گی۔ میرا مقصود یہ تھا کہ ایک کتاب مثل ان چار کے بن جائے، نہ یہ کہ دو کتابوں کا سا رنگ دکھلائے۔"

ایک جگہ سے کتاب کی رسید آئی، ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو اس کی اطلاع دیتے ہیں نیز یہ کہ کچھ حکام کو کتاب بھیج چکے اور کچھ اعلیٰ حکام کی نذر کے پارسل آج روانہ ہوں گے:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے صاحب ہیں۔ ان کے دنوں میں ایک ملاقات میری، اُن کی ہوئی تھی۔ میں نے ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط، مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا، بہت تعریف لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلائق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ اُن کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے، میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سیکرٹریوں کی نذر، یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے، دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

تا نہال دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام منشی غلام غوث بے خبر سے پتہ چلتا ہے، کہ صدائے برنخواست:

"پیشگاہ گورنمنٹ کلکتہ میں جب کوئی کاغذ بھجوایا ہے، بقلم چیف سکرتر بہادر، اس کا جواب پایا ہے۔ اب کی بار دو کتابیں بھیجیں: ایک پیش کش گورنمنٹ اور ایک نذر شاہی ہے، نہ اس کے قبول کی اطلاع، نہ اس کے ارسال سے آگاہی ہے۔ جناب ولیم میور صاحب بہادر نے بھی عنایت نہ فرمائی۔ ان کی بھی کوئی تحریر مجھ کو نہ آئی۔"

اگلے روز، بے خبر ہی کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ:

"پیشگاہ گورنمنٹ میں بتوسط چیف سکرتر بہادر سابق اور لیفٹیننٹ گورنر بہادر حال، دو مجلد پیش کئے ہیں۔ ایک نذر گورنمنٹ اور دوسری کے واسطے یہ سوال کہ میری عزت بڑھائی جائے اور یہ مجلد حضور شہنشاہی میں بھجوائی جائے۔ رد و قبول، نفرین و آفرین، کچھ بھی نہیں۔"

جہاں تہاں سے کتاب کی رسیدیں آنے لگیں اور غالب کے لئے یک گونہ خوشی اور خوش نفسی کا سامان فراہم کرنے لگیں:

"مجھ پر میرے اللہ نے ایک اور عنایت کی ہے اور اس غمزدگی میں ایک گونہ خوشی اور کیسی بڑی خوشی دی ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ ایک "دستنبو" نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کی نذر بھیجی تھی۔ آج پانچواں دن ہے کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا خط مقام الہ آباد سے بہ بیل ڈاک آیا۔ وہی کاغذ افشانی، وہی القاب قدیم، کتاب کی تعریف، عبارت کی تحسین، مہربانی کے کلمات، کبھی تم کو خدا یہاں لائے گا تو اس کی زیارت کرنا۔ پنشن کے بھی ملنے کا حکم آج کل آیا چاہتا ہے اور یہ بھی توقع پڑتی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں سے بھی کتاب کی تحسین اور عنایت کے مضامین کی تحریر آ جائے۔"

(بنام: مجروح، ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء)

"حقیقت میری مجملاً یہ ہے کہ راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کو نسخہ "دستنبو" بہ بیل ڈاک بھیجا تھا۔ ان کا خط فارسی مشعر تحسین عبارت و قبول، صدقِ ارادت و صورت بہ بیل ڈاک آ گیا۔ پھر قصیدہ بہاریہ تہنیت و مدحت میں بھیجا، اس کی رسید آ گئی۔ وہی "خان صاحب بسیار مہربان دوستان" القاب، اور کاغذ افشانی۔ ازاں بعد ایک قصیدہ بجناب رابرٹ منٹگمری صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب کی مدح میں بتوسط صاحب کمشنر بہادر دہلی گیا، اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ بتوسط کمشنر بہادر، مجھ کو آ گیا۔ پنسن ابھی تک مجھ کو نہیں ملی۔"

(بنام چودھری عبدالغفور سرور، اپریل ۱۸۵۹ء)

"صاحب! بندہ نے "دستنبو" جناب اشرف الامرا جارج فریڈرک ایڈمنسن صاحب بہادر، لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی، سو اُن کا فارسی خط محررہ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہار خوشنودی، بطریقِ ڈاک آ گیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لیفٹیننٹ گورنر کی قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر متضمن خط فارسی، بہ بیل ڈاک مرقومہ چہاردہم آ گیا۔ پھر ایک قصیدہ فارسی مدح و تہنیت میں جناب رابرٹ منٹگمری صاحب بہادر، دہلی بھیجا گیا تھا کل ان کا مہری خط بذریعہ صاحب کمشنر بہادر، دہلی آ گیا۔ پنسن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں ہوا۔ اسباب توقع فراہم ہوتے جاتے ہیں۔"

(بنام: مہر، مارچ/اپریل ۱۸۵۹ء)

"اسباب توقع" فراہم ہونے لگے لیکن "دستنبو" کی غایتِ تعیینت معمولی پنشن کی واگذاشت ہی نہیں تھی۔ وہ ملکہ وکٹوریہ انگلستان سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کے بھی اُمیدوار تھے، جس

کے لئے وہ انقلاب، ۱۸۵۷ء سے پہلے زمین ہموار کر چکے تھے اور ان کی گزارشات پر مزدوری کارروائی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قلعۂ معلّٰی سے تعلق کے بعد غالب کے:

"۵، ۶ برس آرام سے گزرے۔ پنشن کے ساتھ سو پچاس روپے سالانہ، بادشاہ سے، چھ سو روپے سالانہ، شہزادہ ولی عہد میرزا فخرو، اُن کے شاگرد ہو گئے تھے، اُن سے چار سو روپے سالانہ ۱۸۵۴ء کے آخر آخر غالب، اس کی بھی سبیل پیدا کرتے میں کامیاب ہو گئے کہ انہیں اودھ کے علم دوست اور فنکار بادشاہ واجد علی شاہ سے بندھی ہوئی رقم مل جایا کرے۔ چنانچہ وہاں سے بھی پانچ سو روپے سالانہ مقرر ہو گئے۔ اِدھر اُدھر کی ریاستوں اور قدردان امیروں کی طرف سے بھی "فتوح" پہنچ جایا کرتی تھی لیکن یہ سب کچھ ٹھکانے تھے اور غالب کو جو درباروں کے رازداں اور بدلتے ہوئے حالات کے نبّاض تھے، آگے کی طرف سے کھٹکا لگا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ اس تیزی سے ڈھلتی ہوئی عمر اور صحت کے ساتھ اپنے مستقبل کی حیثیت کا پکّا بندوبست کر لینا چاہتے تھے اور اس کی خاطر انگریزی اقتدار کا خوش رکھنا اور گورنر جنرل کے دفتر میں مقام بنانا ضروری تھا۔" [1]

"۱۸۵۶ء کے ختم ہوتے ہوتے برطانوی اقتدار سے خود کو منوانے کی کوشش سنجیدہ ہو گئیں اور انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں پُر زور قصیدہ لکھ کر لندن بھیجا جس کا سارا زور حاجت والی پر تھا اور ساتھ میں ایک عرضی بھی تھی کہ بادشاہوں کی شاعر نوازی کے چلن کے مطابق مجھے بھی خطاب، خلعت اور پنشن سے نوازا جائے۔ اس قصیدے اور عرضی کی رسید اُن کو ۱۸۵۷ء کے آغاز میں لندن سے مل گئی تھی اور نہ جانے کیسی کیسی امیدیں بندھ گئی تھیں کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کے خلاف سُلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔" [2]

"دستنبو" میں اس کی تفصیل درج کرنے کے بعد، غالب نے اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ:

"اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور ناخدا ترس اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں، عدالتیں نہ اُجڑتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا، جس سے (خطاب، خلعت اور پنسن کی میری) مُرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔"

"دستنبو" کے خاتمے کی عبارت سے بھی غرضِ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے:

---

[1]، [2] ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۶

"کاش! میری ان تین خواہشوں یعنی: خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہِ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جن کے متعلق، میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے ——— اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا۔"

خواجہ غلام غوث بے خبر کے نام غالب کے ایک خط مؤرخہ ۳۱ر جنوری ۱۸۵۹ء سے "دستنبو" کی غرضِ تصنیف بالکل آئینہ ہو جاتی ہے:

"۷ر دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیرِ اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدے کے صلے اور جائزے کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ (کیننگ) سائل نے بھجوایا ہے، خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے جو حکم صادر ہوگا، سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی منظور ہے یہ حکم مؤرخہ ۷ر دسمبر ۱۸۵۶ء، آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں، میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گزرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب (دستنبو) اور دوسرے قصیدے (مشمولہ "دستنبو") کے جابجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل، حکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔"

لیکن یہ "یاد دہی" بےنتیجہ رہی اور نئے انعام اور اعزاز کا تو کیا مذکور، اشاعتِ کتاب کے ایک سال بعد تک غالب کو دستورِ قدیم کی بحالی کی طرف سے بھی اطمینان نہیں تھا:

"مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں۔ لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔"

(بنام: نواب محمد یوسف علی خاں، ۲۷ر نومبر ۱۸۵۹ء)

اور پھر خدا خدا کر کے پنشن مقرری مئی ۱۸۶۰ء میں[1] کھل گئی۔ زرِ مجتمعہ سہ سالہ یکمشت پا لیا اور مارچ ۱۸۶۳ء میں پچھلے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم بھی آ گیا لیکن ملکۂ انگلستان کے ہاں سے مزید خطاب و خلعت اور پنشن کی تجویز دلِ تحریک جہاں کی تہاں رہ گئی۔

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالب کو ایک اور سوجھی، ۲۱ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مہر کو لکھتے ہیں:

---

[1] تکلّف برطرف "دستنبو" ہی پنشن کے اجرا کا باعث ہوئی۔ رجوع کیجیے خط بنام میر مہدی مجروح، مارچ ۱۸۵۹ء

"ہاں صاحب! ایک بات اور ہے اور وہ محلِ غور ہے۔ میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے "تہنیت فتح ہند اور عملداری شاہی" ساٹھ بیت کا ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مُذَہَّب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر یہ خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے، یعنی چھاپا ہوئی ہے۔ اگر یہ چھ صفحے، یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل ہو جائیں تو بات اچھی ہے۔ آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ، منشی شیونرائن صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں اور پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیج دوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو یہ چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے اور لگایا جائے 'پہلا' کتاب کے، دوسری یہ کہ اس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو، اور پہلے صفحہ پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں، اسی طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ قصیدہ در مدح جناب ملکہ انگلستان خلداللہ ملکہا" (کذا) میرا نام کچھ ضرور نہیں، کتاب کے صفحے پر تو ہوگا۔ اس مطلب خاص کا جواب باصواب یعنی نوید قبول جلد لکھیے۔"

دوسرے دن منشی نبی بخش حقیر کو اسی مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

"بھائی جان! میں نے ایک قصیدہ جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔ ساٹھ شعر ہیں، چھ صفحے یعنی تین ورق پر چھپ کر "دستنبو" سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دیے جائیں تو کتاب کو قصیدے سے عزت، اور قصیدے کو کتاب کے سبب شہرت ہو جائے گی۔ مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو تو ہو، ورنہ بات آسان ہے۔"

۲۹ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط موسومہ حاتم علی بیگ مہرؔ میں لکھتے ہیں :

"قصیدے کا شاملِ کتاب ہونا بہت ضروری ہے، پر دیکھا چاہیے کہ صاحبِ مطبع کو کیا منظور ہے اگر وہ کاغذ کی قیمت کا عذر کریں تو ہم پانچ سات روپے سے اور بھی ان کا بھرنا بھریں گے۔"

لیکن صاحبِ مطبع کی "منظوری" آ گئی، ۳۰ر ستمبر ۱۸۵۸ء کو تفتہ کو لکھا :

"صاحب! قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحبِ مطبع نے مجھ کو بھی دی ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔"

تفتہ نے پوچھا تھا کہ اس قصیدے کو، کتاب کا دیباچہ کیوں نہ بنا دیا جائے؟ لیکن یہ کتاب کے اِدّعائے تحریر کے منافی تھا۔ کتاب کی نثر و نظم، فارسی قدیم میں تھی، یعنی بے آمیزشِ لفظِ عربی، اور قصیدہ فارسی متعارفہ و مُروجہ میں تھا۔ غالب نے ان دونوں کے اجماع کی یہ صورت نکالی :

"قصیدے کا نثر سے پہلے لگانا ازراہِ اکرام ماعز از ہے ورنہ نثر میں اور صنعت اور نظم کا اور لطف ہے پیاس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجماع کی یوں ہو کہ سررشتۂ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدے کے اور "دستنبو" کے بیچ میں ایک ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔"

(بنام: تفتہ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

یہ "قصیدۂ برگزیدہ" "دستنبو" طبع اوّل میں چھ صفحوں پر مشتمل ہے اور سرورق کے بعد آغاز کتاب میں شامل ہے اور اس کے بعد نئے سرے سے صفحوں کا شمار ہوتا ہے۔

"دستنبو" طبع اوّل کے بیلدار سرورق کی سات سطری عبارت یہ ہے:

(سطر: ۱) العلمہ طاقۃ

(سطر: ۲) کتاب مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی

(سطر: ۳) تصنیف فخر دوسی ہند نواب اسداللہ خاں بہادر غالب تخلص دہلوی دوم بہ

(سطر: ۴) دستنبو

(سطر: ۵) جس میں مصنف نے اپنی سرگزشت ابتدائی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک

(سطر: ۶) لکھی ہے مع قصیدہ تہنیت فتح ہند کہ وہ بزبانِ فارسی متعارف مروّجہ ہے

(سطر: ۷) مطبع مفید خلائق آگرہ میں واسطے افادہ خاص و عام کے باہتمام شیونرائن کے چھاپی گئی

سرورق کی پہلی سطر "العلمہ طاقۃ" پر مشتمل ہے۔ یہ یقیناً جلی قلم سے ہے اور صاحب مطبع منشی شیونرائن آرام کی اپج ہے۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب انھیں لکھتے ہیں: "العلمہ طاقۃ" شوق سے لکھو" اس کے علاوہ سرورق کی ساری عبارت جیسے سات سطروں میں تقسیم کیا گیا ہے، غالب کی اپنی ترتیب اور ہدایت کے مطابق ہے۔ اس کا ابتدائی مسودہ آگرہ میں تیار ہوا تھا جس میں غالباً انگریزوں کی فتح کے مفصل حالات کی طرف بھی اشارہ تھا۔ غالب نے اسے خلافِ مضمونِ کتاب قرار دیتے ہوئے آرام کو لکھا کہ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی اور طبع پر بات آتی:

لہ "العلمہ" کی جگہ "العلم" چاہیئے تھا، مگر مطبع مفید خلائق کی چھپی ہوئی "دستنبو" کی لوح پر بھی العلمہ طاقۃ ہی چھپا ہوا ہے۔

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، خطوطِ غالب، مالک رام، علی گڑھ ۱۹۶۲ء، ص: ۴۲۵)

"صفحے کے آخر[1] کی دو سطریں از روئے مضمون سارے کتاب کے مضمون کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے سو ابتدائے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اول جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے۔ شہر ستمبر میں مفتوح ہوا، اس کا بھی بیان ضمناً آگیا۔ خوب ہوا جو تم نے مجھ سے پوچھ لیا ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب میں جس طرح سے کہوں، سو کرو۔ پہلے سوچ کر تقسیم یوں ہے کہ تین سطریں اوپر تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام۔ کیوں میاں، تقسیم یوں ہی ہے؟ اب میں دوسرے صفحے پر ساتوں[2] سطریں لکھ دیتا ہوں، اس کو ملاحظہ کرو، اور میرا کہا مانو ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔"

(شیو نرائن آرام، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے آرام کو لکھا کہ:

"دستنبو" کے آغاز کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گئی ہو گی اور چھاپی گئی ہو گی۔"

سرورق کی تقسیم غالب کی ہدایت کے عین مطابق ہے۔ یعنی تین سطریں اوپر، تین سطریں نیچے اور بیچ میں ایک سطر، اس میں کتاب کا نام، لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے "۱۱ مئی" کا ٹکڑا سرورق کی مطبوعہ عبارت سے محذوف ہے جس کی وجہ سے کتاب کی حقیقت کسی قدر غلط ہو گئی۔

"دستنبو" (طبع اوّل) کے سرورق پر مصنف کا نام "نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب" درج ہے یہ غالب کی اپنی پسند اور ہدایت کے مطابق ہے۔ صاحبِ مطبع منشی شیو نرائن نے ایک خط کے لفافے پر "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تھا۔ غالب اس سے بددل ہوئے اور یکم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں مرزا تفتہ کو لکھا کہ:

"صاحبِ مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے: "مرزا نوشہ صاحب غالب"، للہ غور کرو یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اوّل پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا فارسی کا دیوان، یا اُردو، یا پنج آہنگ یا مہر نیمروز

---

[1] سہواً "اردوئے معلیٰ" میں "آخر کے صفحے" چھپا ہے۔ یہ غالب کا سہوِ قلم ہے یا کاتب کی لغزش، یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ غلطی "اُردوئے معلّیٰ" کی پہلی طباعت سے اب تک چلی آ رہی ہے۔

[2] یہ فاضل لکھنوی کو ان سات سطروں کے ضمن میں صریح التباس ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اُردوئے معلّیٰ، مجلس ترقیٔ ادب لاہور، صدی ایڈیشن، ص ۴۷۱

چھاپے کی، یہ کوئی کتاب، اس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام دیکھ لیتے، تم نے بھی ان کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت، عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں، بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتہ سے ولایت تک یعنی وزراء کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحب مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھویا گیا! میری محنت رائیگاں گئی۔ گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی!"

سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں تفتہ کو بتاکید لکھتے ہیں کہ:

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص بس۔ اجزائے خطابی کا لکھنا مناسب بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ "بہادر"، کا، اور "بہادر" کے بعد تخلص "اسد اللہ خان بہادر غالب"۔"

تفتہ نے پوچھا تھا کہ آیا کتاب پر نام محمد اسد اللہ خان لکھا جائے؟ نیز "مرزا" "مولانا" "نواب" میں سے کیا لکھا جائے؟ ۷ ار ستمبر ۱۸۵۸ء کو جواباً لکھتے ہیں کہ:

"سنو صاحب! لفظ مبارک میم، حا، میم، دال (محمدؐ)، اس کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے مگر چونکہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی "محمد اسد اللہ خان" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "میرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے جو چاہو سو لکھو۔"

۳۰ ر ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو کھلی چھٹی دے دی کہ "نام میرا، جس طرح چاہو لکھ دو۔" لیکن اکتوبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں خود شیو نرائن کو بڑی ملائمت سے سمجھاتے ہیں کہ:

"سنو، میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے "نجم الدولہ" اور اطراف و جوانب کے امراء سب مجھ کو "نواب" لکھتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافے پر "نواب اسد اللہ خان" لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ "میرزا" یا "میر" نہیں لکھتے۔ یہ خلاف دستور ہے۔ یا "نواب اسد اللہ خان" لکھو۔ یا "میرزا اسد اللہ خان" لکھو اور "بہادر" کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔"

"دستنبو" (طبع اول) کا متن صفحہ ۹۷ پر ختم ہو جاتا ہے۔ آخر میں "تمت تمام شد" کے الفاظ کے بعد یہ جملہ ثبت ہے:

"اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفید خلائق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں، فقط۔"

یہ امر بھی خطوں میں زیرِ غور رہا ہے۔ تفتہ کے نام سوم ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے:

"اوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے، مگر اس کی عبارت کیا بتاؤں؟ صاحبِ مطبع اس امر کو اُردو میں آخرِ کتاب پر لکھ دیں۔۔۔۔۔ خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوادو۔"

اس کے بعد ایک دوسرے خط میں تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"بھائی تم نے بھی اور منشی شیونرائن صاحب نے بھی لکھا۔ میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمۂ کتاب میں چھاپ دو:

"نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع مفید خلایق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبانِ مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔"

اس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیونرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔"

چنانچہ غالب کی "میں" زدہ عبارت کے بجائے "مہتمم مفید خلائق" کی جانب سے ممانعت کا وہ مختصر اور مؤثر جملہ چھاپا گیا، جو اُوپر نقل ہوا ہے۔

"دستنبو" (طبعِ اوّل) میں آخری صفحے۔۔۔ پر دو قطعاتِ تاریخ ہیں۔ ایک آغازِ کتاب کا، اور دوسرا انجامِ کتاب کا:

۱۔ قطعۂ تاریخ

آغازِ کتاب از میرزا حاتم علی بیگ مہر تخلص سلمہ اللہ تعالیٰ

اسداللہ خان غالب مہر — حبّذا زد رقم چہ دستنبو
نامۂ خود سال خویش داد نشان — یدِ بیضا ستم چہ دستنبو

۱۸۵۷ء

۲۔ قطعۂ تاریخ

انجامِ کتاب از میرزا تفتہ سلمہ اللہ تعالیٰ

کتابی زد رقم غالب کہ آنرا — بجان و دل جہانی گشت طالب
نوشتم تفتہ سال ختمِ حق — [illegible]

ان قطعات کا ذکر بھی خطوں میں موجود ہے۔ میرزا مہر کو ان لفظوں میں قطعۂ تاریخ پر داد اور اصلاح دی ہے:

"بندہ پرور! آپ کا مہربانی نامہ آیا۔ آپ کی مہر انگیز اور بہجت خیز باتوں نے غم بے کسی بھلایا۔ کہاں دھیان لڑا ہے! کہاں سے "دستنبو" کی مناسبت کے واسطے "ید بیضا" ڈھونڈ نکالا ہے! آفرین!
تیسرا مصرع اگر یوں ہو تو فقیر کے نزدیک بہت مناسب ہے:

نامہ خود سال خویشتن داد نشان"

"دستنبو" کے مطبوعہ قطعۂ تاریخ میں مصرع کی یہی روایت چھپی ہے۔ میرزا مہر کو مادۂ تاریخ کے سقیم ہونے کے بارے میں کچھ وہم رہا ہوگا۔ قطعہ موزوں کرنے سے پہلے انہوں نے اس بارے میں غالباً ایک دو بار استفسار کیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انہیں لکھتے ہیں:

"مادۂ تاریخ میں کیا برائی ہے جو تمہارے جی میں یہ بات آئی ہے کہ مجھ سے بار بار پوچھتے ہو؟ مادہ اچھا ہے، قطعہ لکھوا در خاتمہ کتاب پر لگا دو۔ ایک قطعہ مرزا صاحب (تفتہ) کا، ایک قطعہ تمہارا، یہ دونوں قطعے رہیں اور اگر وہاں کوئی اور صاحب شاعر ہوں تو وہ کہیں۔ اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا کہ روئے سخن ساری خدائی کی طرف ہے، بلکہ خاص یہ اشارہ بھائی (نبی بخش حقیر) کی طرف ہے مولانا حقیر کو توجہ اس باب میں چاہیئے اور ان کا نام بھی اس کتاب میں چاہیئے۔"

۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ کو بھی لکھا ہے کہ:

"بھائی میرزا تفتہ! ایک قطعہ میرزا صاحب (حاتم علی بیگ مہر) کا، ایک قطعہ تمہارا، بلکہ ایک حقیر سے بھی لکھواؤ۔"

لیکن حقیر کا کوئی قطعہ "دستنبو" میں شامل اشاعت نہیں۔ اس طرح ان کا نام تو جیسا کہ غالب چاہتے تھے، کتاب میں نہیں آسکا۔ لیکن اس کتاب کے سلسلے میں ان کا نام، ان معنی میں ناگزیر ہے کہ کتاب کی کاپیاں پڑھنے، تصحیح کرنے اور غلطیاں بنانے کی سراسر ذمہ داری، ان ہی کی رہی۔

"کاپی کی تصحیح ہو، غلط نامے کی حاجت نہ پڑے، آپ خود متوجہ رہیئے گا اور منشی نبی بخش صاحب کو اگر کہیئے گا تو وہ بھی شریک رہیں گے۔"

(بنام شیو نرائن، ۳۱۰ اگست ۱۸۵۸ء)

"صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔ بالسے بسبب التفات بھائی منشی نبی بخش صاحب کے، صحتِ الفاظ سے خاطر جمع ہے۔ متوقع [redacted] کہ وہ تکلیف سہیں اور ختمِ کتاب تک متوجہ رہیں۔"

(بنام حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی (نبی بخش حقیر صاحب) کا ہو گیا ہے۔ جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کر دو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہوشیاری ان کی، میرے کس دن کام آئے گی۔"

(بنام ہرگوپال تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی نبی بخش صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضروری نہیں۔ مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدردان ہیں۔ اس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح (رسوائی) کے روادار ہوں گے؟" (بنام تفتہ، مابین سوم دہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے، واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصلی نسخے میں سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے خدا کرے انجام تک یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔"

(بنام تفتہ، ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بھائی صاحب (منشی نبی بخش حقیر) کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہو گئی؟ بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے۔ آپ کی تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں، یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔"

(بنام تفتہ، ۱۶ر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غرض، یہ کہ کاپی کی تصحیح کا ذمہ منشی نبی بخش حقیر کا تھا اور وہ اس میں پورے اُترے کہ "دستنبو" غلط نامے کی حاجت سے بے نیاز رہی۔ گو دو تین غلطیاں

پھر بھی رہ گئیں[۵۲]" اور یہ کوئی ایسی بات نہیں اس لئے کہ مولانا غلام رسول مہر کے لفظوں میں :

"ہمارے ہاں طباعت کے انتظامات ابھی تک اس اعلیٰ پیمانے پر نہیں پہنچ سکے کہ صحتِ متن کے متعلق فارغ البالی کا وثیقہ حاصل کر لیا جائے[۵۳]۔"

غالب نے "دستنبو" کو بزبانِ فارسیٔ قدیم لکھنے کا ادّعا کیا ہے، یعنی التزام یہ رکھنا چاہا ہے کہ تمام کی تمام عبارت خواہی نظم ہو، خواہی نثر جو متنِ کتاب میں آئے بے آمیزشِ لفظِ عربی ہو۔ "دستنبو" طبعِ اوّل کے سرورق پر اپنے اس کمالِ فن کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے :

"کتابِ مستطاب نایاب بزبانِ فارسی قدیم، بے آمیزشِ لفظِ عربی۔"

کتاب کی اشاعت سے پہلے مختلف خطوں میں، فارسیٔ قدیم کی خود اختیاری قید کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے :

"فارسی، بے آمیزش لفظِ عربی لکھی ہے اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا اب پارس کے بلاد میں نشان نہیں، تا بہ ہندوستان چہ رسد؟"

(بنام : نامعلوم، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء)

—

"التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے، جو نظم اس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزش لفظِ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔"

(بنام : منشی ہرگوپال تفتہ، ۱۷ر اگست ۱۸۵۸ء)

—

"میں نے گیارہویں مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رُوداد نثر میں بعبارتِ فارسی ناآمیختہ بہ عربی لکھی ہے۔ "دستنبو" اس کا نام رکھا ہے۔"

(بنام : انوار الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

کتاب چھپ جانے کے بعد لکھتے ہیں :

---

[۵۲] نامۂ غالب بنام شیو نرائن مرقومہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء

[۵۳] نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء، صفحہ ۱۴۰

"بھر ق زنہ، ملا بیٹھ، اس کا التزام کیا ہے کہ بزبان فارسی قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے، اس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے ساسانیوں کے وہ نام جو بدل جاتے، کوئی لفظ عربی اس میں نہ آوے۔"

(بنام چودھری عبد الغفور سرور، ۱۰ نومبر ۱۸۵۸ء)

"نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آنے۔"

(بنام یوسف علی خاں عزیز، ۱۸۵۹ء)

کتاب کی طباعت کے دوران میں غالب کو احساس ہوا کہ وہ ایک عربی لفظ "نہیب" استعمال کر گئے ہیں۔ یہ ان کے التزامات تحریر کے منافی تھا چنانچہ انہیں صبر کہاں وہ بے چین ہو گئے:

"ایک اور کام آپ کو کرنا چاہیئے ارشاد آپ سے ہوا ہے امرتسر یا جو تھے صفحے کا فقرہ ہے، اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند" نہیب" کا لفظ عربی ہے۔ یہ سہو سے لکھا گیا ہے۔ اس کو چھیل ڈالیے گا اور اس کی جگہ "نوائے مباش" بنا دیجیے گا۔ "نہیب" کی جگہ "نوائے" کا لفظ بنا کر مجھ پر عنایت کیجیے۔"

(بنام شیو نرائن، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"بہت ضروری یہ امر ہے اور میں منشی شیو نرائن صاحب کو آج صبح لکھ چکا ہوں، تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول یہ جملہ ہے: اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند" "نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دینا۔ "بہ نوائے مباش بہم زند" "نہیب" لفظ عربی ہے۔ اگر یہ رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔"

(بنام تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"نہیب" کے لفظ کو چھیل کر "نوائے" بنا دیا ہو گا؟"

(بنام تفتہ، مابین سوم و ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

"آنکہ ہمہ را دریک دم بہ تو پدید آورد، اگر دردم دیگر بہ نہیب مباش بہم زند الخ" اس میں "نہیب" کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہو کاتب سے رہ گیا ہے۔ اس کو تیز چاقو سے چھیل کر "بہ نوائے" لکھ دینا یعنی، "بہ نوائے مباش بہم زند" ضرور، ضرور، اور اس کا انتظار

نہ کیجیو کہ جب یہاں چھاپا آئے کا بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے، نہ چھاپے میں غلط ہو۔ اگر اجزائے اصل میر امیر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو ان کو یا بھائی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔"

(بنام تفتہ (ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء)

اس واویلے کے باوجود معلوم ہوا کہ "تہیب" کی درستی نہیں ہو سکتی۔ وہ حصۂ کتاب جس میں یہ لفظ آیا ہے، چھپ چکا۔ اس پر اپنی تہیدستی کے باوجود غالب نے بہت حساس ہونے کا ثبوت دیا:

"اچھا میرا بھائی! "نہیب" والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودے میں بتا دیا تھا، لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔ "نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں، اس کی درستی کی خبر بھیجو۔"

(بنام تفتہ، ۱۶ر ستمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں تک کہ بالآخر اس غلطی کی درستی ہو گئی:

"نہیب" کی جگہ "نوائے" بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی! میں فارسی کا محقق ہوں۔ کاتب ان اجزا کا، جن کی رو سے کاپی لکھی جاتی ہے (یعنی غالب) فارسی کا عالم ہے، علم اس کا غیاث الدین رامپوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق، ان اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔"

(بنام تفتہ، ۱۷ر ستمبر ۱۸۵۸ء)

لیکن اس اہتمام و کاوش، حزم و احتیاط اور "نفس مطمئنہ" کے باوجود وہ اس التزام میں تمام و کمال پورا نہیں اتر سکے کہ "بزبانِ فارسئ قدیم، جو دساتیر کی زبان ہے۔ اس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسمار کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے" "نہیب" کی ہر قیمت پر انہوں نے صحت کر دی تھی، بایں ہمہ بعض لغات ان کی نظر سے رہ گئے۔ جن سے سید جمیل الدین نے اپنے ایک فاضلانہ مقالے میں جو "دستنبو کا ایک خاص نسخہ" کے زیرِ عنوان

سہ ماہی "نوائے ادب" بمبئی کی چار اشاعتوں[1] میں قسط وار چھپا ہے، بہت اچھی بحث کی ہے ان میں سے کچھ عربی کلمات مثلاً ماتم، زمزمہ، مشرد، صاحب، قلعہ، کیسہ، غوغا، خنجر کی مثال دی جاسکتی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی شعبۂ فارسی کے صدر پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن کے بقول:

"ان میں سے بعض الفاظ بظاہر فارسی کے ہیں۔ یہاں تک کہ لفظ "خنجر" کے بارے میں تو رضا قلی ہدایت کو لکھنا بھی پڑا کہ اگرچہ در اشعار پارسی بسی مشہور است اما عربیست و دشنہ، پارسی آنست[2]۔ مگر ان سب کی اصل عربی ہے۔ بہرحال ان چند مستثنیات کے سوا کتاب کی زبان وہ ہے۔ جسے میرزا غالب نے خالص فارسی سمجھا ہے اور جس کے لکھنے میں انہوں نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔"

(مقدمہ، دستنبو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۸۔۲۹)

کاوش ہی سے کام نہیں لیا، اس پر جا بجا، یا بے جا فخر بھی کیا ہے:

"دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے، مگر یہ چار جزو کا رسالہ (دستنبو) جو ابھی بھیجا ہے۔ اس کا دیکھنا ضرور در کار ہے۔ فارسی قدیم اور بہر حسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ۔ بایں ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ۔"

(بنام: نواب محمد یوسف علی خاں، نومبر ۱۸۵۸ء)

اس عبارت کا خط کشیدہ ٹکڑا، رکنے پر مجبور کرتا ہے اور معنویت سے بھرپور ہے۔ "ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ" رکھا گیا، تب ہی یہ کتاب ۱۸۵۷ء کے تازہ عائد سخت پریس ایکٹ کی موجودگی میں حکام کے پیشگی ملاحظے کے بعد چھپ سکی اور صاحبانِ مطبع کو اس کا انطباع، نامطبوع نہیں ہوا۔ انگریز حکام نے "بہ کمال خوشی" اس کے چھاپنے کی اجازت دی تو اسی بنا پر کہ اس کا طرزِ تحریر یک طرفہ، مدحیہ، تائیدی اور تحسینی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" میں غالب بقول شخصے انگریز کی زبان سے بولے ہیں اور انہوں نے مصلحت کی قلم سے اسے لکھا ہے۔

---

[1] (الف) جلد ۶ شمارہ ۱، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۲۱
(ب) جلد ۶ شمارہ ۲، اپریل ۱۹۵۵ء، ص ۳۷
(ج) جلد ۶ شمارہ ۳، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۵۱
(د) جلد ۷ شمارہ ۴، جولائی اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۱

[2] فرہنگ انجمن آرای ناصری، تہران ۱۲۸۸ھ

کتاب کو بالقصد اور بالاعلان فارسی قدیم میں پیش کرنا بھی حکمت سے خالی نہیں تھا۔ یہ مصلحتوں کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس روزنامچے کو دساتیر کی جناتی زبان میں لکھ کر غالب نے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ پہلی بات تو کمالِ فن کا اظہار تھا، یعنی غالب نے "دستنبو" کو اپنے اس احساس کے منہ بولتے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ وہ فارسی کے علم میں یکتا و یگانہ ہیں اور خالص فارسی زبان پر جیسی قدرت اور دسترس انہیں حاصل ہے، آج اُس کی نظیر اور مثال، کیا ہند اور کیا پارس، کہیں نہیں۔

اس سلسلے کی دوسری بات یہ کہ غالب جس معاشرے کے فرد تھے، وہ پرانے نظام کا حامی اور نئی عملداری سے نفور تھا۔ "جمیع اہلِ ہند، کیا ہندو، کیا مسلمان، بہادر شاہ ظفر سے کسی نہ کسی درجے میں عقیدت اور محبت رکھتے تھے اور ان کے دل بادشاہ کی عزت اور عظمت سے یکسر خالی نہیں تھے۔ بہادر شاہ کی ذاتی اہلیت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اُس کی حیثیت ایک علامت اور ایک نشانی کی تھی۔ وہ ڈوبتا ہوا سورج سہی، لیکن وہ ایک ایسی صبح کی شام تھا جس میں ہندوستان نے اپنے سیاسی وقار اور تمدنی عظمت کے نادر جلوے دیکھے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ طاقتیں تک جو کچھ عرصے سے سلطنتِ مغلیہ کے مدِمقابل آگئی تھیں (۱۸۵۷ء میں) بہادر شاہ کے گرد جمع ہو گئیں[1]۔"

شاہ کے مقابلے میں، فرنگیوں کے لئے ہندوستانیوں کے دل میں، گو پہلے بھی کوئی جگہ نہیں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کی دار و گیر نے اُن کے لئے دلوں میں فاصلہ بہت ہی بڑھا دیا۔ انگریز حکام کی بے جواز تحسین و تائید میں کتاب لکھنے کا نتیجہ معاشرے میں انگشت نمائی کا باعث ہو سکتا تھا۔ اس سے بچنے کے لئے غالب نے یہ سرگزشت متعارفہ اور مروجہ فارسی میں لکھنے کے بجائے فارسی قدیم میں لکھی اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم کہ جس کا ہندوستان کا تو کیا مذکور، پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، تاکہ کتاب کے مندرجات بیشتر اہلِ ہند کے لئے سربستہ راز رہیں۔

مختصر یہ کہ اپنے عہد کی متعارفہ اور مروجہ فارسی کی جگہ، بعبارتِ فارسی، ناآمیختہ بہ عربی میں یہ رُوداد لکھنے میں ایک حکمت تو یہ تھی کہ اس نادر و یگانہ روشِ تحریر کو اپنے کمالِ فن کے طور پر پیش کرنا مقصود تھا اور دوسری مصلحت اس میں یہ تھی کہ معاصر اہلِ ہند کے لئے کتاب

---

[1] خلیق احمد نظامی، مقدمہ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۸ء، صفحہ ۳۱

قفلِ ابجد ہو کر رہ جائے۔ اگر یہ حکام کو آج جو اس کتاب کے مخاطب تھے۔ بہ نوع اپنے فارسی خواں عملے کے ذریعے اس قفل کو کھلوانا بھی تھا غالب کی جالبیہ تھی کہ کتاب اپنے ناآشنا طرزِ تحریر کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لئے سربستہ راز رہے تاکہ وہ ان کے معصوم رہیں اور ہدفِ ملامت بننے سے محفوظ رہیں۔

غالب کو اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ ایک طرف انگریز حکام نے اُن کے کمالِ فن کی داد دی، پنشن کی بحالی کی سفارش ہوئی۔ عالی مقام حکام سے رہ و رسمِ مراسلت بدستور جاری ہو گئی، اُن کی خوشنودی اور سرپرستی حاصل ہو گئی۔ قلعۂ معلّٰی سے تعلق کی صفائی ہو گئی، غالب کی ہی مسموع ہوا۔ اِک گونہ سکون ہوا۔ پنشن کا زرِ مجتمعہ سہ سالہ، پائی پائی مل گیا۔ آئندہ کے لئے خرستہ نہ رہا۔ پچھلا خلعت بحال ہو گیا اور دوسری طرف کتاب اہلِ ہند میں بالعموم نہیں بھی تو غالب کے ایک سے زیادہ خطوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "دستنبو" اچھے اچھوں کی سمجھ سے بالا رہی۔

غالب کا احساس یہ تھا کہ "دستنبو" کی عبارت کو محض درست پڑھنا بھی بڑی بات ہے یہ آسان نہیں۔ فہمِ عبارت تو بہت دور کی بات ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں یہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے اور یہ طرزِ تحریر نادر نہ سہی، بیگانہ و ناآشنا ضرور ہے اس لئے اہلِ علم و فضل بھی اس عبارت پر سے سرسری گزر سکتے ہیں:

"مبالغہ اس کتاب کی تصحیح میں اس واسطے کرتا ہوں کہ عبارت کا ڈھنگ نیا ہے۔ صحیح کا درست پڑھنا بڑی بات ہے، اگر غلط ہو جائے تو پھر وہ عبارت نری خرافات ہے۔"

(بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ستمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ کتاب (دستنبو) جو مرسل الیہ (لیفٹیننٹ گورنر صوبہ غرب و شمال) کے مطالعے میں ہے۔ قیمت کی اچھی ہے یعنی خود ملاحظہ فرما رہے ہیں اور اگر کہیں پوچھنا ہو گا تو یقین ہے کہ آپ سے پوچھیں گے۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، دسمبر ۱۸۵۸ء)

"جن کو اس (دستنبو) کے دیکھنے کا حکم ہوا ہے، وہ اہلِ علم و فضل میں سے ہیں۔ لیکن یہ طرزِ تحریر، میں نہیں کہتا کہ یہ نادر ہے، مگر بیگانہ و ناآشنا ہے۔ خدا کرے کہ وہ جو اس کی سیر پر

ملاحظہ ہیں، ان اوراق کو بہ مشورت آپ کے دیکھا کریں اور کہیں کہیں آپ سے پوچھ لیا کریں۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، دسمبر ۱۸۵۹ء)

کتاب چھپنے سے پہلے "آرام" نے "دستنبو" کے بعض نسخے نابا ابن برادن کو سنائے تھے اور اس کا ذکر اپنے خط میں کیا۔[1] اس پر غالب، ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں "آرام" سے پوچھتے ہیں کہ:

"یہ جو تم نے لکھا ہے کہ صاحب نے سن کر اس کو پسند کیا، میں حیران ہوں کہ کون سا مقام تم نے پڑھا ہوگا، کیوں کر کہوں کہ صاحب اس عبارت کو سمجھے ہوں گے؟ اس کی جو حقیقت ہو ـــ مفصل لکھو۔"

اس کی تفصیل پہلے آچکی کہ اندور کے رائے اُمید سنگھ کی دلچسپی اور مالی اعانت سے "دستنبو" کا ڈول ڈلا ـــــ مولانا غلام رسول مہر کے بقول[2] "رائے امید سنگھ نے دہلی کالج میں تعلیم پائی پھر مہاراجہ ہلکر والئ اندور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ہلکر نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اُمید سنگھ کو مشیر الدولہ کا خطاب دیا۔" رائے صاحب کے آگرہ پہنچنے کی اطلاع دیتے ہوئے، غالب نے تفتہ کو ہدایت کی تھی کہ:

"رائے صاحب مکرم معظم رائے اُمید سنگھ بہادر کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں (آگرہ میں) رہیں، تب تک حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو اُن کا حکم ہو بجا لانا، ان کو پڑھا بھی دینا۔"

(۲۸ اگست ۱۸۵۸ء)

چار روز بعد کے ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:

"جانتا ہوں کہ تم رائے امید سنگھ سے بھی نہ ملے ہوں گے۔ عیاذاً باللہ! میں، اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں مرزا تفتہ "دستنبو" کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔"

(یکم ستمبر ۱۸۵۸ء)

مشیر الدولہ رائے امید سنگھ، نہ صرف یہ کہ دہلی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ بلکہ والئ اندور کے اتالیق بھی تھے لیکن "دستنبو" کی عبارت فہمی، غالب کے نزدیک اُن تک کے بس کی بات نہیں

---

[1] مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اول، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۴۶

[2] ایضاً، صفحہ ۹۳

تھی، اس لئے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ "دستنبو" رائے صاحب کو باقاعدہ پڑھائی جائے۔

غالب نے تفتہ، مہر، آرام، حقیر اور ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف پر مشتمل ایک "کونسل"[1] تشکیل دے دی تھی جو آگرہ میں کتاب کی طباعت و اشاعت، کتابت، تصحیح، تصحیف، تزئین اور تجدید کے لئے سرگرمِ عمل تھی۔ ترتیب و کتابت اور اشاعت و طباعت کی ساری جزئیات ان اصحاب کے باہم مشورے سے طے پاتی تھیں۔ ایک ایسی شہادت موجود ہے کہ یہ "کونسل" جو غالب کے بعد کتاب سے سب سے زیادہ متعلق تھی، کتاب کی "حقیقت" جاننے سے معذور رہی۔ کتاب کے سرورق کی عبارت آگرہ میں تجویز ہوئی۔ اس کا مسودہ، آرام نے غالب کے ملاحظے اور مشورے کے لئے بھیجا، جس میں کتاب کو انگریزوں کی فتح کے مفصل حالات کی حامل ظاہر کیا گیا تھا۔ غالب نے اسے خلافِ مضمون کتاب قرار دیتے ہوئے لکھا کہ:

"آخر..... کی..... سطریں از روئے مضمون سراسر کتاب کے خلاف ہیں۔ میں نے سرکار کی فتح کا حال نہیں لکھا، صرف اپنی پندرہ مہینے کی سرگزشت لکھی ہے، تقریباً شہر و سپاہ کا بھی ذکر آگیا ہے اور وہ اپنی سرگزشت جو میں نے لکھی ہے، سو ابتدا ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک لکھی ہے شہر ستمبر میں فتح ہوا۔ اس کا بیان بھی ضمناً آگیا۔ خوب ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا، ورنہ بڑی قباحت ہوتی۔ اب جس طرح سے کہوں، سو کرو..... میں دوسرے صفحے پر ساتوں سطریں لکھ دیتا ہوں اس کو ملاحظہ کرو۔ اور میرا کہنا مانو ورنہ کتاب کی حقیقت غلط ہو جائے گی اور مطبع پر بات آئے گی۔"

(بنام: شیو نرائن آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

غالب دلی میں تھے اور کتاب آگرہ میں چھپ رہی تھی۔ نظراً اور شہر سے دور، آگرہ میں کتاب چھپنے کا باعث یہ تھا کہ دلی میں اُن دنوں طباعت و کتابت کا انتظام تسلی بخش رہا تھا اور نہ صحافی اور نقاشی کا:

"یہاں کوئی مطبع نہیں ہے یہ سنتا ہوں، ایک ہے، اُس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرہ میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔"

(بنام: تفتہ، ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء)

"میرزا تم بڑے بے درد ہو، دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔

---

[1] خطوطِ غالب، ایضاً، صفحہ ۷۰، ۷۶، ۱۹۲، ۱۹۵ وغیرہ وغیرہ۔

یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں؟ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو کیوں تکلیف دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔"

(بنام تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیم روز)

کتاب اپنی نظر اور اپنے شہر سے دُور چھپ رہی تھی، ایک قباحت ـــــ پھر یہ کہ بوجوہ غالب کتاب کی خوبصورت، صحیح اور جلد تر اشاعت کے متمنی تھے اس ضمن میں "روز" ہی انہیں کوئی نہ کوئی فکر لاحق ہو جاتی تھی اور کسی نہ کسی تجویز، وضاحت اور ہدایت یا استفسار کی ضرورت پیش آجاتی تھی ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب، حقیر کو لکھتے ہیں:

یہ ہم، تم اور میرزا تفتہ میں مراسلت، گویا مکالمت ہو گئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجھ کو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا تو لفافے بناؤں گا۔ غنیمت ہے کہ محصول آدھ آنہ ہے، ورنہ باتیں کرنے کا مزا معلوم ہو جاتا!"

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا، غالب نے آگرہ میں جہاں کتاب زیر طبع تھی، میرزا ہر گوپال تفتہ، مرزا حاتم علی بیگ مہر، منشی شیو نرائن آرام، منشی نبی بخش حقیر اور اُن کے صاحبزادے منشی عبد اللطیف پر مشتمل ایک "کونسل" قائم کر دی تھی۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق "دستنبو" کی تجویز (جولائی ۱۸۵۸ء) سے اس کی اشاعت (نومبر ۱۸۵۸ء) تک کی تہائی سال کی مُدت میں غالب نے "کونسل" کو چالیس پینتالیس خط لکھے، لکھے یقیناً اس سے بہت زیادہ، لیکن محفوظ اتنے ہی رہ سکے۔

اِس مراسلت بسر روزہ نے وہ مواد فراہم کر دیا جس نے آگے چل کر "عود ہندی" اور پھر "اردوئے معلیٰ" کی خشت اول کا کام کیا۔ تھوڑی سی مدت میں ایک جگہ، ایک حلقے میں غالب کے بہت سے خط جمع ہو گئے۔ غالب کا جی کتاب کی اشاعت میں گڑا ہوا تھا۔ اس لیے اشاعتِ کتاب کے سلسلے کے یہ خط بڑے پُر زور ہیں اور کُھلے دل سے لکھے گئے ہیں۔ مکتوب الیہم کے حق میں جو نسبتاً کم نام اصحاب تھے، غالب کی یہ تحریریں، سرٹیفکیٹ کا درجہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنی بڑی پونجی خیال کیا۔ انہیں احتیاط سے رکھا اور اس کی اشاعت کی طرف دھیان دیا۔ ان کی اشاعت میں مکتوب الیہم کو اپنی شہرت کا پہلو بھی دکھائی دیا ہو تو عجب نہیں۔ اس طرح کچھ ان خطوں کا حسنِ ذاتی اور کچھ اپنے کو نامور بنانے کی شخصی اور فطری کمزوری، اس خیال کا باعث ہوئی کہ انہیں چھاپا جائے۔ چنانچہ جب نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتے میں آرام "دستنبو" کی طباعت سے

فارغ ہوئے تو انہوں نے خطوطِ غالب چھاپنے کی فکر کی۔ غالب کے لئے یہ قطعی نئی اور زائد بات تھی۔ انہوں نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے بڑے واضح لفظوں میں شیونرائن آرام کو لکھا کہ:

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رُقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلافِ طبع ہے۔"

یہ ۱۸؍ نومبر ۱۸۵۸ء کا خط ہے۔ اُردو خطوں کی اشاعت کی اِس تجویز میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی شیونرائن کے شریک تھے اور پسند کرتے تھے کہ خطوط ضرور چھاپے جائیں۔ ۲۰؍ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا کہ:

"رُقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔"

اسی روز یعنی ۲۰؍ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک دوسرے خط میں غالب نے اپنے پچھلے خط کے حوالے سے شیونرائن کو لکھا کہ:

"رقعوں کے چھاپنے کے باب میں ممانعت لکھ چکا ہوں۔ البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور میرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔"

آرام اور تفتہ کی یہ تحریک و تجویز جسے ۱۸۵۸ء میں زائد بات کہہ کر جھٹک دیا گیا تھا۔ ٹھیک دس برس بعد ۱۸۶۸ء میں "عودِ ہندی" کے نام سے حقیقت بن کر اُبھری اور اس کی خوشبو چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ "عودِ ہندی" بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد غالب کے اُردو مکاتیب کی جمع و ترتیب کے کام کا ایک تار بندھ گیا، جس کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے لیکن جب بھی اس سلسلے کے آغاز کی جستجو کی جائے گی، بات "دستنبو" تک پہنچے گی۔ "دستنبو" کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

منشی شیونرائن، کتاب باہتمام چھاپ تو رہے تھے لیکن کم و بیش ہر طابع کی طرح، انہیں یہ فکر بھی رہی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ کتاب پڑی ہی نہ رہ جائے۔ تفتہ نے اس طرف توجہ دلائی یا خود غالب کا دھیان اس طرف گیا، صورت خواہ کچھ بھی رہی ہو، ۱۶؍ ستمبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں تفتہ سے پوچھتے ہیں:

" ہمارے منشی شیونرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں ؟"

اشتہار اور اس کے مضمون کی طرف اشارہ شیونرائن کے ایک خط مرقومہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بھی ملتا ہے :

" دستنبو کے آغاز (سرورق) کی عبارت از روئے احتیاط دوبارہ ارسال کی ہے یقین ہے کہ پہنچ گئی ہوگی، اور چھاپی گئی ہوگی اور آپ نے اسی عبارت سے اشتہار بھی اخبار میں چھاپا ہوگا یا چھاپیے گا "

غالب کے خطوں میں ایسا کوئی حوالہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ کتاب کا یہ مجوزہ اشتہار مطبع مفید خلائق آگرہ کے اخبار میں چھپا یا نہیں، لیکن کتاب کے چھپ چکنے کے بعد غالب کے ایک خط بنام شیونرائن کا یہ جملہ صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے :

" یہ صاحب لوگ، اطراف و جوانب سے مجھ پر فرمائشیں بھیجتے ہیں، تم سے بہ قیمت کوئی نہیں منگواتا "

(۴ جنوری ۱۸۵۹ء)

غالب کے ایک خط سے " دستنبو " کی نکاسی کے بارے میں کتاب کے طابع شیونرائن کی ایک تجویز ہویدا ہے (جو ضروری نہیں کہ بربنائے تشویش ہی ہو) کہ غالب ہنری اسٹورٹ ریڈ سے جو صوبہ غرب و شمال میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے، " دستنبو " کی خریداری کی تحریک کریں۔ غالب نے جواباً لکھا کہ ریڈ صاحب نے مجھ سے اردو میں کتاب مرتب کرنے کی فرمائش کر رکھی ہے وہ پوری ہو تو " دستنبو " کی خریداری کے لئے لکھوں۔ غالب کے خطوں کے لفظ یہ ہیں :

" جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اُردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں "

(بنام شیونرائن ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء)

" ریڈ صاحب کے باب میں، میں نے یہ لکھا تھا کہ جب اُردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو " دستنبو " کی خریداری کی خواہش کروں گا "

(بنام شیونرائن، ۱۵ دسمبر ۱۸۵۸ء)

یہاں " خریداری کی خواہش " سے مراد ہے کہ ہنری اسٹورٹ ریڈ اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ کے لئے " دستنبو " کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں، نہ یہ کہ وہ " اپنے لئے " ایک نسخہ

خریدیں! اُن کے ذاتی ملاحظے کے لئے تو شیونرائن اور غالب دونوں الگ الگ "دستنبو" کا ایک ایک نسخہ ہدیہ کر چکے تھے:

"ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب ممالکِ مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب تھے۔ ان کے دنوں میں ایک ملاقات، میری اُن کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب سادہ بے جلد ان کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا۔ بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں مجھی ایک تماشا ادھر ہے۔ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، مطبع مفید خلایق نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا"۔

(بنام تفتہ، ۲۷ر نومبر ۱۸۵۸ء)

ظاہر ہے شیونرائن، کہ "دستنبو" کے ناشر تھے، جائز طور پر اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے، جلد نکل جائے۔ غالب نے ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں انھیں لکھا کہ:

"ایک قرینے سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ شاید گورنمنٹ سو دو سو "دستنبو" کی خریداری کرے گی اور ان نسخوں کو ولایت بھیجے گی۔ کیا بعید ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں الہ آباد سے تمہارے پاس حکم پہنچے"۔

شیونرائن کو "قرینے" کی جستجو ہوئی جو قدرتی بات تھی لیکن غالب سے بات بنائے نہیں بنی:

"میاں! کیا قرینہ بتاؤں، گورنمنٹ کی خریداری کا؟ ایک بات ایسی ہے کہ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ خدا کرے اس کا ظہور ہو جائے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ پوچھو"۔

(مرقومہ ۱۸ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

کوئی بات اگر "واقعی" تھی بھی تو اس کا "ظہور" بہر حال نہیں ہوا، اس لئے کہ شیونرائن کے نام غالب کا ایک خط مرقومہ ۱۹ر اپریل ۱۸۵۹ء اس بات کا مظہر ہے کہ کتاب کا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۹ء میں سب کا سب نکل گیا اور اس میں غالب کی کسی کوشش کو دخل نہیں تھا:

"کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا۔ خدا کرے جس کسی کو دی ہو، دو تین غلطیاں جو معلوم ہیں، وہ بنا دی ہوں۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ صاحب لوگوں نے خریدیں یا ہندوستانیوں نے لیں؟ تم مجھ کو یہ بات ضرور ضرور لکھو۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہوگی، یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی، پورب میں کم بکی ہوں گی"۔

غالب کا قیاس صحیح نکلا۔ ۲۲ر اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں آرام کو لکھتے ہیں:

"دستنبو" کی خریداری کا حال معلوم ہو گیا۔ میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی"۔

کتاب کا ایڈیشن ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء سے پہلے نکل گیا تھا لیکن پھر اس کا ایک نسخہ ولایت بھیجنے کی ضرورت پیش آگئی۔ آرام آگرہ سے دہلی آرہے تھے۔ چنانچہ ۲۳ جولائی ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے انہیں لکھا کہ :

"اگر 'دستنبو' باقی ہوں تو دو اپنے ساتھ لے آنا۔"

آرام کے نام ۱۷ اگست ۱۸۵۹ء، ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۹ء اور ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۹ء کے خطوں میں بھی کتاب "دستنبو" اور ولایت کے لئے انگریزی عرضی کا ذکر آیا ہے یہ دونوں چیزیں اُس وقت تک غالب کو فراہم نہیں ہوئی تھیں اور اگلے برس غالباً وسط جنوری تک بہ کہیں اُنہیں مل سکیں، اس لئے کہ ۳ مارچ ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں جو غالب نے رامپور کے دورانِ قیام میں آرام کو لکھا ہے کتاب اور عرضی کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے :

"کتاب اور عرضی اواسطِ ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔"

اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں جو رامپور سے دہلی لوٹ آنے کے بعد آرام کو لکھا گیا ہے غالب کہتے ہیں :

"۱۹ یا ۲۰ جنوری ۱۸۶۰ء کو کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کر کے رامپور گیا ہوں۔"

گویا ولایت بھیجنے کے لئے "دستنبو" کے ایک نسخے کی فراہمی کی جو فرمائش غالب نے جولائی ۱۸۵۹ء میں کی تھی، آرام اُسے چھ ماہ کے بعد پورا کر سکے۔ تاخیر بظاہر اسی بنا پر واقع ہوئی ہوگی کہ کتاب آرام کو تلاشِ بسیار کے باوجود، اس درمیان میں نہ مل سکی ہوگی۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ "دستنبو" کا پہلا ایڈیشن جو نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔ اشاعت کے قریب آٹھ نو ماہ کے اندر اندر سب کا سب نکل گیا تھا اور اسی زمانے میں اس کا ہاتھ آنا آسان نہیں رہا تھا۔

O

"دستنبو" میں غالب نے انگریزوں کی چیرہ دستیوں کے لئے عذر وضع کئے ہیں اور ان مظالم کے لئے جواز پیدا کر کے انہیں بے اثر اور پردہ پوش کرنے کی کوشش کی ہے :

"غضبناک شیروں (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔"

"یہ جو گھر بار اور جان و مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ

ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہارِ اطاعت کرے، اُس کو قتل نہ کیا جائے، مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے، مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی، اسی وجہ سے اُن کو قتل کر دیا گیا۔"

غالب نے ایک طرف تو انگریزوں کی سختیوں کو امرِ معمولی قرار دیا ہے۔ دوسری طرف ان کے لئے سپر فراہم کرنے اور پناہ گاہیں تراشنے میں بھی مستعدی دکھائی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ غالب نے انگریز سپاہیوں کے مظالم کو کم کر کے پیش کیا ہے اور ان کی معقولیت اور امن پسندی کے گُن گائے ہیں:

"۔۔۔۔۔۔۔ انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں۔"

"(انگریز سپاہی) عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں، قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا، پھر سامان لوٹ لیا۔ (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔"

"انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لئے لڑتے اُٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا۔ (اگرچہ) اُن کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

غالب کے یہ بیانات صریحاً انگریزوں کی تائید میں ہیں لیکن خود غیر جانبدار انگریز مؤرخین کی شہادتیں اس کے برعکس ہیں۔ دلی کے شہریوں پر انگریز سپاہیوں کے جاں سوز مظالم کے بارے میں لارڈ الفنسٹن، سر جان لارنس کو لکھتے ہیں کہ:

"(دہلی کے) محاصرے کے ختم ہونے کے بعد سے ہماری فوج نے جو ظلم کئے ہیں، انہیں سُن کر دل پھٹنے لگتا ہے۔ بغیر دوست یا دشمن میں تمیز کیے، یہ لوگ سب سے یک سا بدلہ لے رہے ہیں۔ لوٹ میں تو حقیقت میں ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے۔"

[Life of Lord Lawrance, by : Baswarth Smith, vol. II p. 262]

پنڈت سندر لال کا بیان ہے کہ:

"محاصرے کے دنوں میں قلعے کے چھتے میں بیمار اور زخمی سپاہیوں کا ایک اسپتال تھا۔ کمپنی کی فوج جس وقت قلعے کے اندر گھسی، جتنے زخمی اور بیمار اسپتال کے اندر دکھائی دیے، اُن سب کو، اُن سب نے اپنی گولیوں سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔ اسی طرح اور بھی کئی جگہ جہاں زخمی اور بیمار پائے گئے، قتل کر دیے گئے۔"

(سن ستاون، ص ۱۶۲، بحوالہ: تاریخ ہند، منشی ذکاء اللہ خاں، ص ۶۴۶)

اہلِ دہلی کے قتلِ عام کے بارے میں مانٹ گمری مارٹن لکھتا ہے کہ:

"جس وقت ہماری فوج شہر میں داخل ہوئی تو جتنے شہری، شہر کی دیواروں کے اندر پائے گئے، انہیں اُسی جگہ سنگینوں سے مار ڈالا گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اُن کی تعداد کتنی زیادہ رہی ہوگی جب میں آپ کو یہ بتاؤں کہ ایک ایک مکان میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس آدمی چھپے ہوئے تھے یہ لوگ باغی نہ تھے۔ بلکہ شہر کے باشندے تھے۔ جنہیں ہماری مشہور نرم دلی اور معافی پر بھروسہ تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ انہیں مایوسی ہوئی۔"

[Letter in the Bombay Telegraph, by : Montgomery Martin]

ایک دوسرا انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ:

"دلی کے باشندوں کے قتلِ عام کا کھلا اعلان کر دیا گیا۔ حالانکہ ہم جانتے تھے کہ اُن میں سے بہت سے ہماری فتح چاہتے ہیں۔"

[The Chaplain's Narrative of the Seige of Delhi, quoted by : Kaye]

اس خوفناک قتلِ عام کے دنوں میں صرف ایک دن کے منظر کو بیان کرتے ہوئے لارڈ رابرٹس لکھتا ہے کہ:

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک گئے تو ہمیں شہر، حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا۔

کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں کے سنائی نہیں دیتی تھی۔ کوئی زندہ آدمی نظر نہیں آیا۔ سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا۔ جن میں سے کچھ مرنے سے پہلے پڑے سسک رہے تھے۔"

"چلتے ہوئے بہت دھیرے دھیرے بات کرتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں ہماری آواز سے مُردے نہ چونک پڑیں۔ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کو کُتّے کھا رہے تھے اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جمع تھے جو ان لاشوں کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے تھے اور ہمارے چلنے کی آواز سے اُڑ کر تھوڑی دور جا بیٹھتے تھے۔"

"خلاصہ یہ کہ ان مُردوں کی حالت بیان نہیں ہو سکتی، جس طرح ہمیں ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا اسی طرح ہمارے گھوڑے انہیں دیکھ کر ڈر سے بدکتے اور ہنہناتے تھے۔ لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ اُن کے سڑنے سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبو پھیل رہی تھی۔"

[Forty Years in India, by : Lord Roberts]

ان میں سے بہت سے لوگوں کو طرح طرح کی تکلیفیں دے دے کر مارا گیا۔ لیفٹیننٹ ماجنڈی نے اپنی آنکھوں دیکھا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ سکھوں اور گوروں نے مل کر ایک زخمی آدمی کے چہرے کو پہلے اپنی سنگینوں سے بار بار بیندھا اور پھر دھیمی آنچ کے اوپر اُسے زندہ بھون دیا:

"اُس کا گوشت چٹخا، پٹھوں میں کالا ہو گیا اور جلتے گوشت کی سڑی بدبو نے اوپر اُٹھ کر ہوا کو زہریلا بنا دیا۔"

[Up Among the Pandies, by :
Lieut. Majendie, p. 187]

ٹائمز اخبار کے نامہ نگار سر ولیم رسل نے لکھا ہے کہ:

"میں نے اس شخص کی جلی ہوئی ہڈیاں کئی دن بعد میدان میں پڑی ہوئی دیکھیں۔"

[My Diary in India in the year 1856—59, Vol. I, p. 301—302]

گابرے ٹامسن نے سر ہنری کاٹن سے کہا تھا کہ دلی میں کچھ مسلمانوں کو ننگا کر کے زمین سے باندھ کر سر سے پاؤں تک جلتے ہوئے تانبے کے ٹکڑوں سے اچھی طرح داغ دیا گیا تھا۔

[Indian and Home Memories, by : Sir Henry Cotton, p. 143]

ان لوگوں کو مارنے سے پہلے کبھی کبھی بے دین کرنے کے لئے بھی کوشش کی جاتی تھی ایک انگریز پادری کی بیوہ نے لکھا ہے کہ:

بہت سے لوگوں کو پکڑ کر پہلے ان سے سنگینوں کے بل گرجا میں جھاڑو دلوائی گئی اور پھر سب

کو پھانسی دے دی گئی ہے۔"

[A Lady's Escape from Gwalior, p. 243]

رسل لکھتا ہے کہ کبھی کبھی :

"مسلمانوں کو مارنے سے پہلے انہیں سؤر کی کھالوں میں سی دیا جاتا تھا، اُن پر سؤر کی چربی مل دی جاتی تھی اور پھر اُن کے جسم جلا دیے جاتے تھے اور ہندؤں کو زبردستی دھرم سے گرایا جاتا تھا۔"

[Russell's Diary, Vol. II, p. 43]

پنڈت سُندر لال نے ٹھیک کہا ہے کہ اُن دردناک واقعات کے بارے میں زیادہ مثالیں دینا بہت تکلیف دہ ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار ساری دلّی خالی اور ویران ہوگئی بلکہ اُن اِنے گنے گھرانوں کو چھوڑ کر جن سے کمپنی کی فوج کو مدد مل رہی تھی، باقی سب شہریوں کو جو قتل یا پھانسی سے بچ سکے، زبردستی شہر سے باہر نکال دیا گیا۔ مؤرخ ہومس لکھتا ہے :

"دلی کے باشندوں نے باغیوں کے جرموں کا کئی گنا کفارہ ادا کر ڈالا۔ دسوں ہزار مرد، عورت اور بچے بغیر گھر بار کے اِدھر اُدھر کے علاقے میں گھوم رہے تھے جنہوں نے کوئی خطا نہیں کی تھی۔ اپنا جو کچھ مال اسباب وہ شہر میں پیچھے چھوڑ گئے تھے، اُس سے وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھو چکے تھے کیونکہ سپاہیوں نے گلی گلی اور گھر گھر جا کر ہر قیمتی چیز کو ڈھونڈ کر نکال لیا تھا اور جو کچھ سامان وہ اٹھا کر نہ لے جا سکے، اسے انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

[A History of the Indian Mutiny, by : Holmes, p. 386]

سر جان لارنس نے، انگریزی کمانڈر کے نام دسمبر ۱۸۵۷ء کے ایک خط میں اعتراف کیا ہے کہ :

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقے سے بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے، اس کے لئے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل حق بجانب ہوگا۔"

[Life of Lord Lawrence, by : Baswarth Smith, Vol. II, p. 158]

خود انگریزوں کے ان اعترافات کے بعد، غالب کے اُن بیانات صفائی کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ جو "دستنبو" میں انہوں نے انگریزوں کے ضبط و تحمل کی ذیل میں دیئے ہیں۔ غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں نے :

؎ : سن ستاون، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۹

"بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا:"

"۔۔۔۔۔۔ عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔۔"

انگریز مورخین ہی کی شہادتوں سے غالب کے اس بیان کی جو صریحاً انگریزوں کی مدافعت میں ہے تردید ہو جاتی ہے۔ "انگریز فوج کے سپاہی جہاں گھستے، جتنے آدمی انہیں راستے میں ملتے، انہیں وہ بغیر کسی امتیاز کے تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے یا گولی سے اڑا دیتے تھے۔ جگہ جگہ پر پھانسی کے تختے کھڑے کیے گئے۔ جن پر چوبیس چوبیس گھنٹے برابر کام جاری رہتا تھا۔ جب ان سے بھی کام نہ چلا تو انگریز افسروں نے درختوں کی شاخوں سے پھانسی کا کام لینا شروع کیا۔"

[Narrative of the Indian Revolt, p. 69]

کے اور مالسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جو لوگ پھانسی پر لٹکائے جاتے تھے اُن کے ہاتھوں اور پیروں کو تفریح کے لئے انگریزی کے آٹھ اور نو (8 اور 9) ہندسوں کی شکل میں باندھ دیا جاتا تھا جب یہ ترکیبیں بھی کافی نہ دکھائی دیں تو انگریز افسروں نے گاؤں کے گاؤں جلانے شروع کر دیے۔ گاؤں کے باہر توپیں لگا دی جاتیں تھیں۔ اور سب مردوں، عورتوں اور بچوں اور جانوروں سمیت گاؤں کو آگ لگا دی جاتی تھی کئی انگریز افسروں نے بڑے فخر کے ساتھ ان دردناک نظاروں کو اپنے خطوط میں بیان کیا ہے آگ اتنی ہوشیاری سے لگائی جاتی تھی کہ ایک بھی گاؤں والا نہ بچ سکے۔

[Kaye and Malleson's History of the Indian Mutiny, Vol. II, p. 177]

چارلس بال لکھتا ہے کہ:

"مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں سمیت اور بے شمار بوڑھے مرد اور عورتیں، جو اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے، بچھونوں کے اندر جلا کر خاک کر دیے گئے۔"

[Charles Ball's History of the Indian Mutiny, Vol. I, p. 243—244]

ایک انگریز اپنے خط میں لکھتا ہے کہ:

"ہم نے ایک بڑے گاؤں کو آگ لگائی جس میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں گھیر لیا اور جب وہ آگ کی لپٹوں میں سے نکل کر بھاگنے لگے تو ہم نے انہیں گولیوں سے اڑا دیا۔"

[Charles Ball's History of the Indian Mutiny, Vol. I, p. 243—244]

مورخ سرجان کے لکھتا ہے کہ:

"فوجی اور سول دونوں طرح کے انگریز افسر اپنی اپنی خونی عدالتیں لگا رہے تھے یا بغیر کسی طرح کے مقدمے کا ڈھونگ رچائے اور بغیر مرد، عورت یا چھوٹے بڑے کا خیال کئے ہندوستانیوں کا قتلِ عام کر رہے تھے ہندوستان کے گورنر جنرل نے جو خط انگلستان بھیجے اُن میں ہماری برٹش پارلیمنٹ کے کاغذوں میں یہ بات درج ہے کہ بوڑھی عورتوں اور بچوں کو اُسی طرح سے ذبح کیا گیا جس طرح اُن لوگوں کو جو بغاوت میں شامل تھے۔ انگریزوں کو فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے یا خطوط میں لکھتے ہوئے بھی جھجک نہ محسوس ہوئی کہ ہم نے ایک بھی ہندوستانی کو نہیں چھوڑا، اور کالے ہندوستانیوں کو گولیوں سے اڑانے میں ہمیں بڑا لطف آتا تھا اور حیرت انگیز خوشی ہوتی تھی۔ ہندوستانیوں کی تاریخی کتابوں میں یا اگر کتابیں نہ ہوں تو اُن کی کہانیوں اور بیانوں میں ہمارے قوم کے خلاف یہ یادگار رہے گی کہ ہندوستان کی مائیں، بیویاں اور بچے جن کے نام سے ہم اتنی اچھی طرح واقف نہیں ہیں، انگریزوں کے انتقام کی پہلی باڑھ میں بے رحمی کے ساتھ شکار ہو گئے۔"

[Kaye's History of the Sepoy War, Vol. II, p.]

خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے ۲۴ دسمبر ۱۸۵۷ء کو اپنی کونسل کے اندر کہا تھا:

"نہ صرف چھوٹے بڑے ہر طرح کے مجرم ہی بلکہ وہ لوگ بھی جن کا قصور کم سے کم بہت ہی مشکوک تھا، بغیر کسی تمیز کے پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ گاؤں کو عام طور پر جلا ڈالا گیا اور لوٹ لیا گیا۔ اس طرح قصوروار اور بے قصور مرد اور عورت بچے اور بوڑھے سب کو بلا کسی تمیز کے سزا دی گئی۔"

(بحوالہ ۱۸۵۷ء، ص ۲۵۰)

غالب نے انگریزوں کے مظالم اور ان کی بے رحمی اور سفاکی کا تاثر ہلکا کرنے کی ایک صورت یہ بھی نکالی کہ "باغی" سپاہیوں کے طرزِ عمل کو حاشیہ آرائی کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا:

"۱۱ مئی ۱۸۵۷ء (کو) میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر (دہلی) میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے... (یہ) مدہوش سوار اور اکھڑ پیادے، دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا۔ ادھر سے رُخ نہیں پھیرا۔"

"زمین ہر طرف گل اندامو‌ں (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔ افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے وہ جن کے بدن بھی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دُنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی۔ یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔"

"(ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اُٹھائی۔ بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا۔"

غالب کا بیان ہے کہ شوریدہ سر، ظالم، مفسد، دیسی سپاہی انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے انھوں نے دیوانوں کی طرح انگریز افسروں کو قتل کیا۔ ان اکھڑ اور مدہوش انقلابیوں نے پری چہرہ، نازک بدن انگریز خواتین اور گہوارے میں کھیلتے ان کے ہنس مکھ معصوم بچوں کے قتلِ عام سے بھی دریغ نہیں کیا، یہاں تک کہ زمین ان گل اندامو‌ں کے خون سے رنگین ہو گئی۔ یہ بیان مبالغہ آمیز اور مغالطہ انگیز ہے اور ایک معتبر معاصر شہادت سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر لے یارڈ نے ہندوستانی سپاہیوں کی مبینہ غارت گری کی تحقیقات کرنے کی غرض سے خود انقلاب ہندوستان کے دنوں میں ہندوستان کا دورہ کیا اور واقعات کی اصلیت کا ٹھیک پتہ لگانے کی سعیِ بلیغ کی۔ مسٹر لے یارڈ نے اپنی تحقیق اور تفتیش کے نتائج کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"نہایت غور اور ہوشیاری کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد، اچھے سے اچھے اور سب سے زیادہ اہم اور معتبر لوگوں اور سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ذریعوں سے جو اطلاعیں مجھے ملی ہیں، اُن سے مجھے اس بات کا پورا یقین ہو گیا ہے کہ دلی، کانپور، جھانسی اور دوسرے مقامات پر جو بہت ہی خوفناک مظالم کہا جاتا ہے انگریز عورتوں اور بچوں پر کئے گئے، وہ سب کے سب بلا ایک بھی استثنا کے جھوٹے اور فرضی ہیں، اور کہنے والوں کے خود اپنے من سے گھڑے ہوئے ہیں، جس کے لئے انہیں شرم آنی چاہیئے۔"

[Mr. Layard, M.P., in : The Time, 25th August, 1858]

(بحوالہ: سن ستاون، ص ۱۴۱، ۲۴۹)

آرام نے غالب کو کتاب کے نکل جانے کی اطلاع دی۔ اس کے جواب میں غالب ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :

"دیکھو صاحب! تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔ بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے۔ جو زندہ ہیں، ان میں سیکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اُس میں مقدور نہیں۔ میں ایسا جانتا ہوں کہ یا تو صاحبانِ انگریز کی خریداری آئی ہو گی یا پنجاب کے ملک کو یہ کتابیں گئی ہوں گی پورب میں کم بکی ہوں گی۔"

کتاب کا ایڈیشن نکل جانے کی اطلاع ملنے پر غالب نے اس خط میں ہند کی صورتِ حال کے بارے میں جو غیر رسمی رائے دی ہے، وہ مطبوعہ اصل اور کُل کتاب پر بھاری ہے "دستنبو" میں انہوں نے ہندوستانیوں کو متّہم کیا ہے اور انگریز سپاہیوں کی معقولیت اور امن پسندی کا گُن ان لفظوں میں گایا ہے :

"خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ بے چارے (انگریز) عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لیے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے لشکر آراستہ کیا چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی تک کو زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے ضبط کیا (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

اس پس منظر میں مذکورہ خط، بنام شیونرائن کی خط کشیدہ عبارت کے وزن اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ :

"ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہو گیا۔ لاکھوں مر گئے، جو زندہ ہیں اُن میں سیکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں۔ جو زندہ ہے اس میں مقدور نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ "دستنبو" کی غرضِ تصنیف، قلعۂ معلی سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹانا اور تحریکِ آزادی کو "رستخیزِ بے جا" قرار دے کر انگریز حکامِ بااختیار کی نظر میں سرخرو ہونا تھا ——— اور سرخرو ہونا، محض سرخرو ہونے ہی کے لئے نہیں تھا، حکامِ وقت کو اپنی وفاداری کے یقین دلانے کی غایتِ اصلی، پنشن کے اجراء کی آرزو اور خطاب و خلعت پانے کی تمنا تھی۔ انگریز

عام کے لئے پرتکلف جلدوں کا اہتمام، ملکۂ معظمہ کے لئے "قصیدۂ برگزیدہ در تہنیت فتح ہند" کی تصنیف اس کے شہرت پا جانے کی آرزو و تدبیر، اور اُن تک کتاب پہنچانے کی عجلت اور عالی مقام صاحبانِ انگریز سے روابط بڑھانے اور راہ و رسم مراسلت کی فکرِ تجدید، اپنے مقصودِ اصلی کے لئے راہ ہموار کرنے ہی کی کڑیاں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے "غیر ملکی فاتحین سے جیسی سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا ہے، اگر ہم اس زمانے کے بے دریغ اور بہیمانہ قتل عام کو ذہن میں رکھیں تو اس کی نوعیت کا اندازہ کرنے میں دقت نہیں ہوگی[1]" یہ بھی صحیح ہے کہ اس انقلاب سے اُن کے تعلق یا اس سے اُن کی ہمدردی کا ذرا سا بھی شبہ انہیں دار و رسن کی آزمائش میں مبتلا کر سکتا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ غالب کی گزر اوقات کا وسیلہ پنشن (رہ گئی) تھی اور قبل اس کے کہ انگریز حاکموں کو اس کے دوبارہ اجراء کے لئے رضامند کیا جائے اس کے لئے اپنے استحقاق (یعنی بے گناہی) کو ثابت کرنا ضروری تھا۔ (بلاشبہ) یہ بات ایک ایسے شخص کے لئے اور بھی ضروری تھی جس کا تعلق اُمراء سے رہا ہو، اور جو دہلی کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کا اُستاد، درباری اور دوست رہا ہو[2]۔ یہی ہوا بھی، کہ غالب نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور پنشن کے لئے اپنا حقاق جتلانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہر عام آدمی، ان حالات میں یہی کرتا، غالب سے ہمیں روش اس کی توقع تھی، وہ پوری نہیں ہوئی "صورتِ حال جیسی بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب حالات غالب کے لئے ناسازگار ہوئے تو انہوں نے بھی اپنے بہت سے دوسرے احباب کی طرح ذاتی مدافعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دی[3]"۔

ذاتی تحفظ اور فروغ مراتب کی غرض سے لکھی گئی، اس کتاب کے مندرجات کو ہر چند "حقیقتِ واقعی" کے بمنزلہ نہیں سمجھا جا سکتا، اس سرگزشت کی تسوید و تحریر خاص مصلحتوں کے تابع رہی ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر محمد اشرف کے بقول:

> "یہ بات یقینی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے ہر حساس طالب علم کے لئے یہ کتاب ایک قابلِ قدر دستاویز ہے۔"
> (اُردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۲)

غالب نے "دستنبو" کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا اور بنایا، گو اس سے اُنہوں

---

[1] تا [3] ڈاکٹر محمد اشرف، اردوئے معلیٰ، دہلی، فروری ۱۹۶۱ء ص ۱۱۰

نے جیسی توقعات وابستہ کر لی تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں۔ بایں ہمہ کتاب کی یہ اہمیت بھی مُسلّم ہے کہ اس سے غالب کے کچھ سوانح پر روشنی پڑتی ہے اور بالخصوص اُن کے اُفتادِ مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

O

"دستنبو" کا دوسرا ایڈیشن سات برس بعد ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بھی کچھ خاص مُحرّکات تھے۔ "دستنبو" (نومبر ۱۸۵۸ء) کی اشاعت کو غالب نے اپنے لیے بہت سے مقاصد و مطالب کے حصول کا ذریعہ جانا تھا، لیکن اس سے انہیں کوئی فوری فائدہ نہیں ہوا جیسا کہ مالک رام نے لکھا ہے:

"مزید خطاب وخلعت تو درکنار، پہلا دربار، خلعت اور پنشن بھی جاری نہ ہوئے اور اگلے تین برس انہیں واگزاشت کرانے کی دوڑ دھوپ میں گزر گئے۔ آخر جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار وخلعت جاری ہو گئے تو پھر اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا۔ اس پر انھوں نے ۱۸۶۵ء کے آغاز میں دوبارہ درخواست دی کہ:

۱۔ مجھے ملکہ عالیہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے۔

۲۔ دربار میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے۔

۳۔ میری کتاب "دستنبو" حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے۔

اس پر گورنر جنرل نے لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سے ان کے بارے میں رپورٹ طلب کی۔ چیف سکتر گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکہ معظمہ کا تو نہیں، لیکن انہیں وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدے کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو۔ ہاں، سالانہ خلعت ضرور دیا جائے اور اگر سال کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب پر وہ قصیدہ پیش کریں تو بے شک خلعت دیا جا سکتا ہے۔ اس سے میرزا غالب کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اور علوم مشرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی، جو اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں ان کے رویے کی تفتیش کی جائے، نیز ان سے "دستنبو" کا ایک نسخہ طلب کر کے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب میرزا سے "دستنبو" کا نسخہ طلب کیا گیا اس وقت وہ رامپور میں تھے۔"

(ذکرِ غالب، طبع چہارم، صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲)

میرزا غالب رامپور میں نواب کلب علی خان کی تخت نشینی کے "جشن جمشیدی" سے لطف اندوز

ہو رہے تھے کہ حکومتِ پنجاب کی طرف سے انہیں "دستنبو" کا ایک نسخہ بغرضِ ملاحظۂ چیف سکرٹری کے پاس بھیجنے کا حکم ملا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رامپور میں میرزا کو غالباً پہلے ایڈیشن کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا، اگر ملا، تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے حکومت کو بھیجا جا سکے۔ چونکہ حکومت کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا اور میرزا کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، اس لئے انہوں نے پہلے ایڈیشن کا یہ نسخہ صحیح کر کے، اسے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ، بریلی کے مطبع میں، دوبارہ طبع کرایا اور دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ حکومتِ پنجاب کو بھیج دیا۔"

سے حکومت کے میر منشی نے "دستنبو" کو دیکھ کر رپورٹ کی کہ اس کتاب کی زبان پرانی پارسی ہے۔ قدرتی طور پر اس میں ایسے لفظ آ گئے ہیں جو اب بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر رائج نہ ہونے کی وجہ سے نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ اس صورت میں حکومت کا اسے اپنے خرچ پر شائع کرنا کچھ ضروری نہیں۔" (ذکرِ غالب، ایضاً، ص ۱۵۳، ۱۵۴)

"دستنبو" طبع دوم کے خاتمے کی عبارت یہ ہے:

"الحمدللہ کہ کتاب افادات انتساب بفرہنگ و دانش مرسوم و بدستنبو موسوم، پیکیدۂ قلم جادو رقم نجم الدولہ، دبیر الملک، اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، المتخلص بہ غالب عرف میرزا نوشہ مد اللہ ظلال فیوضہ باہتمام منشی پیندان لال صاحب در قالب طبع آمد، از نسخۂ ... صاحب نقل شد و تصحیح تمام در ۱۸۶۵ء حسن اختتام یافت۔"

لہ "لطیفہ یہ ہے کہ جن دنوں "دستنبو" کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق، آگرہ میں چھپ رہا تھا۔ چھاپے خانے کے مالک منشی شیو نرائن نے میرزا کو ایک خط لکھا، جس کے لفافے پر پتے میں "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا۔ اس پر میرزا نے فوراً تفتہ کو لکھا کہ خدا کے لئے کہیں "میرزا نوشہ" کے الفاظ کتاب پر بھی چھپ نہ جائیں! اس نالائق عرف کو نہ کلکتے کے سرکاری حلقوں میں کوئی جانتا ہے نہ ولایت میں، لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ دونوں جگہ کے حاکم اُن کے عرف سے خوب واقف تھے۔ بہرحال جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے، انہوں نے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں اس عرف کی موجودگی میں کوئی قباحت یا اعتراض نہیں دیکھا۔ غالباً اس لئے کہ ساتھ نام اور تخلص بھی موجود ہیں، یا شاید یہ سبب ہو کہ وہ اب اسے حکامِ بالا کو تحفے کے طور پر نہیں بھیج رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت ان سے استصواب کیا ہی نہ گیا ہو۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، حاشیہ ص ۱۸۹ و مابعد) بقیہ صفحہ ۷۳ پر

اس دوسرے ایڈیشن میں دو ایک جگہ لفظی تغیر ملتا ہے۔ ترتیب بھی بدل دی ہے۔ یعنی اب سے پہلے اصل کتاب ہے جو پندرہ سطری مسطر صفحہ ۵۶ پر ختم ہوئی ہے۔ اسی صفحے سے اُس قصیدے کا آغاز ہے (شمار یافت، روزگار یافت) جو طبع اول میں شروع میں رکھا گیا تھا۔ یہ قصیدہ صفحہ ۶۰ پر ختم ہوا ہے، اور اس کے بعد اُس قطعے کا اضافہ کیا گیا ہے جو "فتح دہلی" کی خوشی میں (روزگار چراغاں، اشتہار چراغاں) چراغاں کے موقع پر اُنھوں نے اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔ یہ ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ قدرتی طور پر اس سے طبع اول کی دونوں تاریخیں (قطعات تاریخ آغاز و انجام کتاب از مہر و تفتہ) حذف کر دی گئی ہیں، کہ اب ان کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ "دستنبو" کے صرف یہی مستقل ایڈیشن میرزا غالب کی زندگی میں شائع ہوئے"۔

(مالک رام، نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۲)

"دستنبو: طبع دوم کے تین برس بعد غالب کی زندگی میں "دستنبو" کی تیسری اشاعت جنوری ۱۸۶۸ء میں "کلیاتِ نثرِ غالب" کے ساتھ شائع ہوئی۔ "کلیات" علی الترتیب "پنج آہنگ"، "مہر نیمروز" اور "دستنبو" پر مشتمل ہے یعنی "دستنبو" کلیات کی نثر سوم کے طور پر شامل کتاب ہے اور صفحہ ۱۸۹ سے ۲۱۲ کو محیط ہے۔ "دستنبو" کا متن صفحہ ۱۹۰ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۰۷ پر ختم ہو جاتا ہے صفحہ ۲۰۷ ہی سے "قصیدہ در مدح ملکہ معظمہ انگلستان" چار کالم میں طبع ہوا ہے اور ۲۰۸ پر تمام ہوتا ہے صفحہ ۲۰۸ ہی کے آخر میں قطعہ در بیان روشنی دہلی درج ہے۔ صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۲ "دستنبو" کی فرہنگ ہے۔ "کلیات" میں "دستنبو" کا متن جوں کا توں ہے، لیکن مالک رام کے لفظوں میں "آخر میں مشکل الفاظ کے فرہنگ مرتب کر دا کے اضافہ کیے گئے ہیں جو یقینا مفید ہیں کیونکہ (اس کتاب) میں نادر و نامانوس الفاظ بہ کثرت استعمال ہوئے ہیں جو عام فہم نہیں تھے[1]۔"

پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں کیٹلاگ نمبر "۹۶، ۱۸۷ پنج" کے تحت "کلیاتِ نثرِ غالب" کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ڈاکٹر اظہر علی (ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، پی ایچ۔ ڈی، ۵۲ اے، ماڈل ٹاؤن لاہور) نے پنجاب پبلک لائبریری کو ہدیہ کیا ہے۔ کلیات کے اس قلمی نسخے میں بالترتیب "پنج آہنگ"،

(صفحہ ۷۲ سے آگے) یہی زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبارت صاحب مطبع کی صوابدید سے لکھ دی گئی اس کے لیے غالب سے استصواب نہیں کیا گیا، نام کے ساتھ خطابات کے اعلان سے اس قیاس کو تقویت پہنچتی ہے کہ ان کے نزدیک اس کتاب میں "اجرائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر" تھا۔

(بنام تفتہ، سوم ستمبر ۱۸۵۸ء)

[1] نگار، لکھنؤ، خاص نمبر جولائی ۱۹۶۰ء ص ۱۰۳

"مہرنیمروز" اور "دستنبو" شامل ہیں۔ خط بہت روشن ہے۔ کتابت بہت صاف صاف اور قلم سنبھال کر کی گئی ہے۔ اوّل تا آخر پندرہ سطری مسطر ہے۔ سرعنوان وغیرہ سُرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ "دستنبو" کے خاتمے پر قطعات آغاز و انجام (از مہر و تفتہ) کے بعد یہ فقرہ ہاتھ سنبھال کر صاف صاف لکھا گیا ہے:

"ایں رسالہ بہ قرۃ العین میر سرفراز حسین فرستادہ آمد"

اس فقرے کا قلم اور خط وہی ہے جس سے پوری "کلیات" لکھی گئی ہے۔ اس کے بعد خفی قلم سے پختہ و شکستہ رواں انداز میں ترقیمہ ہے:

"ایں رسالہ را بہ استمداد فرخندہ سیر، سعادت گستر، آسایش رواں، عزیز از جان اسوۂ آل نبی و اولادِ علی سیدہ مہدی حفظہ اللہ تعالیٰ فی الارض بتاریخ بست و ہشتم محرم سنہ ۱۲۸۰ ہجریہ قدسیہ (مطابق ۱۵ جولائی ۱۸۶۳ء) بمقام دہلی در حویلی مہابت خاں، خاکسار پریشان روزگار، گنہ گار، بارگاہ ستار و غفار، سید حسن موسوی مشہور میر حسن بہ وقت سہ پہر روز پنجشنبہ ختم نمود:

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زان کہ من بندۂ گنہ گارم

والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔"

ترقیمے کی اس عبارت سے، اس کے زمانۂ کتابت، کاتب اور نسخے کے مِلک کا پتہ چلتا ہے۔

"دستنبو" کی تیسری جداگانہ اور مستقل اشاعت (بمطابق طبع دوم) غالب کے انتقال کے دو برس بعد عمل میں آئی، در مطبع لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، واقع بریلی، ۱۸۷۱ء

انیسویں صدی کی بعض دیگر اشاعتیں در "کلیاتِ نثرِ غالب":

- نولکشور، لکھنؤ: ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۵ء
- نولکشور، کانپور: ۱۸۷۵ء، ۱۸۹۴ء، ۱۸۸۸ء

"رُستخیزِ بے جا":

۱۲۷۴ھ — ۱۸۵۷ء

اُردو ترجمہ: "دستنبو"

"خُدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو، اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ بے چاری عورتوں اور گہوارے میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی (کا بدلہ لینے) کے لئے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا، چوں کہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے، تو موقع تو اس کا تھا کہ (شہر پر) قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا (اگرچہ) اُن کے سینے میں غصّے کی آگ بھڑک رہی تھی، عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا۔"

——— غالب

"دستنبو" پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی قدیم میں تھی اور فارسی بھی وہ فارسی قدیم جس کا اُس زمانے میں پارس کے بلاد میں بھی نشان نہیں رہا تھا، ہندوستان کا تو کیا مذکور، غالب نے بطریق لزوم مالایلزم، اس کا التزام کیا تھا کہ بزبانِ فارسی قدیم "جو دساتیر کی زبان ہے، اُس میں یہ نسخہ لکھا جاوے اور سوائے اسماء کے کہ وہ نہیں بدلے جاتے، کوئی لغت عربی اس میں نہ آوے۔" اس لیے "دستنبو" کا اردو ترجمہ کرنا بڑا کٹھن اور دشوار گزار کام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی اشاعت اور غالب کے انتقال کے پچاس برس بعد تک کسی کو اس "جرِ ثقیل" کتاب کا اردو ترجمہ کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا اب سے نصف صدی پہلے خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر میرزا محمد یعقوب بیگ نامی ایم اے نے پہلی بار اس مشکل کام کو ہاتھ میں لیا۔ اُن کا ترجمہ ۱۹۲۰ء میں خواجہ حسن نظامی کی تالیف "میرزا غالب کا روزنامچہ" کے ساتھ شائع ہوا۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ :

"دستنبو" کا ترجمہ آسان نہ تھا، کیونکہ وہ نہایت سخت فارسی میں ہے۔ مگر نامی صاحب نے دو دن کے اندر اتنے مشکل کام کو آسان کر کے دے دیا۔" (روزنامچہ، طبع سوم، ص ۵۹)

•

"غالب کی سخت اور مشکل فارسی عبارت، جس کو عربی الفاظ سے وابستہ محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی، ایسا عام فہم اور صحیح ترجمہ کیا گیا ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔" (روزنامچہ، طبع سوم، ص ۲۷)

میرزا محمد یعقوب بیگ نامی کا ترجمہ، اس میں شبہ نہیں کہ بہت عمدہ ہے لیکن یہ پوری کتاب کا نہیں، اس کے صرف جستہ جستہ حصوں کا اردو ترجمہ ہے۔ اسی لیے یہ صرف گیارہ صفحات کو محیط ہے (طبع سوم، ص ۶۰-۷۱)

۱۹۶۱ء میں "دستنبو" کے دو الگ الگ تراجم سامنے آئے۔ ایک رسالہ "اردوئے معلّٰی" دہلی جلد دوم شمارہ ۲-۳ بابت فروری ۱۹۶۱ء (ص ۱۷۷-۲۳۲) میں شائع ہوا۔ اس پر مترجم کا نام درج نہیں، دوسرا ترجمہ محمود سعیدی کا ہے۔ یہ رسالہ "تحریک" دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۱ء (ص ۵۳-۷۳) میں چھپا۔ ۱۶ نومبر ۱۹۶۸ء سے ۸ جنوری ۱۹۶۹ء تک قسطوں میں "دستنبو" کا اردو ترجمہ روزنامہ "حریت" کراچی کے ادبی گزٹ میں بھی شائع ہوا۔ لیکن یہ رسائل اور اخبارات، اب عام دسترس سے باہر ہیں۔ اگلے صفحات میں "دستنبو" کے جس اردو ترجمے کا متن ضروری حواشی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ "اردوئے معلّٰی" سے ماخوذ ہے۔

بنام خداوند پیروزگر　　مہ و مہر ساز و روز و شب گر

"میں اس کتاب کا آغاز کرتا ہوں اس خدا کے نام سے جو طاقت بخشنے والا ہے جو چاند، سورج اور دن، رات کا خالق ہے۔"

عظیم طاقت کا مالک ہے وہ شہنشاہ جس نے نو آسمانوں کو بلند کیا اور سات ستاروں کو روشنی عطا کی۔ بڑا صاحب علم ہے وہ خدا جس نے جسم کو روح سے سرفراز کیا اور انسان کو حکمت و انصاف (کی دولت) بخشی۔ جس نے مادے اور وسائل کی مدد کے بغیر (سات (زمینوں) اور نو (آسمانوں) کو پیدا کیا۔ مشکل اور آسان کام کا بن جانا (اس سلسلے میں راستے کی) معمولی یا غیر معمولی رکاوٹوں کا دور ہونا، (ان سب امور کو) ان کی رفتار و اثرات سے متعلق کیا۔

(خدا نے) ان ضابطوں کو اس طرح مرتب نہیں کیا کہ یہ اجرام جو باہم متضاد ہیں (مختلف صفات رکھتے ہیں) ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں، اور (کبھی) ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، طاقت کے باوجود فرماں برداری نہ کریں اور قوت کارفرمائی اور صلاحیت تاثیر کے باوصف فرمان (قدرت) کے تابع نہ ہوں۔

"تم آسمانوں اور ستاروں کے راز (جاننے) کا کیا دعویٰ کرتے ہو۔ تم تو ابھی تک چت اور پٹ کے فرق سے واقف نہیں ہو۔ ستاروں کی پرستش نہ کرو (ان کو دنیا کے کاموں میں مطلق صاحب اختیار نہ مانو) کیونکہ ایک آفتاب (خدا) بھی موجود ہے۔ جس کی روشنی (کائنات کی تمام) ظاہر و پوشیدہ چیزوں کو حلقے میں لئے ہوئے ہے۔"

اگر زہرہ و مشتری میں (سعد ہونے کے لحاظ سے) فائدہ پہنچانے کی کچھ صلاحیت ہے (تو ہو)

اور زحل و مریخ میں (نحس ہونے کے اعتبار سے) نقصان رسانی کی خاصیت ہے تو ہوا کرے۔ جو لوگ واقفِ حقیقت ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نحوست و برکت، اور مسرت و غم، کا سرچشمہ کہاں ہے۔ ستارے ایک عادل شہنشاہ کے ملازم ہیں (اس) عدالت کے پیا ہی کبھی حلقۂ انصاف سے قدم باہر نہیں نکالتے ہیں۔ مل جل کر کام کرنے اور کارسازی (تعمیلِ حکم) کے علاوہ ان کو کسی چیز سے تعلق نہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے سخت گیری کے (وسیلے سے) اُلجھے ہوئے کاموں کو سُلجھانا چاہا، یا کسی نے نرمی کی (ذریعے) سے ہنگامۂ (زندگی) کی رونق افزائی کی تو یہ سب (زندگی کو) بنانے سنوارنے، (اور مشکلوں کو حل کرنے) کے مختلف انداز ہیں، ظلم یا بے نیازی نہیں :

"مُغنّی ساز کے تاروں پر مضراب سے ضرب لگاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے اس کا مقصد کیا ہوتا ہے

مسرتیں مصیبتوں کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ دھوبی غصے میں آ کر کپڑے کو پتھر پر نہیں مارتا۔"

دَرحقیقت کسی چیز کا فنا ہونا کسی دوسری چیز کے وجود کا سبب بنتا ہے۔

حقیقتاً آرام و تکلیف اور بلندی و پستی ساری چیزیں (خدا کی طرف سے) انسان کو ملتی ہیں۔ اس لئے وہ سب فائدے اور بہبودی کا وسیلہ بن جاتی ہیں اور ان سے مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ دولت مند کسی محتاج کو چند پیسے دے یا ہزاروں روپے، ریشم کے تھان عطا کرے یا کمبل (ہر صورت میں) سخاوت اور درویش پروری ہے۔ قدرت کے عطیات کو اچھائی برائی کے خانوں میں تقسیم کرنا یا کمی بیشی (کا الزام رکھنا) کج خیالی و کم فہمی ہے۔

یہ دنیا کی بے حقیقت چیزیں جو (قضا کے طاقت ور تھپیڑوں کے) سامنے ہیچ ہیں، کیا ان کے لئے یہ بخشش (خداوندی) کچھ کم ہے کہ وہ موجود ہیں۔

لیکن یہ (دقیق) باتیں کم نظر اور کم معرفت لوگوں کی رسائیِ ذہن سے باہر ہیں اور اظہار بیان کی وہ طاقت بھی ختم ہو گئی۔ مجبوراً میں چند سیڑھیاں نیچے اترتا ہوں (آسان اندازِ بیان اختیار کرتا ہوں اور) انہیں کہی ہوئی باتوں کو صاف اور سادہ انداز میں کہتا ہوں۔ آسمان کی گردش چکی کی رفتار کی مانند ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ چکی کو چلانے والا ضرور ہوتا ہے۔ پھر تم یہ کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ آسمان کو گردش میں رکھنے والا بھی کوئی ہے۔ آسمان کے چرخے میں ستاروں کی صلاحیتِ نفع رسانی و اذیت دہی کے تاروں سے بنی ہوئی پونی لگی ہے، جس سے چند پردے تیار کر کے اہلِ دنیا کی نگاہوں کے سامنے ڈال دیئے گئے ہیں۔ صاحبانِ معرفت اور واقفانِ اسرار ان پردوں کے باوجود دیکھ لیتے ہیں کہ ہر کام کا کرنے والا خدا ہی ہے۔

"جب یہ مسلّم ہے کہ آسمان کی گردش حکمِ خدا کے تابع ہے تو پھر آسمان جو کچھ دے، ہم اس کو ظلم کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

سبحان اللہ! کتنا عظیم ہے وہ خدا جو وجود عطا کرتا ہے اور عدم کو ختم کرتا ہے جو ظلم کو ختم کرنے والا اور انصاف کی روشنی کو پھیلانے والا ہے۔ وہ انصاف (کی طاقت) سے طاقتوروں کا زور گھٹا دیتا ہے اور اپنے کرم سے کمزوروں کو طاقت بخشتا ہے۔ ابابیل کے کنکروں کی ضرب سے فیل سوار خودسروں کا خاک میں مل جانا، یا ایک مچھر کا نمرود کو موت کے بستر پر سُلا دینا کیا تھا؟ یقیناً یہ وہ نشانیاں ہیں جن سے اس کی (بے پناہ) قوت و قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ مجھ کو بتاؤ کہ یہ دو مختلف قسم کی تباہیاں جو مختلف زمانوں میں نازل ہوئیں، یہ کس ستارے کی نگاہِ ستم کا کرشمہ تھیں۔

"ضحاک، جمشید سے تخت و تاج چھین لیتا ہے۔ سکندر، دارا کا سینہ چاک کر دیتا ہے۔ عفریت، حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ سے انگوٹھی اڑا لے جاتا ہے۔ جو دیو اور پریوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ تم جزا و سزا کے اسرار سے واقف نہیں ہو، بس آسمانوں اور ستاروں کو ہر چیز کا ذمّے دار سمجھتے ہو۔"

خُدا جس طرح کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ اس طرح ہر موجود کو فنا بھی کر سکتا ہے وہ خالق جس نے ایک لفظ "کُن" سے سارے عالم کو پیدا کیا اگر وہ اس عالم کو فنا کر دے تو کس کی مجال ہے کہ چوں و چرا کر سکے۔

O

اِس زمانے میں ہر راگ کا آہنگ اور ہر چیز کا قاعدہ ہی بدل گیا۔ سپاہی سردار سے منحرف ہو گئے۔ سخن طرازی سے کیا فائدہ، کہنا چاہیئے کہ زمانہ ہی بدل گیا۔ منجمین کا خیال ہے کہ جس زمانے میں ایران کے آخری شہنشاہ یزدجرد کی محفلِ عیش عربوں کے حملوں سے درہم برہم ہو گئی تھی، اُس وقت زحل و مریخ دونوں برج سرطان میں جمع تھے۔ آج کل بھی برج سرطان، زحل و مریخ کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ بغاوت، لڑائی، ظلم، خون ریزی اور ذلت اسی (قرانِ نحس کے) اثرات ہیں (لیکن) جو لوگ شناسائے حقیقت ہیں، وہ اس بات کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ ایران پر عرب کا حملہ (بالکل دوسری چیز تھی، وہ) تو ایک ملک پر دوسرے ملک کے لوگوں کی فوج کشی تھی۔ لیکن یہاں تو فوج نے اپنے سرداروں سے بغاوت کی ہے۔ ایران کی قدیم داستانوں سے ان دو لڑائیوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے ایران پر (عرب کا) حملہ مذہبی بنیاد پر تھا۔ ایران جو علم و حکمت کے لحاظ سے ویران ہو چکا تھا۔ ایک نئے مذہب کی برکتوں سے معمور ہو گیا، اور اس کی بدولت آگ کی (پرستش اور) غلامی سے

نجات پائی۔ لیکن (ہندوستان میں) جہاں سوال صرف قانون کا ہے، ہندوستان والے کس نئے آئین کی حفاظت کا سہارا لے کر (اپنے اس فعل پر) خوشی کا اظہار کر سکتے ہیں؟

اہلِ ایران نے آتش پرستی سے منہ موڑ کر خدا پرستی کا راستہ دیکھا۔ لیکن ہندوستان والے، منصف حاکموں (انگریزوں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر درندہ صفت انسانوں کے دام میں گرفتار ہو گئے۔ تم نہیں دیکھتے ہو کہ دامن ددام اور دادو ددمیں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے علاوہ کسی دوسری حکومت میں انصاف کی امید رکھنا بالکل نادانی ہے۔ عربوں کے تازیانے سے جو زخم لگے تھے، وہ مبارک مذہب (اسلام) ان زخموں کا مرہم بن گیا تھا۔ اگر ان مصیبتوں کے بعد زمانہ امن وراحت کی دولت بخشتا تو مصیبت زدہ غم وآلام کو بھول سکتے تھے۔ اگر کسی واقفِ راز وصاحبِ نظر کے خیال میں اس قیامت کے بعد کوئی راحت ملنے والی ہو تو بتائے اور میرے غمگیں اور خوف زدہ دل کو تسکین بخش کر ممنون کرے (امن وانتظام کے ذمہ دار) ملازمین، حاکموں سے بغاوت کریں۔ سپاہی افسروں کو قتل کریں اور خوشیاں منائیں اور ان کو ذرا بھی پشیمانی نہ ہو۔

اُسے واقفانِ اسرار، عارفانِ سود وزیاں یہ سارا ہنگامہ محشر کا قہر ہے۔ ایران کی وہ جنگ اس قدر مایوس کن اور تباہ کار نہیں تھی:

"ساز سے پریشان نغمے اس لئے بلند ہو رہے ہیں کہ عالمِ اضطراب میں مضراب سے تاروں کو بے طرح چھیڑ رہا ہوں۔"

میں اس قدر نافہم نہیں ہوں کہ ستاروں کو روشن ہونے کے باوجود بے نور کہہ دوں۔ آسمان کو عظیم وبلند ہونے کے باوصف بے سروسامان سمجھوں، مخلوقِ آسمانی کی کارگزاریوں کو جھوٹ سمجھوں۔ یا ان دو منحوس ستاروں (زحل ومریخ) کے ایک بُرج میں جمع ہونے سے آج بھی انہیں پُرآلام حالات کی توقع کروں جو آپ سے ایک ہزار سال پہلے (جنگِ عرب وایران کے زمانے میں) واقع ہوئے تھے۔

میں جو زمانے کے ہاتھوں ناقابلِ علاج مصیبتوں میں گرفتار ہوں، مناسب سمجھتا ہوں کہ اس زمین پر بسنے والے، جنہوں نے برجِ سرطان کو نہیں دیکھا ہے اور جو زحل ومریخ کے نام ہی سے واقف ہیں، ناشنیدہ اور ان دیکھی باتوں میں نہ اُلجھیں بلکہ یہ سمجھ لیں کہ زمانے نے جس کے سینے میں ماضی ومستقبل کے راز محفوظ ہیں اور اچھے لوگوں کے کام کو بگاڑنا اس کی پرانی عادت ہے، اس امر کو روا نہ رکھا کہ غیر فوج کی دستبرد سے دانایانِ فرنگ کو نقصان پہنچائے۔ بلکہ اس نے اس گروہ (انگریز) پر آسی کی ہر جانب سے آنے والی افواج کو مسلط کر دیا۔

اس کتاب کے پڑھنے والے یہ سمجھ لیں کہ میں نے جس کے قلم کی جنبش سے کاغذ پہ (الفاظ کے) موتی بکھر جاتے ہیں، انگریزی حکومت کے نان و نمک سے پرورش پائی ہے اور بچپن سے ان فاتحین عالم کے دسترخوان کا ریزہ چین ہوں۔ سات آٹھ سال[1] ہوئے کہ بادشاہِ دہلی نے مجھ کو بلایا اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھوں جس کے عوض ۶۰۰ روپیہ سالانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ میں نے اس خدمت کو قبول کر لیا اور کام میں مشغول ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے اُستاد کا انتقال[2] ہو گیا اور اصلاحِ شعر کا کام بھی مجھ سے متعلق کر دیا گیا۔

میں بوڑھا اور کمزور تھا۔ نیز گوشۂ تنہائی میں بیٹھے رہنے اور آرام کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطرِ حاضرین ہو جاتا تھا کوئی بات کر رہا ہے اور میں اس کے ہونٹوں کی جنبش پر نظر جمائے ہوئے ہوں، مجبوراً ہفتے میں ایک دو بار قلعے میں جاتا تھا[3]۔ اگر بادشاہ محل سے برآمد ہوتے تھے تو کچھ دیر حاضرِ خدمت رہتا تھا ورنہ دیوانِ خاص میں کچھ دیر بیٹھ کر چلا آتا تھا۔

---

[1] قلعۂ معلیٰ کی ملازمت۔ ۱۸۵۰ء کا واقعہ ہے۔ غالب ۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ (مطابق ۴ جولائی ۱۸۵۰ء) جمعرات کے دن بہادر شاہ ظفر کے حضور پیش ہوئے۔ خطاب و خلعت پایا اور تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے۔ اخبار کوہ نور، لاہور، ۱۵ جولائی ۱۸۵۰ء کی اشاعت (ص ۲۶۷) میں اس تقرر پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔

[2] "افسوس، صد افسوس کہ شہنشاہِ ملکِ سخن دری، خسروِ اقلیمِ معنی گستری ملک الشعرا خاقانیٔ ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اُستادِ حضور والا نے شب ۲۳ صفر شبِ آخر چہار شنبہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۸۵۴ء عالمِ فانی سے بسوئے عالمِ جاودانی رحلت کی۔" (تتمہ دہلی اُردو اخبار۔ بہ تاریخ ۱۹ نومبر ۱۸۵۴ء مطابق ۲۷ صفر المظفر ۱۲۷۱ھ)

[3] قلعے سے اپنے تعلق کی نوعیت کو سرسری بتانا محض اپنی مدافعت میں ہے، ورنہ انہیں حضورِ شاہ تقربِ ہر روزہ کی عزت حاصل تھی اور ان کی توقیر قلعے کے ممتاز ترین عہدوں پر فائز اصحاب سے کسی طرح کم نہیں تھی:

"کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے تو جانتے، ہر روز صبح کو قلعہ جانا، دوپہر کو آنا، بعد کھانا کھانے کے حضرت (بہادر شاہ) کے مسودوں کا درست کرنا۔" (بنام قدر بلگرامی، ماقبل ۱۸۵۷ء)

"بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے بخشی، ناظر، حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں۔" (بنام مجروح، ۶ اپریل ۱۸۶۰ء)

"میرزا غالب کے کلیاتِ فارسی کو دیکھا جائے تو بہادر شاہ کے متعلق ۱۵ قصائد مدحیہ، دو مدحیہ مثنویاں اور ایک ترجیع بند موجود ہے۔ اُردو قصیدے یا قطعے ان کے علاوہ ہیں۔"

اس مدت میں جتنا کام مکمل ہو جاتا، اس کو اپنے ساتھ لیے جاتا تھا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا تھا۔ یہ تھا میرا تعلق اور میرا کام۔ لیکن یہ تیز رفتار آسمان اس خیال میں تھا کہ ایک نئے انقلاب کا خاکہ مرتب کرے اور میرے اس سکون و آرام کو جس میں آسائش و فراغت کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھا، تباہ کر دے:

"یہ آسمان ایسا ظالم ہے کہ دشمن ہو یا دوست ہر ایک اس کی تیغِ بے پروائی سے زخمی رہتا ہے۔"

اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایتِ تخرجہ "رستخیزِ بے جا" ہے ـــــ اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان المبارک ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اس دن جو بہت منحوس تھا، میرٹھ کی فوج کے کچھ بدنصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے۔ نہایت ظالم و مفسد اور نمک حرامی کے سبب سے انگریزوں کے خون کے پیاسے، شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جوان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے بلکہ کچھ تعجب نہیں کہ پہلے ہی سے ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہو گئی ہو۔ شہر کی حفاظت اور ذمہ داری اور حق نمک ہر چیز کو بھول گئے۔ ان بن بلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہیں، دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دوڑ پڑے۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابلِ احترام (انگریزوں) کے مکانات دیکھے، جب تک ان افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا، اُدھر سے رُخ نہیں پھیرا۔

کچھ مسکین گوشہ نشین جن کو انگریزی حکومت کی مہربانی سے کچھ نان و نمک میسر تھا، شہر کے مختلف علاقوں میں ایک دوسرے سے دور زندگی کے دن گزار رہے تھے (ایسے مسکین و صلح پسند) جو تیر و تبر کے فرق سے ناواقف تھے اور اندھیری راتوں میں چوروں کے شور و غل سے ڈر جاتے تھے، جن کے ہاتھ تیر و تلوار سے خالی تھے۔ سچ پوچھو تو ایسے لوگ ہر گلی کوچے اور شہر کے ہر حصے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو لڑائی کے ارادے سے کمر کس کر تیار ہو سکیں۔ اس کے باوجود (کہ ایسے صلح پسند و خیر خواہ شہر کے ہر حصے اور ہر گلی کوچے میں تھے) اس وجہ سے کہ تیز بہنے والے پانی کو خس و خاشاک سے نہیں روکا جا سکتا، اپنے آپ کو مجبور سمجھ کر ہر شخص غمگین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا۔

انہیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا چاہتا تھا کہ کچھ معلوم کروں کہ اتنے میں شور مچ گیا کہ اندرونِ قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل

کر دیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین ہر طرف گل اندامون (انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہاروں کا مدفن بن گیا۔

افسوس وہ پیکرِ علم و حکمت، انصاف سکھانے والے خوش اخلاق و نیک نام حاکم! اور صد افسوس وہ پری چہرہ نازک بدن خاتونیں جن کے چہرے چاند کی طرح چمکتے تھے اور جن کے بدن کچی چاندی کی طرح دمکتے تھے! حیف وہ بچے جنہوں نے ابھی دنیا کو (اچھی طرح) دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے ہنس مکھ چہرے گلاب و لالہ کے پھولوں کو شرماتے تھے اور جن کی خوش رفتاری کے سامنے ہرن اور کبک کی رفتار بدنما معلوم ہوتی تھی، یہ سب ایک دم قتل و خون کے بھنور میں پھنس کر (بحرِ فنا میں) ڈوب گئے۔

(فنا کی) چنگاریاں برسانے والی وہ موت، شعلے جس کا سرمایہ ہیں، جس کے ہاتھوں لوگ غم زدہ رہتے ہیں اور ماتمی لباس پہننے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر ان مقتولین کے سرہانے آہ و زاری کرے اور اس غم میں سیاہ پوش ہو جائے تو روا ہے۔ اگر آسمان (اس غم میں) غبار کی طرح منتشر ہو جائے اور زمین گرد باد کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے۔

اے موسم بہار! بسمل کی طرح خاک و خون میں مل جا،
اے زمانے! اندھیری رات کی طرح تاریک ہو جا،
اے آفتاب (اس غم میں) اپنے رخساروں کو (پیٹ کر) نیلا کر لے،
اور اے چاند (غمگین) زمانے کے دل کا داغ بن جا۔

خدا خدا کر کے وہ منحوس دن ختم ہوا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ ان سیاہ باطنوں اور بے رحم قاتلوں نے شہر میں جا بجا پڑاؤ ڈالا۔ اندرونِ قلعہ شاہی باغ کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور نشیمنِ سلطانی کو خواب گاہ۔ رفتہ رفتہ دور دور کے شہروں سے خبریں آئیں کہ مختلف فوجوں کے باغیوں نے ہر چھاؤنی میں افسروں کو قتل کر دیا ہے۔ (اور نمک حراموں نے کھلم کھلا بغاوت کا شور مچا رکھا ہے) گروہ کے گروہ خواہ سپاہی ہوں یا زمیندار، سب یک دل ہو گئے اور کسی طے شدہ پروگرام کے بغیر دور و نزدیک ہر جگہ ایک ہی کام کے لئے کمربستہ ہو گئے اور پھر کیسی مضبوطی سے کمریں کسی تھیں کہ صرف اس دریائے خون کی موجیں ہی ان کو کھول سکتی تھیں جو کمروں سے گذر جائے۔ (مختلف مقامات کے لوگ کسی قرارداد کے بغیر جس طرح ایک ہی کام یعنی قتل و خون میں لگ گئے تھے اس سے) ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس طرح جھاڑو کی بہت سی سینکوں کو ایک ہی بند سے باندھا جاتا ہے ہو اسی طرح گنتی شمار سے باہر ان لٹنے والوں کی

کمریں بھی ایک ہی "کمربند" سے بندھی ہوئی ہیں۔

بے شک ہندوستان کو آرام و آسائش سے اس حد تک خالی کرنے کے لئے کہ اگر ان چیزوں کو ڈھونڈا جائے تو ایک گھاس کے تنکے کے برابر بھی نشان نہ ملے، ایسی ہی جھاڑو کی ضرورت تھی۔ بہت سے لشکر سرداروں کے بغیر تیار ہو گئے۔ بہت سی فوجیں افسروں کے بغیر لڑائی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئیں توپیں، گولہ بارود، چھرے، غرض سارا سامان انگریزوں سے حاصل کیا۔ لڑائی کے سارے طریقے انگریزوں سے سیکھے اور انہیں سکھانے والوں اور مالکوں سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔

دل، لوہے یا پتھر کا ٹکڑا نہیں ہے، کیسے نہ بھر آئے؟ آنکھیں رخنۂ دیوار نہیں ہیں کہ آنسو نہ بہائیں۔ حکمرانوں کی موت کا غم منانا چاہیئے اور ہندوستان کی ویرانی پر رونا چاہیئے۔ شہر حاکموں سے خالی اور بندہ ہائے بے خداوند سے بھرا ہوا۔ جیسے باغ، باغبان سے خالی اور درختان بے ثمر سے پُر ہو۔ لٹیرے ہر قسم کی پابندیوں سے اور سوداگر محصول ادا کرنے کی ذمہ داریوں سے آزاد۔ گھر ویرانے معلوم ہوتے ہیں اور مکانات (لوٹ مار کرنے والوں کے لئے) "خوانِ مفت" کا حکم رکھتے ہیں۔ جو لوگ گمنامی کے گوشوں میں چھپے ہوئے تھے، وہ گروہ در گروہ خنجر بکف اپنی آرائش اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نہاد لوگ گھر سے بازار تک آتے ہوئے راستے میں بیسیوں جگہ عاجزی اور مغلوبیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ لٹیرے دن میں دلیری کے ساتھ لوٹ مار میں مصروف ہیں اور رات میں ریشمی بستروں پر محوِ خواب۔

بڑے بڑے عالی خاندان لوگوں کے گھروں میں چراغ جلانے کے لئے تیل نہیں۔ اندھیری رات میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے بجلی چمکنے کے منتظر رہتے ہیں کہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہوا ہے اور پیالہ کدھر ہے۔

(زمانے کی اس) بے نیازی و بے امتیازی کو کیا کہوں کہ وہ کم رتبہ لوگ، جو سارا دن مٹی بیچنے کے لئے زمین کھودتے تھے، اُن کو مٹی میں سونے کے ٹکڑے مل گئے اور جن لوگوں کی محفل میں رات میں آتشِ گل سے چراغ روشن رہتے تھے، اندھیرے گھروں میں ناکامی و نامرادی کے غم میں مبتلا ہیں۔

کوتوالِ شہر کی زن و دختر کے علاوہ ساری نازنینانِ شہر کا زیور بزدل اور سیہ کار رہزنوں کے قبضے میں ہے (زیور و آرائش سے معرّا ہونے کے بعد) ان نازنینوں میں جو ہلکا سا اندازِ ناز باقی رہا تھا، اس کو ان نو دولت گدازادوں نے چھین لیا کہ ان کی خودنمائی کے کام آئے جو محبت کرنے والے پہلے

لوگوں کے دماغوں میں غرور اس حد تک سما گیا ہے کہ اگر ان کی حرکات کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کچھ بگولے چکر کھاتے پھر رہے ہیں اور کچھ بلبلے ہر وقت اس طرح ناز و خود نمائی میں محو رہتے ہیں، گویا پانی کی سطح پر کچھ تنکے بہتے چلے جا رہے ہیں۔ بڑے بڑے عالموں اور نام وروں کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور جن لوگوں کے پاس نہ دولت تھی نہ عزت، وہ بے اندازہ زر و جواہر اور عزت و آبرو کے مالک ہیں، جس کا باپ گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا وہ ہوا کو اپنا خادم سمجھ رہا ہے، جس کی ماں پڑوسی کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی وہ آگ پر حکم چلانے کا مدعی ہے۔ یعنی، آگ اور ہوا پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور ہم ان پریشان حال لوگوں میں سے ہیں۔ جو صرف سکون و آسائش کے چند لمحوں اور انصاف کے خواہشمند ہیں:

" میرا درد بھرا دل تمہارے نزدیک ایک قصہ ہے اور بس۔ لیکن اس کو سن کر ستاروں کی آنکھوں سے اشکِ خون جاری ہو جائیں گے۔ "

ڈاک کا انتظام درہم برہم ہو گیا، جس کے سبب سے بہت سے کام رک گئے۔ ہرکاروں نے آنا جانا بند کر دیا۔ ڈاک میں پیام بجنسہ پہنچانے کی گنجائش نہیں ہوتی، ہاں خطوط کی آمد و رفت کا قاعدہ ہے۔ مگر اس محکمے کی ایک اور شاخ (ٹیلی گراف) ہے کہ نہ مضراب کی جنبش، بلکہ جنبش کی مضراب سے جو اس سے پیدا ہوتی ہے ہزاروں پیام (عبرس) اندر سے باہر نکلتے ہیں۔

(جو لوگ) مذہب اور قانون کے بے حد پابند ہیں، انصاف کو نظر انداز نہ کریں اور بتائیں کہ اس سارے انتظام کا درہم برہم ہو جانا، خدا کی بخشی ہوئی دولت کا لٹ جانا، ڈاک کا نظام درہم برہم ہو جانا اور دوستوں کے حالات معلوم نہ ہونا، کیا یہ ساری باتیں اس لائق نہیں کہ ان کا ماتم کیا جائے اور آنسو بہائے جائیں۔ بڑے بڑے بہادروں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ اپنے سایے سے ڈریں۔ سپاہی، بادشاہ اور درویش ہر ایک پر حکومت کرنے لگیں۔ کیا یہ صورتِ حال لائق افسوس نہیں؟ ان روح فرسا مصائب پر آنکھیں آنسو نہیں بہائیں گی؟ اور کیا اس نوحہ گری پر لعن طعن کرنا، اس ماتم سرائی پر طنز کرنا اور اس گریہ و زاری پر ہنسنا جائز ہے؟ اور کیا ان پُر آلام حالات سے اظہار بیزاری کو ضعفِ ایمان اور نادرستیِ مذہب سمجھا جائے گا؟

" میں شعر و سخن کے جواہر سے کیا دل لگاؤں جب کہ آہِ گرم سے میرے دل پر ہزاروں آبلے پڑ گئے ہیں میرا دل بجھ چکا ہے اور قویٰ اس حد تک جواب دے چکے ہیں کہ اب مجھ کو نہ سزا کا غم ہے نہ جزا کی خوشی "

اس سرگزشت پر مصیبت کا مارا ہوا یہ اسیرِ قیدِ بستر (تنہائی) اس رودادِ غم کو پھر شروع کرتا ہے جب پہلی بار وہ گمراہ جنگ جو آئے تو جو خزانہ وہ اپنے ساتھ لائے تھے، خزانے میں جمع کر دیا اور اپنے سر

شاہی آستانے پر جھکا دیے۔ جلد ہی زمانے نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ ہر طرف سے فوجیں جمع ہونا شروع ہو گئیں اور اس سرزمین (دہلی) کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ جب فوج کا انتظام نہ کر سکا، فوج نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بادشاہ مجبور ہو کر رہ گیا:

"فوج نے بادشاہ کو اپنے حلقے میں لے لیا جیسے چاند کو گہن لگ جائے۔ ماہِ نو گہن میں نہیں آتا۔ گہن تو چودھویں رات کے چاند کو لگتا ہے۔ بادشاہ اس چاند کی طرح تھا جس کو گہن لگ گیا ہو۔ وہ ماہِ کامل نہیں تھا۔"

میں نے اس بات کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ یہ بات بیان کرنے کے لائق تھی کہ یہ شہرت طلب جنگجو جس مقام سے چلے وہاں کے قید خانے کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ وہ پرانے قیدی جنہوں نے نئی نئی آزادی پائی تھی، شاہی دربار میں آئے، سجدہ کیا اور کسی علاقے کی صوبیداری چاہی آقاؤں سے بھاگے ہوئے غیر وفادار غلاموں نے آستانِ شاہی کو بوسہ دیا اور کسی سرسبز علاقے کی حکومت کے طلب گار ہوئے۔ کوئی نہیں کہتا ہے اور میں بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہر خواہشمند کو حاضر ہونے کی اجازت اور ہر پناہ مانگنے والے کو پناہ کیوں دے دی جاتی ہے؟ بس یہ زمانے کی بوالعجبی ہے۔

اب دہلی کے اندر اور باہر تقریباً پچاس ہزار سواروں اور پیادوں کی فوج پڑی ہوئی ہے صاحبانِ علم و دانش انگریزی حکام کے قبضے میں اس وسیع شہر کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ صرف شہر کے جانبِ مغرب ایک پہاڑی پر ان کا قبضہ ہے۔ یہ پہاڑی شہر سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے (انگریزوں نے) نہایت ہنرمندی سے اس جگہ پر مورچہ قائم کر کے ایک مضبوط قلعہ سا بنا لیا ہے اور اس کے چاروں طرف کئی اژدہا صفت، رعد خروش توپیں لگا دی ہیں اور استقلال کی مدد سے اس عالمِ پریشانی میں اطمینان (کی دولت) حاصل کر لی ہے۔

شہر کی فوج نے جو میگزین اسی شہر سے حاصل کیا تھا، اس میں سے چند توپیں شہر کی فصیل پر جما دی ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو جنگجو سرداروں کا حریف فرض کر لیا ہے۔ توپوں اور بندوقوں کے دھوئیں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے اور اس سے اولے برس رہے ہیں رات دن دونوں طرف سے گولہ باری ہوتی ہے، جیسے اوپر سے پتھر برس رہے ہوں۔ مئی جون کی گرمیاں ہیں۔ دھوپ کی تیزی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ آفتاب برج ثور و جوزا میں بے طرح آتش افروزی میں مشغول ہے۔ معلوم ہوتا ہے خود بھی اسی آگ میں بھنا جا رہا ہے۔ جو لوگ سرد و

ہوادار مکانوں میں آرام و آسائش کے ساتھ رہتے تھے، دن بھر دھوپ میں جلتے ہیں اور راتیں انہیں جلتے ہوئے پتھروں پر پیچ و تاب کے عالم میں بسر کرتے ہیں۔ اسفندیار اس میدانِ جنگ میں ہوتا تو دُمیں تنی کے باوصف اس کی ہمت دجوانمردی ہوا ہو جاتی۔ اگر رستم اس داستان کو سن لیتا تو جی چھوڑ دیتا (شہر کی فوج کے) مختلف مقامات سے آئے ہوئے سپاہی دن چڑھے شیر دل انگریزوں سے لڑنے کے لئے جاتے ہیں اور سورج ڈوبنے سے پہلے ہی واپس آجاتے ہیں۔ بیرونِ شہر کی داستانِ شب و روز تو یہ تھی۔ اندرونِ شہر (کیا ہو رہا تھا اس سلسلے میں) ایک دن کا قصہ سننے کے لائق ہے:

"میرے ساز کے تاروں میں وہ نغمے پنہاں ہیں جن سے چنگاریاں برستی ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ مغنی ان کی زد میں نہ آجائے۔ میری زبان پر وہ داستان ہے جس سے میرے دل پر خنجر چلنے لگتے ہیں۔"

ایک شخص جس کے دماغ میں فرمانروائی و تکبر کے خیالات بھرے ہوئے تھے، در پردہ اپنے آقا اور مُربّی کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ "اگر یہ واقف کار اور رازداں زندہ رہے گا تو میں نے جو خزانہ (ناجائز طریقوں سے) جمع کیا ہے۔ اس کا راز کھل جائے گا۔" ہمیشہ نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا تھا اور یہ بات مشہور[1] کر کے کہ حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے خیر خواہ اور طرفدار ہیں، فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے بھڑکاتا رہتا تھا۔

ایک دن کچھ لوگ (حکیم احسن اللہ خان کو) قتل کرنے کے لئے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعے میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند آشفتہ سر قلعے میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائی محبت و بندہ پروری سے (حکیم صاحب کو بچانے کے لئے) اپنے آپ کو ان پر گرا دیا، اس طرح حکیم صاحب[2] بچے۔

---

[1] غالب نے شیو نرائن کے نام ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ "یہ نسبت حکیم احسن اللہ کے جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط ہے۔" لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے بعض معاصر شہادتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ صحیح نہیں ہے کہ حکیم احسن اللہ خان کے خلاف بدگمانی بے اصل تھی۔"

(غالب اور ابوالکلام، ص ۱۶۵)

[2] حکیم احسن اللہ خان کے بارے میں سرسید احمد خان کا بیان ہے کہ حکیم صاحب کو کمال عزت و توقیر کے ساتھ جو پہلے والئ فیروز پور جھرکہ پھر والئ ججھر اور ازاں بعد محمد اکبر شاہ بادشاہِ دہلی کے معالج خاص رہے، رفتہ رفتہ بہادر شاہ ظفر کی طبیعت پر یہاں تک تصرف ہوا کہ:

"کوئی امر جزدی و کلی... بے مشورہ و صلاح اس صاحب تدبیر صائب (باقی اگلے صفحہ پر) ★

جان تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا تھا جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ نہیں ہو گیا (حکیم صاحب کا) گھر (جو خوبصورتی و آرائش میں) نگار خانہ چین کی طرح تھا لوٹ لیا گیا۔ ایوان کی چھت کو آگ لگا دی گئی۔ چھت کے شہتیر اور منقش تختے جل کر راکھ ہو گئے۔ دیواریں سیاہ پڑ گئیں۔ گویا وہ محل اس غم میں سیاہ پوش ہو گیا تھا۔

ﻠﮧ "یہاں (دہلی) کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی (ان میں سے ایک) حکیم احسن اللہ خاں، سو ان کا یہ حال ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہٰذا یہاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں۔"

(بنام شیو نرائن، ۱۲ر جون ۱۸۵۹ء)

"حکیم جی (احسن اللہ خاں) کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر جائیں۔"

(بنام: تفتہ، ۵ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات شہر ان کو مل گئے اور یہ حکم ہے کہ شہر سے باہر نہ جاؤ، دروازے سے باہر نہ نکلو، اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔"

(بنام: حسین مرزا، ۹ر نومبر ۱۸۵۹ء)

"حکیم صاحب پر سے وہ سپاہی جوان کے اوپر متعین تھا، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پر رہو مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔"

(بنام: غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

★ (ص۸۷ سے آگے) کے دقوع میں نہیں آ سکتا، وہ امر اگرچہ متعلق منصبِ وزارت ہی ہو لیکن سبحان اللہ اس حوصلہ فطرت عالی پر ناز کرنا چاہیئے کہ ہر چند ترقی مدارج یہاں تک ہے کہ فقیر و قطمیر قلعہ مبارک صرف اسی والا درجہ کی ذات پر موقوف اور مدارج جمیع امورِ سرکارِ بادشاہی کا اسی بلند اقتدار پر منحصر ہے، خلق کو اس مرتبہ پر وسیع کیا ہے کہ ہر ادنیٰ کی کارروائی میں وسعت سے زیادہ مصروف ہونا اور ہر صاحبِ غرض کے التماس کو بدل متوجہ ہو کر سماعت کرنا۔ اعالی شہر سے کم ہو گا کہ ان کو اپنا محسن نہ سمجھتا ہو۔"

(آثار الصنادید: طبع اول، مطبع سید الاخبار ۱۸۴۷-۴۸ء، باب چوتھا)

غالب نے بھی حکیم صاحب کو اپنا محسن بتایا ہے (بنام: تفتہ، ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۸ء) ایک دوسرے خط میں غالب نے حکیم احسن اللہ خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"پروردگار اس بزرگوار کو سلامت رکھے کہ قدر دانِ کمال، بلکہ حق تو یوں ہے کہ خیرِ محض ہے۔" (بنام: شفق، اکتوبر ۱۸۵۳ء)

"آسمان کی مہربانی سے دھوکا نہ کھانا۔ یہ بے وفا جس شخص کو آغوشِ محبت میں جگہ دیتا ہے، اس کو کشمکش و عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

بُرے سے بُرا غلام اپنے آقا سے اس طرح پیش نہیں آ سکتا بشرطیکہ وہ ولدالحیض نہ ہو۔ یہ خبیث، نمک حرام جس کے مُنہ پر چیچک کے داغ ہیں، بے حیائی کے سبب سے جس کی آنکھیں پھیل گئی ہیں اور دھانہ فراخ ہو گیا ہے، اپنے آپ کو زہرہ و مشتری کی طرح سمجھتا ہے۔ ہر طرف کولہے مٹکاتا ہوا، انداز دکھاتا ہوا گزرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش خرامی میں کبک و تدرو کو شرماتا ہے۔ میں نے اس کا نام اس لئے نہیں لکھا کہ وہ ایک گدازادہ گم نام ہے۔ میں اس پر لعنت بھیج کر جو داستان کہہ رہا تھا اس کو پھر شروع کرتا ہوں۔

فوجیں ہر طرف سے آ آ کر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا، اس وجہ سے دور دور کے سردارانِ فوج اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرخ آباد کے نامور (سردار) تفضل حسین خان نے جن کو کبھی بادشاہ سے علاقہ نیازمندی نہیں تھا، دور ہی سے آستانِ شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیازمندِ قدیم لکھا۔

خان بہادر خان نے جو گمراہ، شہرت طلب تھا اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا، ایک سو ایک اشرفیاں، نقرئی ساز و سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی میں بھیجا۔

چشم بد دور خورشید نشان نواب یوسف علی خان بہادر فرمان روائے رامپور نے جو اس علاقے میں باپ دادا کی جانشینی (کا حق ادا کر رہے) ہیں، اور انگریزی حکومت کے ساتھ ان کا رشتۂ دوستی اتنا مضبوط ہے کہ زمانہ ہزار برس میں بھی کسی طریقے سے اس کو نہیں توڑ سکتا، مجبوراً صرف زبانی پیام بھیج کر لوگوں کی زبان کو بند کیا۔

لکھنؤ میں جب فوج نے (انگریزوں سے) رشتۂ تعلق توڑ لیا، (بیش تر) انگریز (دشمنی کی) اس آگ سے بچ کر دوسرے مقامات پر اپنے متعلقین کے پاس چلے گئے، لیکن (فوج کے) چند سرداروں نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر بیلی گارد میں قیام کیا جو لکھنؤ کا ایک مشہور مقام ہے اور بہادری کے ساتھ دروازے بند کر لیے۔

شرف الدولہ نے جو بڑے واقف کار، اور معاملات کو سمجھنے والے تھے اور جو نوابانِ اودھ کے زمانے میں وزارت کے عہدے پر سرفراز تھے، اس کم تعداد لیکن باشان و شوکت گروہ (انگریز) کو نظر انداز کر کے واجد علی شاہ کے دس سالہ لڑکے کو تختِ حکومت پر بٹھال دیا اور اس کو شہنشاہِ ہندوستان کا وزیر، اور اپنے آپ کو پیش کار اور نائب وزیر فرض کر لیا۔ اس نامور شخص (شرف الدولہ) نے گویا ہما کو گرفتارِ دام کر لیا تھا۔ جب یہ سارا کام مکمل کر لیا، ایک منتخب شخص کو مناسب پیش کش کے ساتھ (دہلی) روانہ کر دیا۔ قاصد آیا۔ دو روز آرام کیا۔ پھر بارگاہِ شاہی میں حاضر ہوا۔ دو صبا رفتار گھوڑے، دو کوہِ صفت

ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک سنہری کلاہ جو رنگ برنگ کے نایاب موتیوں سے مزین تھی، پیش کی اور ایک جوڑ بازو بند جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے، ملکہ کی خدمت میں محل میں بھیجا۔

یہ ساری شان و شوکت روشنیٔ چراغ کی طرح (جلد ختم ہونے والی) تھی۔ گویا زمانے کی نظرِ بد اسی رونق کی منتظر تھی۔ حکومتِ اودھ کی اس پیش کش کے بعد آئینۂ سکندر اور جامِ جمشید کی ساری داستان ختم ہو گئی (باغی) فوج کے شور و غل سے نصیب کی آنکھیں کھلی ہی تھیں کہ پھر مُند گئیں۔ نہیں نہیں شہنشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ دُنیا والوں کی نگاہوں سے پنہاں ہو گیا؛

"جب قسمت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے تو تاج کی بھی کوئی قیمت نہیں رہتی۔ تم نہیں دیکھتے کہ تغیر کے خوف سے سورج آسمان پر کیسا کانپتا رہتا ہے[1]۔"

جس دن وہ سبز قدم قاصد آیا اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی۔ اُس کے کل کو پیر کے دن قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ کو پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے (انگریزوں) نے شان و شکوہ کے ساتھ کشمیری دروازے پر ایسا حملہ کیا کہ کالوں کی فوج کو بھاگتے ہی بنی۔

"مئی کے مہینے میں اگر انصاف دہلی سے اٹھ گیا تھا تو ستمبر میں ظلم و ستم کا دور ختم ہو گیا اور انصاف کا زمانہ واپس آگیا۔ چار مہینے چار دن کے بعد سورج آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔ دہلی دیوانوں سے خالی ہو گئی۔ عقل مند (انگریزوں) نے بہادری کے ساتھ اس پر قبضہ کر لیا۔"

اگرچہ ۱۱ مئی سے ۱۴ ستمبر تک ۴ مہینے ۴ دن کا وقفہ ہے لیکن اس بنا پر کہ پیر کے دن شہر (انگریزوں) کے ہاتھ سے نکلا تھا اور پیر کے دن ہی قبضے میں آیا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہر

---

[1] یہاں اس مضمون پر مشتمل رباعی غالب کے سہو سے رہ گئی تھی۔ غالب نے تفتہ کے نام ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء کے ایک خط کے ذریعے اسے یہاں بتاکید اضافہ کرایا۔ شیو نرائن کے نام ۳۱ اگست ۱۸۵۸ء کے خط میں بھی اس رباعی کو ضرور بالضرور درج کرا دینے کی ہدایت ملتی ہے۔

رباعی یہ ہے۔ ؎

جائیکہ ستارہ شوخ چشمی ورزد
افسر افسار و گرزن ارزن ارزد
خورشید ز اندیشۂ جا در گردش
بر چرخ نہ بینی کہ چسان می لرزد

کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں آجانا یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے۔ مختصر یہ کہ فاتحین نے لاستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحبِ عزت افراد عزت اور آبرو کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔

شہر میں بدباطن (باغیوں) کی جو فوج تھی، اس میں سے کچھ لوگوں نے بھاگ جانے کی ٹھان لی۔ اور کچھ لوگوں نے غرور میں آکر لڑنے کی تیاری کی۔ خبیث اور آوارہ لوگوں کا یہ گروہ شیر دل فاتحین سے اُلجھ پڑا۔ یہ لوگ اپنے خیال میں تو دشمنوں کو قتل کر رہے تھے، لیکن میرے خیال میں وہ شہر کی عزت و آبرو کو برباد کر رہے تھے۔

دو دن تک کشمیری دروازے سے لے کر چوک تک تمام راستے میدانِ جنگ بنے رہے۔ دہلی دروازہ، ترکمان دروازہ، اجمیری دروازہ یہ تینوں دروازے اس فوج کے قبضے میں رہ گئے۔ مجھ مردہ دل کا ماتم کدہ (مکان) وسطِ شہر میں کشمیری دروازے اور دہلی دروازے کے درمیان ہے اور میرے مکان سے ان دونوں دروازوں کا فاصلہ برابر ہے۔ اگرچہ گلی کا دروازہ بند کر لیا گیا تھا، لیکن ابھی اتنا حوصلہ باقی تھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلے جاتے تھے اور کھانے پینے کا سامان لے آتے تھے۔

میں نے ابھی کہا کہ غضب ناک شیر دل (انگریزوں) نے شہر میں داخل ہوتے ہی بے سروسامان لوگوں کو قتل کرنا اور مکانوں کو جلانا جائز سمجھا۔ ہاں، جس مقام کو لڑ کر فتح کرتے ہیں، لوگوں پر ایسی ہی سختیاں کی جاتی ہیں۔

اِس غصے اور دشمنی کو دیکھ کر لوگوں کے مُنہ فق ہو گئے۔ بے شمار مرد و عورتوں کے گروہ جن میں معمولی لوگ بھی تھے اور صاحبِ حیثیت بھی، ان تینوں دروازوں سے باہر نکل گئے۔ شہر کے باہر جو چھوٹی چھوٹی بستیاں اور مقبرے تھے ان میں پناہ گزیں ہو گئے، اس خیال سے کہ کسی مناسب وقت پر شہر میں واپس آجائیں گے یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔

لہ "انتخابِ غالب" (۱۸۶۵ء) میں، اسی بات کو بطور "لطیفہ" غالب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:
"۱۸۵۷ء میں جو میرٹھ سے باغی ترک سوار اور تلنگے دلی میں آئے اور انہوں نے شہر اور قلعے پر اپنا قبضہ کر لیا تو وہ مئی کے مہینے کی گیارہ تاریخ تھی اور روزِ دوشنبے کا دن تھا۔ قضارا جس دن ستمبر ۱۸۵۷ء میں دلی فتح ہوئی اور سرکش لوگ بھاگ گئے وہ بھی دوشنبے کا دن تھا۔ دو ایک دوستوں نے کہا کہ دیکھو کیا اتفاق ہے، دوشنبے کو دلی کا جانا اور پھر دوشنبے کو ہاتھ آنا۔ میں نے کہا کہ یہ ایک رمز ہے اس کو یوں تصور کرو کہ جس دن شکست کھائی اسی دن فتح پائی۔ یعنی دیر نہ لگی، ایک دن میں تدارک ہو گیا۔"

میرے دل پر خوف و دہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی[1]۔ میں نے کہا کہ میں گنہگار تو ہوں نہیں کہ سزا پاؤں۔ انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا ناساز گار نہیں ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور اِدھر اُدھر بھاگتا پھروں۔

(اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سرو سامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں (اس تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں؛

"میں بالکل مفلس اور بے سرو سامان ہوں، خداوندا! کب تک یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہوں گا کہ یہ جواہر (کلام) میری ہی کان کے ہیں"۔

ازل کا لکھا ہوا بدل نہیں سکتا۔ ازل میں قسمتیں لکھی جا چکی ہیں۔ ہر ایک کو نوشتۂ قسمت کے مطابق سرو سامان عطا کیا گیا ہے۔ مصیبتیں اور راحتیں اسی حکمِ ازل کا نتیجہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ بے دلی و بے جگری کو چھوڑ کر جس طرح بچے ہر تماشے کو خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں، ہر لمحہ بدلنے والے زمانے کی حیرت افزا نیرنگیوں کو اس بڑھاپے میں خوشی کے ساتھ دیکھتا رہوں۔

جمعہ کے دن محرم کی ۲۶ تھی اور ستمبر کی ۱۸ ار دن چڑھے دنیا کو خوشی بخشنے والا آفتاب عالم تاب برج سنبلہ کے ایک درجے میں پہنچ کر کسوف میں آگیا اور اہلِ عالم کی چشمِ جہاں بیں پر تاریکی نے ظلم ڈھایا گمراہ باغی اندرون و بیرونِ شہر سے خنزیروں کی طرح بھاگنے لگے اور فاتحین نے شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیا۔ کشت و خون اور پکڑ دھکڑ کی (آفت) اس گلی تک آگئی۔ خوف سے لوگوں کے دل دہل گئے۔

اس گلی میں صرف دس بارہ گھر ہیں اور راستہ ایک ہی طرف سے ہے (گلی اندر سے بند ہے) گلی میں کوئی کنواں نہیں ہے (اس گلی کے) زیادہ تر رہنے والے چلے گئے ہیں (اس طرح کہ) عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگائے ہوئے تھیں اور مردوں کے کاندھوں پر سامان کی گٹھڑیاں تھیں۔ کچھ لوگ باقی رہ گئے تھے۔ ہم سب نے مل کر گلی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پتھر چن دیے۔ گلی سربستہ تو تھی ہی، دربستہ بھی ہو گئی (ایک راستہ تھا وہ بھی بند ہو گیا)۔

"میری روح جسم سے زیادہ خستہ و درماندہ ہو تو تعجب کی بات نہیں، کیونکہ میرا دل قید خانے کے گوشے سے بھی زیادہ تنگ ہے"۔

---

[1] یہ بے خوفی، اطمینانِ قلب اور استقامت و جرأتِ کردار کا اظہار محض ملمع اور دکھاوا ہے۔ غالب کے خطوط، اس کی تردید کرتے ہیں اور ایک بالکل مختلف تصویر پیش کرتے ہیں۔

(اتفاقاً) اس مصیبت میں کام بننے کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ فلک مرتبہ مریخ حشم راجہ نندر سنگھ بہادر فرماں روائے پٹیالہ اس جنگ میں (انگریز) فاتحین کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے۔ راجہ کے چند ملازمین خاں جوان کی سرکار میں اونچے عہدوں پر ہیں اور شہر کے نامور اور قابلِ عزت لوگوں میں سے ہے (میری مراد ہے) حکیم محمود خاں، حکیم مرتضٰے خاں، حکیم غلام اللہ خاں (سے) جو حکیم شریف خاں جنت مکان کی اولاد میں ہیں، اس کوچے میں رہتے ہیں۔ دور تک ان کی دور دیہ عمارتیں چلی گئی ہیں ___

میں دس سال سے ان میں سے ایک صاحبِ جاہ و ثروت کا پڑوسی ہوں۔ ان تین حضرات میں سے اول الذکر (حکیم محمود خاں) متعلقین اور اہلِ خانہ کے ساتھ اپنے بزرگوں کی طرح باعزت زندگی بسر کرتے ہیں اور باقی دونوں حضرات پٹیالے میں راجہ کی مصاحبت میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی، راجہ نے آزراہِ بندہ پروری طاقت ور اور جنگجو (انگریزوں) سے طے کر لیا تھا کہ جب (شہر) فتح ہو گا، اس گلی کے دروازے پر محافظ مقرر کر دیے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی جن کو گورا کہتے ہیں، گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں[1]۔

اثنائے کلام میں کبھی کبھی (مجبوراً) چند دوسری باتوں کا تذکرہ بھی آجاتا ہے۔ ان ضمنی باتوں کے بعد (میں) پھر اصل موضوع پر آتا ہوں۔ سارے شہر میں ۱۵ ستمبر سے ہر گھر کا دروازہ بند ہے۔ دکان دار اور خریدار دونوں غائب ہیں۔ نہ گندم فروش ہے کہ گیہوں خریدیں، نہ دھوبی ہے کہ کپڑے دھلنے کو دیں۔ حجام کو کہاں ڈھونڈیں کہ سر کے بال تراشے اور مہتر کو کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں کہ صفائی کرے۔ بہر حال جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، ان پانچ مہینوں میں (گلی کے لوگ) باہر نکل کر پانی تو برابر لے آتے تھے۔ کبھی کبھی آٹا وغیرہ بھی مل جاتا تھا، لیکن اس کے بعد یہ صورتِ حال ختم ہو گئی (گلی کا) دروازہ پتھروں سے بند کر لیا گیا اور دلوں کے آئینے پر غم و الم کا غبار چھا گیا:

"کوششوں کے سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب مصیبتیں خون کو آگ کی طرح جلا رہی ہیں۔"

---

[1] "میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا، دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والئ پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبانِ عالیشان (انگریز حکام) سے عہد لیا تھا کہ بروقتِ غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ صاحب کے سپاہی یہاں آبیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ
سو[illegible] کہ ... اور شہر ... [illegible]

گھروں میں کھانے کا جس قدر سامان تھا رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ پانی اگرچہ بے حد احتیاط سے پیا گیا لیکن آخر کار کنوئیں یا گھڑے میں ایک قطرہ نہیں رہا۔ عورتوں مردوں میں سے کسی میں برداشت کی طاقت نہیں رہی صبر کے ساتھ دن گذارنے اور (اپنے آپ کو) سامانِ خور و نوش حاصل کر لینے کا فریب دینے کا وقت بھی گزر گیا۔ دو شبانہ روز سب بھوکے پیاسے رہے؛

"افسوس! یہ گریہ وزاری اور ذلت و محتاجی! اور صد حیف یہ بے چارگی و پریشان حالی اور بے سرو سامانی!"

تیسرے دن جیسا کہ اس سے قبل ذکر آچکا ہے، مہاراجہ (پٹیالہ) کی فوج کے سپاہی آگئے اور پہرہ دینے لگے۔ گلی کے رہنے والوں نے لوٹ مار کرنے والوں کے خوف سے نجات پائی "ہرچہ بادا باد" کہتے ہوئے پہرہ داروں سے باہر جانے کی اجازت چاہی۔ یہ پہرہ از راہِ دوستی تھا نہ کہ از راہِ دشمنی، اس لئے یہ کہا گیا کہ چوک کے بازار تک جا سکتے ہیں۔ چوک کے آگے قتل و خون کا بازار گرم ہے اور راستہ پر خطر ہے۔

مجبور و پریشان حال لوگوں نے دروازہ کھول دیا بہشتی و مشک کا ملنا ناممکن تھا، اس لئے ہر گھر سے ایک مرد اور میرے ملازمین میں سے دو شخص گئے۔ میٹھا پانی دور تھا اور (اتنی) دور جا نہیں سکتے تھے۔ مجبوراً نیم شور پانی مشکوں اور گھڑوں میں بھر لائے۔ اس طرح اس نمکین پانی سے وہ آگ بجھی، جس کا دوسرا نام پیاس ہے۔

باہر جانے والے اور پانی لانے والے لوگ کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہم کو اجازت نہیں ہے، سپاہیوں نے کچھ مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے (ان گھروں میں) نہ تو بورے میں آٹا ملا، نہ برتن میں روغن۔ میں نے کہا اچھا بندہ وہ ہے جو برتن، پتیلے، آٹے اور تیل کا ذکر نہ کرے، ہماری روزی تو ایسے (روزی رساں) کے ذمہ ہے جو ہم کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ خدا کی بخشش کا شکر نہ ادا کرنا شیطنت ہے۔

آج کل ہم لوگ اپنے آپ کو قیدی سمجھ رہے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ بالکل قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ تو کوئی آتا ہے کہ کوئی سننے کو بات ملے۔ نہ خود باہر جا سکتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے سارے واقعات دیکھیں۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں بے نور، اس کشمکش کے علاوہ نہ کھانے کو روٹی ہے نہ پینے کو پانی۔

ایک دن اچانک بادل آیا، پانی برسا۔ ہم نے (صحن میں) ایک چادر باندھ لی اور ایک مٹکا

اس کے نیچے رکھ دیا اور (اس طرح) پانی حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بادل دریا سے پانی لیتا ہے اور زمین پر برساتا ہے (لیکن) اس بار یہ ہما صفت بادل پانی، چشمۂ حیوان سے لایا۔ گویا سکندر نے جو چیز اپنی بادشاہت کے دور میں ڈھونڈی تھی، مجھ پریشان حال نے وہ دولت (آبِ حیات) اس تباہی و بربادی کے عالم میں پالی ——۔

"اے غالب! دوست کی طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوتی (البتہ) وہ اس طرح کام بناتا ہے کہ ہم سمجھ نہیں پاتے ہیں۔"

اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی زندگی اور اشغال کے متعلق بھی لکھوں، اس طرح کہ یہ سرگزشت سلسلۂ کلام سے غیر متعلق نہ ہونے پائے:

"میں نئے داغوں سے زخم ہائے جگر پر مرہم رکھ رہا ہوں، اور میں نشتر کی مدد سے دل سے پیکان نکال رہا ہوں۔"

اس سال میری زندگی کا باسٹھواں سال شروع ہوا (اتنی مدت سے) میں اس دنیا کی خاک چھان رہا ہوں اور پچاس برس سے شعر و شاعری میں مصروفِ جگر گدازی ہوں۔ میری عمر پانچ سال کی تھی کہ میرے والد عبداللہ بیگ خاں بہادر کا انتقال ہو گیا۔ خدا ان کی روح پر بے شمار رحمتیں نازل کرے۔ میرے چچا نصراللہ بیگ خان بہادر نے مجھ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور لاڈ پیار سے پرورش کی۔ جب میری عمر نو سال کی ہوئی تو میرے چچا جو میرے سرپرست بھی تھے موت کی گہری نیند سو گئے (گویا میری قسمت سو گئی۔

(میرے یہ) لائقِ تعریف و صاحبِ جاہ و حشمت (بزرگ) چار سو سواروں کے سردار اور جنرل لارڈ لیک بہادر کے وفادار متعلقین میں سے تھے اس فاتح اور سخی سردار کی مہربانی سے وہ آگرہ کے قریب دو پرگنوں کے حاکم اور مالک تھے۔ ان کے انتقال کے بعد (وہ) دونوں پرگنے انگریزی حکومت نے واپس لے لیے۔ اس جاگیر کے بجائے میرا اور میرے حقیقی بھائی کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا گیا جو میری آرام و آسائش کا ذریعہ تھا۔ چنانچہ اس سال یعنی ۱۸۵۷ء میں اپریل تک کا وظیفہ کلکٹری دہلی کے خزانے سے میں نے حاصل کیا۔ مئی سے اس خزانے کا دروازہ ہی بند ہو گیا (اب) میں بدنصیبی سے دوچار ہوں، اور دل طرح طرح کے خیالاتِ پریشان کا مسکن ہے۔

اس سے پہلے صرف بیوی تھی۔ نہ کوئی لڑکا تھا، نہ لڑکی۔ تقریباً پانچ سال ہوئے کہ میں نے اپنی بیوی (جو میری تباہی کی ذمہ دار ہے) کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے

بچوں کو لے کر پال لیا[1] ہے۔ ان شیریں زبان بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالم بے چارگی میں (دونوں بچے) میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن و گریبان کے پھول ہیں۔

بھائی جو دو سال مجھ سے چھوٹا ہے، تیس سال کی عمر میں دیوانہ ہو گیا۔ تیس برس سے وہ اس طرح زندگی گزار رہا ہے کہ نہ کسی کو ستاتا ہے نہ شور و غوغا کرتا ہے۔ اس کا مکان میرے گھر سے تقریباً دو ہزار قدم کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ گھر کے تالا کی مالک اور سارے سامان کو ایک بوڑھے دربان اور ایک بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا۔

اگر میں جادو جانتا ہوتا تب بھی (ان حالات میں) میں کسی کو بھیج کر ان تینوں آدمیوں کو نہ بلوا سکتا تھا نہ سامان منگوا سکتا تھا۔ یہ بہت بڑا غم ہے اور میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے۔

وہ دونوں ناز پروردہ بچے پھل، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں، لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس! افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں۔ جب تک زندہ ہوں، روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی۔ میں دن رات اس فکر میں رہتا ہوں کہ بھائی نے دن میں کیا کھایا (ہوگا) اور رات میں کیسے سویا (ہوگا) اور (حالات سے) ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہوں کہ (بھائی) زندہ بھی ہے یا مصیبتیں (اُٹھاتے اُٹھاتے) مر گیا۔

"میرے ہونٹوں پر صرف آہ و فغاں نہیں ہے، خدا کی قسم (اس غم سے) میں جاں بلب ہوں۔"

جو حالات میں نے بیان کیے یہ دل دکھانے والے ہیں۔ لیکن جو کچھ میں کہہ نہیں سکا ہوں، وہ بھی روح فرسا ہے۔ جو لوگ حالات سے واقف ہیں، میں ان سے توقع کرتا ہوں کہ وہ میری پُر درد داستان کو غور سے سُنیں گے اور سن کر انصاف کریں گے۔

میں اس بڑھاپے میں چراغِ صبح اور آفتابِ لبِ بام کی مانند ہوں۔ میرا مطلب چراغ کی روشنی اور سورج کی نور افشانی سے نہیں ہے بلکہ جس طرح صبح کے وقت چراغ کا روغن ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہلکی ہو جاتی ہے اور دن ڈھلے سورج کی چمک دمک ماند پڑنا شروع ہو جاتی ہے، وہی

۱۔ زین العابدین عارف (باپ) اور بستی بیگم عرف نواب دُلہن (ماں) کے بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں سے مراد ہے۔ عارف، غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کی بڑی بہن بنیادی بیگم کے صاحبزادے تھے۔ تفصیل کے لئے رجوع کیجیے: [illegible] طبع چہارم، ص ۱۶۹، ۱۷۶

میرا حال ہے۔ دو سال ہوئے کہ میں نے ملکۂ انصاف پسند، فلک رفعت، ستارہ حشم ملکۂ وکٹوریہ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور ڈاک سے جو دہلی سے براہِ راست بمبئی اور وہاں سے لندن جاتی ہے، آقائے مجتز پسند روحاکم نامور لارڈ ڈالن برا بہادر کے حضور میں بھیجا، جو گورنری کے زمانے میں ازراہِ کرم میرے مربّی تھے:

راہ سخن کشودم اگر خود نہ شد کہ بخت
راہم بہ بزمِ بانوے گیتی ستاں دہد

یہ شعر اُسی قصیدے کا ہے۔ وہ قصیدہ اِسی ردیف قافیے میں ہے۔ کسے خیال تھا کہ ایسا مشکل کام اس آسانی سے بن جائے گا۔ تین مہینے کے بعد اچانک ایک مبارک قدم قاصد اس سرو بوستان سروری (لارڈ ڈالن برا) کا نوازش نامہ لایا۔ یہ خط انگریزی میں تھا۔ نہایت محبت کے ساتھ لکھا تھا کہ قصیدہ ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم نے اس کو ملکۂ معظمہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے متعلقینِ بارگاہِ شاہی کے سپرد کر دیا۔ اس پر مسرت پیغام اور مبارک جواب کو تیس دن نہیں گزرے تھے کہ سردار مہربان مسٹر رز نگٹن بہادر کا گرامی نامہ ڈاک سے آیا، لکھا تھا کہ جو قصیدہ لارڈ ڈالن برا بہادر کے واسطے سے ہمارے پاس پہنچا تھا، اُس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ سائل ضابطے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی گزارشات فرمانروائے ہندوستان کے وسیلے سے ہماری بارگاہ میں پیش کرے۔

حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک معروضہ شہنشاہ انگلینڈ کے نام (لکھ کر) سکندر جاہ، فریدوں حشم لارڈ کیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں بھیجا۔ اس گزارش نامے میں التماس د آرزو کو اس طرح پیش کیا گیا کہ روم، ایران اور دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے شاعروں اور مداحوں کو طرح طرح سے نوازا ہے۔ موتیوں سے منہ بھر دینا، سونے میں تلوانا، گاؤں عطا کرنا، اور انعام دینا، غرض مختلف انداز رہے ہیں۔ اس مدّاح کی یہ خواہش ہے کہ ملکۂ معظمہ اپنی زبان (مبارک) سے مہر خواں (خطاب) ارشاد فرمائیں۔ اپنے حکم سے سراپا (خلعت) بخشیں اور اپنے خوان سے چند نانِ ریزہ (روٹی) کے ٹکڑے عنایت فرمائیں۔ مہر خوان اور سراپا کا ترجمہ عرفی تو خطاب اور خلعت ہو سکتا ہے اور نانِ ریزہ کو انگریزی میں پنسن کہہ سکتے ہیں۔

حاکمِ بلند مرتبہ نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں میرے دلِ غم زدہ کو بشارت ملوا سے شاد فرمایا (موصوف) نے لکھا کہ (وہ) ستایش نامہ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔ اس خبرِ مسرت اثر سے میں ایسا مسرور ہوا کہ جامے میں پھولا نہیں سماتا تھا۔

چار ماہ کے بعد میرے خط کے جواب میں فرخ شمائل، عالی نسب مسٹر رسل کلرک بہادر کے تلطف

کا لکھا ہوا مودت نامہ (موصول ہوا) اس (جواب نے) امیدواری اور آرزو مندی کی مدت کو اور بڑھا دیا۔

ستمبر کی تیسویں تاریخ کو بدھ کے روز شہر کی فتح اور گلی کا دروازہ بند کرنے کے ستر ہویں دن لوگ خیر لائے کہ لوٹ مار کرنے والے بھائی (مرزا یوسف) کے گھر پر چڑھ دوڑے۔ گلی اور گھر میں لوٹ مار کی۔ دیوانے مرزا یوسف خاں اور دونوں بڑھیا بڈھوں کو زندہ چھوڑ دیا۔ اس بھاگڑ میں دو بندو کہیں سے آکر (گھر) میں پناہ گزیں ہو گئے۔ بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز (ماما) دونوں نے ان ہندوؤں کی مدد سے کھانے پینے کا انتظام کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

واضح ہو کہ اس پکڑ دھکڑ اور قیامت کے عالم میں جس طرح ہر کوچے اور بازار میں اس مصیبت کی صورت یکساں نہیں ہے، اسی طرح قتل کرنے اور لوٹ مار میں بھی سب سپاہیوں کا انداز ایک نہیں ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان کا نظم و نسق (غدر میں) تباہ نہ ہوتا اور نا ہنجار اور ناشکرے سپاہیوں کے ہاتھوں علاقیں نہ اجڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے ایسا فرمان صادر ہوتا جس سے مرادیں پوری ہو جاتیں اور میری آنکھیں، اور میرا دل دونوں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔[۱]

اب وہ مبارک خطوط جو میری پُر جوش آرزوؤں کی فہرست ہیں اور میرے ہوش و خرد کے بازو کا تعویذ میرے پاس[۲] ہیں اور جگر کے چند ٹکڑے جو جوشِ گریہ میں آنکھوں سے ٹپکے ہیں، جگر خراشی و خون فشانی کے نام کے طور پر میرے دامن میں ہیں۔ "میں تیر یا تلوار کا زخمی نہیں ہوں۔ نہ پلنگ و شیر نے مجھے مجروح کیا ہے۔ میں (شدتِ غم میں) اپنے ہونٹ کاٹتا ہوں اور زبان کو خون آلود کر لیتا ہوں

[۱] غالب نے "ملکۂ معظمہ ہند و انگلینڈ کی مداحی میں وہ پایۂ بلند و رتبۂ ارجمند پایا کہ ابتدائے عملداری سرکار سے کسی بندہ خدا کے لیے اس کا دسواں حصہ دیکھنے میں نہیں آیا۔۔۔۔ آگے ایک قصیدہ ملکۂ معظمہ کی شان میں کہا تھا، نظرِ انور سے گزرنے کو ولایت میں بھیجا تھا۔۔۔۔ فروری ۱۸۵۷ء میں جناب رسل کلرک صاحب بہادر نے مصنف کو انگریزی چٹھی لکھی ولایت سے۔۔۔ کہ تمہارے قصیدے کے انعام کا مقدمہ زیرِ تجویز ہے۔۔۔ بعد صدورِ حکم، انڈیا گورنمنٹ سے اس کی اطلاع پاؤ گے۔ ناگاہ مئی سنہ مذکور میں سرزمینِ ہند پر آسمان ٹوٹا۔ فوجِ حوادث نے کل متاعِ امید کو لوٹا۔ بہتیرے بے گناہ میں زیرِ آسیائے گردوں پسے جس طرح چکی کے پاٹ تلے گیہوں پسے۔ کیا آغاز تھا، کیا انجام ہوا کہ ہر گستر بھی ناکام ہوا، نواب صاحب (مرزا اسد اللہ خاں غالب) کا وہ معاملہ گویا خواب تھا کہ جب آنکھ کھلی تو کچھ نہ دیکھا۔۔۔ عجب نہیں کہ پرورشِ سلطانی پھر توجہ فرمائے۔ عین حالتِ یاس میں لطفِ خسروانی سے امید بر آئے۔۔۔" [اودھ اخبار، لکھنؤ ۱۰ مارچ ۱۸۶۲ء ص ۱۹۵]

[۲] نگریزی حکام کی ان تحریروں کو غالب اپنے حق میں سرٹیفکیٹ خیال کرتے تھے۔ غالب نے والیِ رامپور کے نام، مفتۂ ۱۸۵۷ء کے خط میں ان سرٹیفکیٹ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

...جلتا ہوں اور زندگی سے بیزار ہوں۔"

...(سپاہی) رحم کرتا ہے یا دوسرا سختی کرتا ہے تو یہ ذاتی رحم دلی اور سنگدلی کا نتیجہ ہے۔

میں جانتا ہوں کہ اس یلغار میں حکم یہ ہے کہ جو شخص اظہارِ اطاعت کرے اس کو قتل نہ کیا جائے مال چھین لیا جائے اور جو شخص مقابلہ کرے مال کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی بھی چھین لی جائے۔ مقتولین کے متعلق یہ خیال ہے کہ انہوں نے یقیناً اطاعت نہیں کی ہوگی اسی وجہ سے ان کو قتل کر دیا گیا۔ مشہور بھی یہی ہے کہ عموماً سامان لوٹ لیتے ہیں قتل نہیں کرتے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے اور وہ بھی صرف دو تین کوچوں میں کہ پہلے قتل کر دیا پھر سامان لوٹ لیا (البتہ) بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کا قتل روا نہیں رکھا ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر توسن خامہ رک گیا۔ اب میں ایک پُر زور آواز بلند کروں کہ سمندِ قلم، قدم آگے بڑھائے اے انصاف کی تعریف کرنے والے اور ظلم کو برا کہنے والے حق پرستو! اگر ظلم کی مذمت اور انصاف کی تعریف میں تمہاری زبان اور تمہارا دل ایک ہے تو خدا کے واسطے ہندوستانیوں کا طرزِ عمل یاد کرو۔ اس کے بغیر کہ پہلے سے دشمنی کی کوئی بنیاد اور عداوت کا کوئی سبب ہو (ان ہندوستانیوں نے) اپنے آقاؤں کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔

بے چاری عورتوں اور گہواروں میں کھیلتے ہوئے بچوں کو قتل کیا (حالانکہ) سب جانتے ہیں کہ اپنے آقا سے بے وفائی کرنا گناہ ہے (اس کے مقابلے میں) ان انگریزوں کو دیکھو کہ جب دشمنی کا بدلہ لینے کے لئے لڑنے اٹھے اور گناہ گاروں کو سزا دینے کے لئے لشکر آراستہ کیا، چونکہ (وہ) شہر والوں سے بھی برہم تھے تو موقع تو اس کا تھا کہ (شہر پر قابض ہونے کے بعد کتے بلی (تک کو) زندہ نہ چھوڑتے (لیکن انہوں نے) ضبط کیا۔ (اگرچہ) ان کے سینے میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی عورتوں اور بچوں کو ذرا نہیں ستایا یہ جو گھربار اور جان مال محفوظ رہنے کی ذمہ داری نہیں لی گئی ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بے گناہوں اور گناہ گاروں میں امتیاز رہے۔ جن لوگوں کو باز پرس کے لئے بلایا گیا ہے ان کے سوا اور کسی کو حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے۔

شہر کے بیشتر لوگوں کو باہر نکال دیا ہے۔ کچھ لوگ بہ دستور امید و بیم میں گرفتار (شہر کے اندر) موجود ہیں۔ جو لوگ (شہر سے نکل کر) ویرانوں اور گوشوں میں مقیم ہوگئے ہیں، ان کے بارے میں ابھی کوئی حکم (صادر) نہیں ہوا۔ جو لوگ (شہر سے) باہر نکل گئے ہیں، یا جو شہر کے اندر مبتلائے پریشانی ہیں؟ ان کے درد کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کاش (شہر کے) اندر رہنے والے اور (شہر کے) باہر بسنے والے ایک دوسرے کی زندگی و موت سے واقف ہوتے کہ بے تابی و پریشانی نہ ہوتی۔ بس نہیں جانتا کہ ... جو جس جگہ ہے پریشان ہے۔ شہر کے اندر رہنے والے مجبور لوگ ہوں یا باہر کے پریشان حال ... سب کے دل درد سے بھر کر

ہوئے ہیں اور سب قتلِ عام کے خوف سے ہراساں ہیں۔

۵ر اکتوبر کو پیر کا مصیبت آفریں دن (تھا) دوپہر کے وقت اچانک چند گورے، اُس دیوار پر چڑھ گئے جو بند کردہ دروازے سے ملی ہوئی ہے۔ (وہاں سے) ایک چھت پر (اور چھت سے) کود کر گلی میں آگئے راجہ نرندر سنگھ کے سپاہیوں کا روکنا (کچھ) مفید نہیں ہوا (نہیں روک سکے) دوسرے چھوٹے چھوٹے مکانات کو نظرانداز کرکے راقم الحروف کے گھر میں (گھس) آئے۔ (ان گوروں نے) میل منسی سے سامان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مجھ کو ان دونوں بچوں، دو تین ملازمین اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر حقیقت پسند، دانش ور اور کرنل برونؔ[1] کے پاس لے گئے، جو چوک سے اسی طرف قطب الدین سوداگر کی حویلی میں مقیم ہے (کرنل برون نے) مجھ سے بہت نرمی و انسانیت سے بات چیت کی۔ مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا۔ خوش اسلوبی کے ساتھ اسی وقت رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، اس خوش اخلاق (کرنل برون) کی تعریف کی اور چلا آیا[2]۔

۷ر اکتوبر کو شام کے وقت ۱۲ر توپوں کی آواز نے (قوت) سامعہ کو نوازا، اور آگہی کو غرقِ حیرت کر دیا (میں سوچنے لگا کہ) لیفٹیننٹ گورنر بہادر کے آنے پر سترہ توپوں کی سلامی دی جاتی ہے اور نواب

---

[1] ۲ر فروری ۱۸۵۹ء کے ایک خط بنام مجروح میں بھی غالب نے کرنل "برون" لکھا ہے: "انتخابِ غالب" (۱۸۶۵ء) میں بھی برون درج ہے لیکن جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب نے بتایا ہے، یہ دراصل "برن" ہے۔ **Malleson** کی تاریخ بغاوتِ ہند جلد ۲، صہ میں ہے:

"کرنل **Burn** جو رخصت ہونے کی وجہ سے فوج کے ساتھ نہ تھے، مگر اب آگئے تھے۔ بہ تاریخ ۲۱ (ستمبر ۱۸۵۷ء) دہلی کے فوج گورنر مقرر ہوئے۔" (جہانِ غالب، معاصر، پٹنہ، حصہ ۴، صہ ۳)

[2] "انتخابِ غالب" میں غالب نے اس واقعہ کو (؟) ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"غدر کے دنوں میں نہ شہر سے نکلا، نہ پکڑا گیا، نہ میری روبکاری ہوئی۔ جس مکان میں رہتا تھا، وہیں بدستور بیٹھا رہا بلی ماروں کے محلے میں میرا گھر تھا۔ ناگاہ ایک دن آٹھ سات گورے دیوار پر چڑھ کر اس خاص کوچے میں اتر آئے، جہاں میں رہتا تھا۔ اُس کوچے میں بہ ہمہ جہت ۵-۶ آدمی کی بستی ہوگی، سب کو گھیر لیا اور اپنے ساتھ لے چلے۔ مگر گرفتار نہیں کیا اور کسی کو بے حرمت نہیں کیا، نرمی سے لے چلے۔ راہ میں سرجن بھی آملا۔ وہ مجھے کرنل برون کے پاس لے گیا۔ وہ چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں اُترے ہوئے تھے۔ باہر نکل آئے اور میرا صرف نام پوچھا اوروں سے نام بھی پوچھا [illegible] اسد اللہ خاں [illegible] کہا کہ تلنگے دروازے سے

١٠١

گورنمنٹ ہاؤس [illegible] نے پرانیس توپوں کی۔ اکیس توپوں کی ہوش (جشنِ) اسلامی کی کیا وجہ ہے۔ دوسرے دن بھی نہ اس ناواقفیت میں کوئی کمی ہوئی، نہ معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ملک کے پست و بلند کو ہموار کرنے والے (انگریزوں) کو کسی دوسری جگہ باغیوں پر فتح حاصل ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ ابھی باغیوں کے بہت سے گروہ بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں جگہ جگہ شورش پھیلانے اور بے فائدہ مقابلہ کرنے میں مصروف ہیں اور ان کے دل، کہ خدا کرے خون ہو جائیں، اور ان کے ہاتھ کہ خدا کرے بے کار ہو جائیں، اسی کام (لڑائی) کے لئے کھُلے ہوئے ہیں۔

ادھر سونہہ اور نوہ کے علاقے میں میواتیوں نے بے طرح شورش پھیلا رکھی ہے، جیسے دیوانے زنجیروں سے آزاد ہو گئے ہوں۔ تلارام نامی ایک شورش پسند کچھ دن تک ریواڑی میں ہنگامہ آرا رہا۔ پھر شیطان کی بنمائی سے میواتیوں سے مل گیا۔ یہ گروہ میدانوں اور پہاڑوں میں (انگریز) حاکموں سے برسرِ جنگ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر ہر طرف تیز آندھیوں اور بھڑکتی ہوئی آگ کے ہنگامے بپا ہیں۔

ان غم انگیز حالات میں، جن کا آغاز یاد نہیں ہے اور جن کا انجام معلوم نہیں ہے، رونے کے علاوہ کچھ دیکھا ہو تو آنکھوں کے روزن خاک سے بھر جائیں۔ روزِ سیاہ (بدنصیبی) کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں، جس کے متعلق کہوں کہ آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اس سے قطع نظر کرتے ہوئے (کہتا ہوں) کہ روزِ سیاہ (بدنصیبی) تو وہ چیز ہے جس کی تاریکی میں کچھ دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔

جس دن گورے مجھ کو پکڑ لے گئے تھے، اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا، یا دُور سے چوک کو دیکھ لینا، نصیب نہیں ہوا ہے۔ گویا گنجہ کے دانش ور (نظامی گنجوی) نے میری ہی زبان سے کہا ہے:

"میں نہیں جانتا ہوں، دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کیا اچھائی ہو رہی ہے کیا برائی۔"

ان لا علاج غموں اور مرہم بیزار زخموں (کے ہوتے ہوئے تو) مجھ کو یہ سوچنا چاہیئے کہ میں مر چکا ہوں۔ مجھ کو بازپرس کے لئے اٹھایا گیا اور بجزائے اعمالِ بد کے نتیجے میں دوزخ کے کنوئیں میں لٹکا دیا گیا ہے۔ مجبوراً

(صفحہ ١٠٠ سے آگے) باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے، میں کیوں کرتا؟ (پھر) میری صورت کو دیکھیے اور میرا حال معلوم کیجیے بوڑھا ہوں، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، نہ لڑائی کے لائق، نہ مشورت کے قابل۔ ہاں، دُعا کرتا، سو یہاں بھی دُعا کرتا۔ کرنل صاحب ہنسے اور فرمایا: "اچھا تم اپنے گھر جاؤ، اور اپنے نوکروں اور اپنے علاقہ داروں کو ساتھ لے جاؤ۔ باقی اہلِ محلہ سے غرض نہ رکھو۔ میں خدا کا شکر بجا لایا اور کرنل صاحب کو دُعا دیتا ہوا اپنے گھر آیا۔" — غالب کے ہم زُلف نواب غلام حسین کی روایت اس بارے میں قدرے مختلف ہے۔ (غالب نامہ آور، کراچی، ١٩٦٩، ص ١١٥)

اس قید میں بے چارگی و پریشانی کے ساتھ ہمیشہ جینا پڑے گا :

" ہم پر جو کچھ آج گزر رہی ہے اگر کل بھی یہی گزری (تو) آہ (کیا ہوگا) !"

اس کتاب میں شروع سے آخر تک یا اُن حالات کا ذکر ہے جو مجھ پر گزر رہے ہیں، یا اُن واقعات (کا ذکر) ہوگا جو سننے میں آئے ہیں۔ میں نے جو شنیدہ حالات لکھے ہیں تو کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے جھوٹ باتیں سنی ہوں گی، یا کچھ کم کر کے لکھی ہوں گی۔ میں عار و گیر سے خدا کی پناہ چاہتا ہوں اور سچائی میں نعمات ڈھونڈتا ہوں۔ آنکھیں بے کار ہیں، دل قید (غم) میں ہے اور لب ساکت ہیں۔ لوگوں کی زبانوں سے میرے کانوں کو معلومات کی بھیک ملتی ہے۔ کیسی بُری ہے یہ گدائی ! اور وہ بھی اس بے سروپائی کے ساتھ۔

اور یہ جو بادشاہ اور شاہ زادوں کے انجام کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا (حالانکہ ان واقعات کو) فتحِ شہر کی داستان کے دیباچے کے طور پر (آغاز ہی میں) لکھنا چاہیئے تھا، اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ اس تحریر کے سلسلے میں میرا سارا سرمایۂ سخن بائے شنیدہ ہیں، اور ابھی بغیر سنی ہوئی باتیں بہت ہیں یقیناً جب میں اس جائے تنگ سے باہر نکلوں گا جو باتیں اب تک نہیں سنی ہیں اِدھر اُدھر سے جمع کروں گا اور تب واقف کاروں کی طرح یہ راز کی باتیں لکھوں گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس تحریر کے پڑھنے والے (واقعات) داستان کی تقدیم و تاخیر پر از رُوئے انصاف اعتراض نہیں کریں گے۔

۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن نے جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیئے، آتش فشاں اژدھے کی طرح دنیا کو نگل لیا۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کمبخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتارِ راہِ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔[1] پانی، رومال، غسال، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑ دو، یہ بتاؤ کہ میں کیسے جاؤں اور (میت) کہاں لے جاؤں ؟ کس قبرستان میں سپردِ خاک کروں ؟ بازار میں اچھا، بُرا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ہے۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں بستے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کے کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں (لیکن) مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں، چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور (اس) کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ پٹیالے کے

---

[1] یہاں غالب کا بیان مشتبہ ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیے مضمون "میرزا یوسف" از مالک رام، نوائے ادب' بمبئی، اپریل ۱۹۵۹ء

ایک [illegible] بھاگے گیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ وہ تین سفید چادریں یہاں سے (گھر) لے گئے تھے، اُن میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی، زمین کھودی (قبر بنائی) میت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے:

"افسوس کہ ساٹھ سال کی عمر میں (وہ) تیس سال شاد رہا اور تیس سال ناشاد قبر میں اس کو بالیں خشت بھی نہ ملا۔ خاک کے علاوہ اور کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اے خدا اس مرنے والے پر رحم کر کہ اس نے زندگی میں آرام (کی صورت) نہیں دیکھی۔ اس کی دلجوئی کے لئے کسی فرشتے کو بھیج اور اس کی روح کو بہشت میں داخل کر۔"

یہ نیک سرشت لیکن بدقسمت شخص جس نے زندگی کے ساٹھ سال خوش و ناخوش گزارے۔ تیس سال ہوشمندی کے ساتھ اور تیس سال بے ہوشی (دیوانگی) کے عالم میں۔ زمانہ ہوشمندی میں غصہ ضبط کرنا اور عالم دیوانگی میں کسی کو تکلیف نہ پہنچانا جس کا شعار تھا، ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ کی شب میں مر گیا ہے:

"ایک شخص نے مجھ سے ستم نصیب میرزا یوسف کی تاریخ (وفات) پوچھی، جس نے اس دنیا میں اپنے سے بیگانہ ہو کر زندگی گزاری۔ میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا "دریغ دیوانہ"۔"

واضح ہو کہ "دریغ دیوانہ" سے ۱۲۹۰ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے "آہ" کے ۱۶ عدد نکال دیے جائیں تو ۱۲۷۴ رہ جاتے ہیں جو مطلوب ہیں:

"اُس خدا کے نام کہ جس کے حضور میں معذرت کرنا ہی مناسب ہے، تم جہاں سر جھکاؤ گے، اُسی کا آستانہ ہوگا۔"

جس ہفتے انگریزی فوج نے شہر کو فتح کیا، اسی ہفتے نامورانِ دانشمند امین الدین احمد خان بہادر، اور محمد ضیاء الدین خان بہادر نے حفظِ وضع کی خاطر اور امیدِ بہتری پر شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ بیوی بچوں کے علاوہ تین ہاتھی اور چالیس گھوڑے ساتھ تھے۔ پرگنہ لوہارو کا رخ کیا، جو ان کی آبائی جاگیر ہے پہلے مہرولی گئے اور اس گورستان پُرانوار (مقبرہ) میں قیام کیا۔ دو تین روز آرام کیا۔ اس دوران میں لٹیرے سپاہیوں نے قیام گاہ کو گھیر لیا۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھے، ان کے علاوہ سارا سامان چھین لیا اور چلے گئے۔ البتہ تینوں ہاتھی جن کو وفادار اور خیر خواہ بہاری اس لوٹ مار کے شروع ہوتے ہی نکال لے گئے تھے، تباہی و نقصان کے نشان کی حیثیت سے باقی رہ گئے جیسے تین جلے ہوئے خرمن ہوں۔

(یہ لوگ) لوٹ مار کی مصیبت اٹھا کر (اس) بے سرو سامانی کے ساتھ جس کو تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو (ریاست) دوجانہ کی طرف روانہ ہو گئے (دوجانہ) کے نامور اور نیک کردار (فرماں روا) حسن علی خان بہادر

نے ازراہِ انسانیت و فیاضی (ان کا) استقبال کیا۔ یہ کہہ کر کہ "میرا گھر بھی آپ ہی کا گھر ہے"، ان سب کو دوجانہ لے گئے۔

قصہ مختصر سردار خوش خصال (حسن علی خان) نے اپنے ہمسر (مہمانوں) کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاہ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ صاحب کمشنر بہادر نے (ان حالات) سے واقف ہو کر اپنے پاس بلا لیا۔ (یہ لوگ) شہر میں آئے اور حاکم سے ملاقات کی۔ (صاحب کمشنر) نے کچھ دیر طعن و تشنیع کی (لیکن) جب نرم جواب سُنا تو پھر کچھ نہیں کہا۔ قلعہ کے اندر ایوانِ خان سامانی کے پہلو میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔

تسلسلِ کلام کی رعایت کی وجہ سے میں اس خاندان کی تباہی کی داستان نہیں لکھ سکا۔ یوں سمجھو کہ مہرولی میں ان لوگوں کو لوٹا گیا اور دہلی میں ان کے مکانات جو مالکوں سے خالی تھے، نذرِ غارت گری ہوئے۔ جو سامان یہ لوگ وہاں (مہرولی) اپنے ساتھ لے گئے تھے، لوٹ مار کرنے والوں کے حصے میں آیا۔ بس متعلقین زندہ دوجانہ پہنچے، اور جو سامان یہاں محلات میں تھا، سب لٹ گیا۔ بس اینٹیں پتھر باقی رہ گئے۔ نہ سیم و زر محفوظ رہا، نہ لباس و بستر کا ایک تار بچا۔ خدا (ان) بے گناہوں پر رحم کرے۔ اس آغازِ ناسازگار کا انجام بخیر ہو اور (ان) کو اس مصیبت کے بعد آرام نصیب ہو۔

یقیناً اکتوبر کی ۷ تاریخ تھی اور سنیچر کا دن کہ یہ دونوں دانشمندانِ یگانہ شہر میں آئے اور جیسا کہ میں نے (پہلے) کہا ہے، قلعہ میں قیام کیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن کے بعد فوج کو حکم دیا گیا۔ فوج گئی اور جھجر کے حاکم عبدالرحمان کو مجرموں کی طرح لائی۔ قلعہ کے اندر ایک ایوان کے گوشے میں جس کو دیوانِ عام کہتے ہیں (ٹھہرنے کے لئے) جگہ دی گئی اور ان کی ساری جاگیر انگریزی حکومت نے ضبط کر لی۔

۱۳ اکتوبر کو جمعہ کے دن فرخ نگر کے حاکم احمد علی خان کو اسی طرح (گرفتار کر کے) لائے، جیسے عبدالرحمان خان کو لائے تھے اور قلعہ دہلی میں ایک الگ جگہ اُن کو ٹھہرایا گیا۔ فرخ نگر بھی تیر دست تباہ کار دل کا نشانہ بنا اور شہر والوں کا مال و اسباب لُٹ گیا۔

۲ نومبر کو پیر کے دن دادری اور بہادر گڑھ کے حاکم بہادر جنگ خان گرفتار ہو کر آ گئے اور قلعہ میں جہاں ٹھہرایا گیا، ٹھہرے۔ ۷ نومبر کو سنیچر کے دن راجہ ناہر سنگھ حاکم بلب گڑھ کے آ جانے سے قلعہ میں جو سردار مختلف مقامات پر ایک دوسرے سے دور مقیم تھے ان میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔

واضح ہو کہ دہلی کی ایجنسی کے ماتحت جو جاگیریں ہیں، وہ شمار میں ہفتے کے دنوں سے کم یا زیادہ نہیں

ہلی کے ماتحت سات جاگیریں ہیں) جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی۔ ان میں سے پانچ جاگیروں کے حاکم جیسا کہ میں نے کہا، قلعے میں موجود ہیں اور بقیہ دو جاگیردار پاٹودی اور دوجانہ میں خوف کے تیر کا نشانہ ہیں۔ دیکھو! ان کی جہاں بیں آنکھیں دنیا میں کیا دیکھتی ہیں اور کیا انجام ہوتا ہے۔

یہ بات پوشیدہ نہیں رہے گی کہ مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خان اور ذوالفقار الدین حیدر خاں جن کا لقب حسین مرزا ہے، اس ہنگامے میں دوسرے باعزت لوگوں کی طرح بیوی بچوں کے ساتھ شہر سے باہر چلے گئے۔ قیمتی سامان سے بھرے ہوئے گھر چھوڑ دیے اور صحرا نوردی اختیار کی۔ ان لوگوں کے کئی مکانات محل اور ایوان ہیں باہم متصل۔ اتنے وسیع کہ اگر (ان محلات و ایوانات کی) زمین کی پیمائش کی جائے تو شہر نہ سہی، ایک گاؤں کے برابر تو (رقبہ) ہوگا۔ اتنے بڑے بڑے محل اس عالم میں کہ ان میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں لوٹ مار (کرنے والوں کے ہاتھوں) صاف اور ویران ہو گئے۔

کچھ کم قیمت اور بھاری سامان جیسے ایوان کے پردے، شامیانے، سائبان، شطرنجیاں اور دوسرا فرش ان قیام گاہوں میں باقی رہ گیا تھا۔ اچانک ایک رات، جس کی صبح کو راجہ نامبر سنگھ گرفتار ہوئے، اس سامان میں آگ لگ گئی۔ لپٹیں اٹھنے لگیں۔ لکڑی، پتھر، دیواریں سب جل گئیں۔ یہ عمارت میرے مکان سے جانب مغرب اتنی قریب ہے کہ میں آدھی رات کو بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی چھت پر سے دیکھ رہا تھا اور دھوئیں کی گرمی میرے چہرے اور آنکھوں تک پہنچ رہی تھی۔ کیونکہ اس وقت پچھیا ؤ چل رہا تھا، راکھ میرے اوپر آرہی تھی۔ ہاں پڑوسی کے گھر سے (بلند ہونے والے) تنکے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر پڑوسی کے گھر کی آگ راکھ کیوں نہ برسائے۔

راقمِ حالات کے قلم کی جنبش (اس واقعے کے اثر سے) جو نیم مردہ چیونٹی کی رفتار کے برابر ہے (سست ہے) (صفحہ) کاغذ پر (اس حالت) کی کیا عکاسی کر سکتی ہے کہ نگاہیں اس کو دیکھ سکیں۔ شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعض کو گولی مار دی گئی (اس طرح) موت کے اژدہے نے ان کو نگل لیا۔ کچھ کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا گیا (اس طرح) رسنِ دار کی کشاکش سے ان کی روح مضطر کر رہ گئی۔ چند افسردہ دل قید خانے میں ہیں اور بعض (عالمِ غربت میں) آوارہ و پریشان پھر رہے ہیں۔ کمزور و ضعیف بادشاہ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے جاگیرداروں کو علیحدہ علیحدہ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس طرح (ان لوگوں کو) ہلاک کیا کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ خون بہایا گیا۔

جنوری ۱۸۵۸ء کے آغاز میں ہندوؤں کو فرمانِ آزادی مل گیا، اور (شہر میں) آباد ہونے کی اجازت

دے دی گئی۔ یہ لوگ (جنہیں) جہاں جہاں تھے، شہر کی طرف چل پڑے۔ خانماں برباد مسلمانوں کے گھروں میں (خالی پڑے رہنے کے سبب سے) سبزہ اس قدر اُگ آیا ہے کہ در و دیوار سبز ہیں۔ ہر لحظہ سبزہ سر دیوار کی زبان سے یہ صدا آتی ہے کہ مسلمانوں کی جگہ (بدستور) خالی ہے۔

شاید بدخصلت مخبروں کے کہنے سے حاکمِ شہر کو یہ خیال ہوا ہو گا کہ راجہ نریندر سنگھ بہادر کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ اور جمع ہونے کی جگہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ (ان) بے ہودہ گو ہنگامہ ساز (مخبروں) میں سے ایک دو شخص اس محفل میں (موجود) بھی ہوں۔ اس خیال سے ۲ فروری کو منگل کے دن (حاکمِ شہر) کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو ساٹھ دوسرے نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گیا اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا لیکن باعزت لوگوں کی عزت کا بھی خیال رکھا۔

۵ فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور اُن کے بھتیجے عبدالحکیم خاں عرف حکیم کالے کو واپسی کی اجازت مل گئی۔ ۱۲ فروری کو جمعہ کے دن چند دوسرے اشخاص اور ۱۳ فروری کو سنیچر کے دن تین شخص اور واپس آ گئے (لیکن) نصف سے زیادہ حوالات میں رہ گئے۔ یہ مصیبت جو پڑوس میں نازل ہوئی اور یہ ہنگامہ جو گلی میں برپا ہو گیا (اس کی وجہ سے) مجھ درویش غم زدہ کا دل بھی قابو میں نہیں۔ اس کے باوجود کہ اس دار و گیر میں مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، ابھی تک (یہ عالم ہے) کہ دن بھر متفکر رہتا ہوں اور رات میں آرام کی نیند نہیں سو پاتا ہوں۔

فروری کے پُرشوکت مہینے میں کہ اس زمانے سے ماہِ فروردین تک (جو موسم بہار کا پہلا مہینہ ہے) جس میں آفتاب کی رونق و روشنی بڑھ جاتی ہے، سورج کو ابھی (برج حمل تک پہنچنے کے لیے) ایک مہینے کا سفر طے کرنا ہے۔ حاکمِ مہربان، خورشید طلعت، ستارہ حشم سر جان لارنس صاحب چیف کمشنر بہادر کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ چونکہ میرا یہ طریقہ رہا ہے کہ جو حاکم ہندوستان بخصوصہ اس شہر (دہلی) میں آئیں اُن کی مدح میں قصیدہ بھیجا جائے، اس بنا پر اس ذوالشکوہ (سر جان لارنس) کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، جو تہنیتِ فتح اور خیر مقدمِ نوروز پر مشتمل تھا اور ۱۹ فروری کو جمعہ کے دن بذریعہ ڈاک بھیجا۔

۲۰ فروری کو شام کے وقت ۲۱ دیو آواز، نہنگ آہنگ توپوں کی آواز آئی اور اتوار کی صبح کو شہر لکھنؤ کی فتح کی خوشخبری اس تفصیل کے ساتھ سننے میں آئی کہ ۱۶ فروری کو آسمان سرداری کے اختر تابندہ، سپہ سالار نامور کمانڈر انچیف بہادر نے سیاہ رو جنگ جو (باغیوں) پر اس طرح حملہ کیا کہ آسمان کے سپہ سالار (مریخ) نے سلامت دست و بازو کی اتنی دعائیں دیں اور اس قدر تعریف کی کہ اس کے ہونٹوں پر چھالے پڑ گئے اور زبان تھک گئی۔

دنیا کو آبادی کا مژدہ، اور اہلِ دنیا کو نویدِ آزادی کہ آزاد اور نیک ذات لوگوں (انگریزوں) کی آرزو پوری ہو گئی اور بُرے اور بد ذات لوگوں کا دورِ دورہ وہاں بھی ختم ہو گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ توپوں (کی گرج) اور شہنائیوں کے نغمے (صرف) حصولِ طاقت کے شادیانے تھے۔ فتح نصیب فوج کے بہادر اس جنگ کے دوران میں شہر پر قابض نہیں ہوئے (بلکہ) دلیروں کی طرح دشمنوں کو قتل کرنے کے لئے دوڑ پڑے (دشمنوں کو) زخمی اور قتل کرنے کے بعد (اپنے) پڑاؤ کی طرف لوٹ آئے۔

۲۴ر فروری کو بدھ کے دن ایک پہر دن چڑھے مبارک وقت میں، باغِ انصاف کے سروِ آزاد آسمان رفعت کے ماہِ تابندہ، فرخ طلعت، فرخندہ سیرت، ستارہ حشم چیف کمشنر بہادر نے اپنے توسن کے سموں کے نشانات سے دہلی کی سرزمین کو آسمان کی طرح ستارہ زار بنا دیا اور تیرہ توپوں کی (سلامی کی) آواز نے خستہ دلوں کو مرہم مہر و محبت کی بشارت دی:

"حاکم شاہ نشان (کیا) آئے کہ شہر کے (مردہ) جسم میں روح واپس آگئی۔ شہر میں مسرت کی ایسی لہر دوڑ گئی ہے جیسے شہنشاہ شاہ جہاں آگئے ہوں۔"

۲۷ر فروری کو جب سنیچر کا دن ختم ہوا اور رات آئی، رات کے تین پہر گذر گئے (اس وقت) مظلوموں کے دل کا دھواں چاند پر اس طرح چھا گیا کہ دیکھنے والے بے اختیار چلا اٹھے کہ چاند گہن میں آگیا۔ اسی سنیچر کو حکمِ دورباش ختم ہو گیا۔ انصاف چاہنے والے اور پریشان حال لوگوں کو حاضر ہونے کی اجازت اور خواہش مندوں کو پناہ دے دی گئی۔

اس شہر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرون شہر، ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے (ان محدود مقامات میں کثرتِ تعداد کو دیکھ کر) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی میں آدمی سمویا جا رہا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے، اُن کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے، میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں، اُن میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سرزمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے اردگرد دو دو، چار چار کوس پر ٹیلوں گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے پڑے ہیں۔ اس ویرانہ نشین گروہ میں یا تو وہ لوگ ہیں جو شہر میں رہنے کے خواہشمند ہیں یا گرفتار شدہ لوگوں کے رشتہ دار ہیں یا خیرات خوار یعنی پنشن دار ہیں۔ لوگوں کی درخواستوں میں رہائی، آبادی اور اجرائے پنشن کے علاوہ اور کوئی (مضمون) نہیں پاؤ گے۔ دادخواہوں کی دو تین ہزار درخواستیں عدالت میں پہنچ چکی ہیں۔ انصاف طلب، چشم براہ اور

گوش برآواز ہیں کہ کیا سننے اور دیکھنے میں آتا ہے۔

میں بھی اس نیاز نامے اور ستائش نامے کے جواب کا منتظر ہوں، جس کو میں نے بذریعہ ڈاک بھیجا تھا۔ مختلف خیالات پریشان کے سبب سے حاکم (شہر) کی جائے قیام پر جانے اور ملاقات کرنے کی کوئی صورت نہیں نکلی ہے۔ مختصر یہ کہ (ہر اعتبار سے) ایسی مصیبتیں ہیں گویا (ہر طرف) کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اگر باہر نکلو گے تو راستے میں (بچھے ہوئے) دیکھو گے۔ اگر گھر (ہی) میں بیٹھے رہو گے (تو معلوم ہوگا) کہ کپڑوں میں چھپے ہوئے ہیں (کسی طرح سکون نہیں ہے) ابھی تک صبر بے تابی پر غالب تھا کہ ۸ر مارچ کو پیر کے دن وہ خط ایک تحریر کے ساتھ میرے پاس واپس آگیا۔ خط کی پیشانی حاکم دانشور کے اس فرمان سے منور تھی کہ خط فرستندہ کو واپس کر دیا جائے تاکہ وہ حاکم شہر کے توسط سے ہمارے پاس بھیجے۔ سب نے کہا اور میں نے بھی سوچا کہ یہ پُر فائدہ جواب امید افزا علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میری گزارشات منظور ہو جائیں گی۔ وہ خط جس پر فرمان مسطور تھا، مناسب عبارت کے اضافے کے ساتھ سرور عادل رعایا پرور دانشمند، چارلس سانڈرس صاحب چیف کمشنر بہادر کے حضور میں بھیجا اور ایک خط خاص طور پر نامور موصوف (چارلس سانڈرس) کے نام منسلک کر دیا، جو خواہشِ دیرینہ یعنی اجرائے پنشن سے متعلق تھا۔

۱۷ر مارچ کو بدھ کے دن فرمانروا کے حضور سے پہلی خواہش کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا کہ یہ خط جس میں تہنیت کے سوا کچھ نہیں ہے اس کے بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایسے پُر آشوب حالات میں مہر و محبت اور مسرت و انبساط کی کیا گنجائش، میں تو بندۂ ستم ہوں، مجھ کو تو روٹی چاہیئے۔ دیکھوں اس دوسری خواہش کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۸ر مارچ کو جمعہ کے دن شام کے وقت روح کو توانائی بخشنے والی آواز توپ آسمان کے نیلے گنبد میں گونج اٹھی۔ (جس سے) لکھنؤ کا فتح ہونا اور اس شہر میں کینہ خواہ انگریزی فوج کا حسب دلخواہ پھیل جانا معلوم ہوا۔ اس شہر میں قلعہ، فصیل، دروازہ کچھ نہیں ہے۔ یقیناً وہاں کے باغیوں کی فوج کی دیوار اس طرف کے بہادروں (انگریزوں) کا راستہ روکے ہوئے ہوگی۔ جب وہ کمزور دیوار بہادروں کی کوشش کی آندھی سے گر گئی ہوگی تو بالیقین سواروں اور پیادوں کے چلنے سے ہر راستے سے گرد و غبار بلند ہوا ہوگا۔ ہاں خدا اپنے فضل سے جس کو بادشاہت عطا کرتا ہے اس کو فتح کرنے کی طاقت اور شان و شوکت بھی عطا کرتا ہے۔ اسی بنا پر جو شخص فرماں رواؤں کی نافرمانی کرتا ہے، وہ اس قابل ہے کہ اس کے سر پر جوتے لگیں۔ محکوم کا حاکم سے لڑنا (ستالی) پر ہاتھ مارنا (اپنے آپ کو تباہ کرنا) ہے۔ دنیا والوں کے لئے مناسب ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے خوش بختی عطا کی ہے، ان کے سامنے سر جھکا دیں اور فرمانرواؤں کے حکم کی تعمیل کو خدا کے

حکم کی تعمیل سمجھیں۔ جب ہم کو یہ معلوم ہو گیا کہ خوش نصیبی حکومت اور طاقت کس کی بخشی ہوئی ہے تو پھر سرکشی اور بیزاری کیوں ہے۔ نغمہ طراز شیراز (سعدی) نے اس بات کو کیسے اچھے انداز سے ادا کیا ہے:

"غلام (آقا کے) حکم کے سامنے سر نہیں جھکائے گا تو کیا کرے گا۔ گیند چوگان کی اطاعت کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے؟"

۲۲ مارچ سے مجھ دیوانے کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ دنیا میں فروری کا مہینہ اور نوروز کا دن بھی آتا ہے اور وہ روز جہاں افروز (نوروز) انہیں دو چار تاریخوں میں ہوتا تھا۔ امسال شاید یہ شہر مُردوں کا مسکن ہے کہ بہار کی آمد آمد پر نعرہ ہائے مسرت سننے میں نہیں آتے ہیں۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ سال ترکوں کے "سال دوازدہ گانہ" میں سے کون سا سال ہے اور رات دن کے برابر ہونے کی ساعت کب آئے گی۔ اگر منجم مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (آفتاب) کے سفر کا روزنامچہ تحریر (پیش گوئی آثار) سے خالی رہ گیا تو یہ سمجھو کہ چند جھوٹ بولنے والے کم ہو گئے اور فرض کر لو کہ چند جھوٹی باتیں سنی ہی نہیں۔ آفتاب برج حمل میں قیام (تحویل) کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ اگے اور پھول نہ کھلیں۔ اصولِ آفرینش بدلتے نہیں ہیں۔ آسمان مقررہ اصول گردش کے خلاف عمل نہیں کر سکتا۔ میں باغ پر نہیں اپنے اوپر آنسو بہا رہا ہوں۔ مجھے موسم بہار کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ اپنی بد قسمتی کا شکوہ کر رہا ہوں۔

"دنیا لالہ کے پھولوں سے رنگین اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے (لیکن) میں ایک گوشے میں مجبور و بے سر و سامان بیٹھا ہوا ہوں۔ بہار کا موسم ہے اور میں بالکل بے سر و سامان ہوں مفلسی کے سبب سے گھر کا دروازہ بند ہے۔"

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زمانہ بہت بے پروا ہے۔ میں زاویہ نشین غم و آلام اگر سبزہ و گل کو نہیں دیکھوں گا اور دماغ کو پھولوں کی خوشبو سے معطر نہیں کروں گا تو بہار میں کیا کمی آجائے گی اور ہوا سے کون تاوان لے گا؟

اپریل کے مہینے میں جس میں دو ثلث ماہ فروردین کے اور ایک ثلث ماہ اردی کا ہے، حکیم محمود خاں کے ساتھ جو لوگ قید خانے میں باقی تھے، رہا ہو گئے۔ ہر ایک نے اپنا راستہ لیا۔ وہ ناز پروردہ، صاف طینت (حکیم محمود خاں) سارے رشتے داروں، بیوی بچوں اور متعلقین کے ساتھ پٹیالے کی طرف چلا گیا[1]۔ کہتے ہیں

---

[1] آج جواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر پٹیالے کو گئے۔۔۔ میں بمقتضائے وقت، اپنی سکونت

ابھی تک وہ کرنال میں مقیم ہیں۔ معلوم نہیں آئندہ کے لئے کیا سوچا ہے۔

مئی کے شروع میں کانوں کو یہ خبر سننے کا فخر حاصل ہوا کہ سپاہ کینہ خواہ کے بہادروں نے مراد آباد کو فتح کر لیا۔ جو بداندیش (باغیوں) کی گزرگاہ تھا اور اس شہر کو انصاف سے آراستہ کرنے کے لئے عالی نسب سرچشمہ علم و دانش نواب یوسف علی خاں بہادر کے حوالے کر دیا۔ آج کل (نواب یوسف علی خان) جو دنیا کو فتح کرنے اور دنیا پر حکومت کرنے کے اہل ہیں، اس علاقے پر تعمیل حکم کے طور پر فرماں روائی کر رہے ہیں، (اور مجھ کو) امید ہے کہ ہمیشہ فرماں روائی کرتے رہیں گے۔

اس کے علاوہ کہتے ہیں کہ کوہ شگاف اور اژدہا شکار فوج نے جب (بریلی و مراد آباد کے) اس علاقے پر یورش کی، تو بریلی کے گناہ گار (باغیوں) کو اس طرح نکال باہر کیا جیسے طاقت ور موجیں خس و خاشاک کو کنارے پر پھینک دیتی ہیں۔ اس صورت حال (کو دیکھتے ہوئے) توقع ہے کہ جو گراں جان (باغی) ادھر ادھر باقی رہ گئے ہیں، شہروں، گاؤں میں لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور راستہ چلنے والوں کو ستاتے ہیں۔ اُن کا دور دورہ بھی جلد ختم ہو جائے گا اور سارا ملک حاکمانِ عادل (انگریز) کے پرچم کے زیرِ سایہ آجائے گا۔

۱۳ر جون کو اتوار کے دن شام کے وقت حاکمِ شہر نے بہادر جنگ خان کو اپنے پاس بلایا، جو قلعہ میں نظر بند تھے۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ گئے۔ جاں بخشی اور ایک ہزار ماہانہ وظیفہ مقرر کیے جانے کی خوشخبری سنائی گئی اور حکم ہوا کہ لاہور کی طرف چلے جائیں۔ اس کے بعد آزادی کی زندگی بسر ہو گی اور اسی شہر (لاہور) میں رہنا ہو گا۔ بے شک ان حالات میں مناسب یہی ہے کہ وہ (بہادر جنگ خاں) جاہ و دولت کے غم و افسوس سے آزاد ہو جائیں اور اس آزادی پر مسرور و مطمئن ہوں۔

دن کا شہنشاہ (آفتاب) جس کا سر روزانہ نیزے پر گھمایا جاتا ہے، ابھی افقِ مشرق سے بقدرِ یک نیزہ بلند نہیں ہوا تھا کہ ماہ جون کے گزرے ہوئے دنوں کی تعداد کے برابر رعد کی طرح گرجنے والی توپوں کی آواز بلند ہوئی (۲۱ ضرب توپ سے مراد ہے) جس نے دوستوں کے دل کو مسرت و شادمانی سے معمور کر دیا اور آگ سے زیادہ جلانے والی (غم کی) راکھ دشمنوں کے سر اور چہرے پر ڈال دی۔ گوالیار کا شہر فتح ہو جانے اور اس سنگین قلعہ کے ہاتھ آجانے کی خوشخبری جو زمین کا جگر گوشہ اور پہاڑ کا لختِ جگر ہے، خدا کے دربار سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لائی (اس مژدۂ پُر مسرت نے) حاکموں اور فرمانبرداروں کو آرزوؤں کے چراغ جل اٹھنے

(صفحہ ۱۰۹ سے آگے)

کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آ رہا ہوں، اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانے میں مردانہ۔"

(نامۂ غالب بنام: غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

(آرزوئیں پوری ہوجانے) کی بشارت دی ۔

یہ داستان یوں ہے کہ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ فرماں روائے گوالیار مہاراجہ جیاجی راؤ حکومت اور شہر دونوں کو چھوڑ کر آگرہ سے چلے گئے اور انگریزوں سے مدد چاہی (انگریزوں سے) امدادی فوج لے کر اپنے وطن کی طرف گئے اور فتح حاصل کی۔ (باغیوں نے) بھاگم بھاگ ہر طرف سے گوالیار کا رُخ کیا (تھا) یہاں ایسی شکست فاش ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان گم راہوں کا انجام یہ ہوگا، کہ بدحالی و پژمردگی کے ساتھ اِدھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھریں گے۔ اور آخر کار جگہ جگہ ذلت و خواری کے ساتھ مارے جائیں گے، ان کے صحرانورد گھوڑوں کو بے تاب دگاہ میدانوں میں زمین پر پڑا ہوا (مردہ) دیکھو گے اور اس گروہ کے ساز و سامان کو گذرگاہوں میں بکھرا ہوا پاؤ گے۔ پھر ہندوستان خس و خار (ظلم و ستم) سے ایسا پاک ہوجائے گا کہ جنگل کا ہر گوشہ باغ کی طرح سرسبز ہوگا اور ہر مردہ گذر بازار کی طرح پُر رونق نظر آئے گی۔

راقم الحروف کی زندگی کے ترسٹھ سال گزر چکے ہیں۔ ان طرح طرح کے روح فرساغموں (کے سبب) سے ظاہر ہے کہ اب زمانے سے اور زیادہ فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہے۔ مجبوراً، سحر نگار شیراز (سعدی) رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کو دہراتا ہوں اور جس طرح ایک غم نصیب دہر غم زدہ شخص سے نصیحت حاصل کرتا ہے، اِن اشعار (کو پڑھ کر) اگر دل کو خوش نہیں کر سکتا ہوں تو کم سے کم قیدِ رنج و غم سے آزاد تو کر ہی لوں گا :

"افسوس! ہمارے بغیر اس دنیا میں بارہا بہاریں آئیں گی اور پھول کھلیں گے۔ تیر، دے اور اردی بہشت کے مہینے بار بار آئیں گے۔ جب کہ ہم (قبر میں) خاک ہو چکے ہوں گے۔"

فی الحقیقت سچی بات کو چھپانا اچھے لوگوں کا طریقہ نہیں ہے۔ میں نیم مسلمان مذہبی پابندیوں سے آزاد ہوں اور بدنامی و رسوائی کے رنج سے بے نیاز۔ ہمیشہ سے رات میں صرف ولایتی شراب پینے کی عادت تھی، ولایتی شراب نہیں ملتی تھی تو نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جب کہ انگریزی شراب شہر میں بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس ہوں، اگر خدا دوست، خدا شناس، فیاض و دریا دل مہیش داس دیسی شراب قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بو میں اس سے بڑھ کر ہے بھیج کر آتشِ دل کو سرد نہ کرتے تو میں زندہ نہیں رہتا، اسی عالم جگر تشنگی میں مرجاتا۔

"عرصے سے دل چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آرزو پوری ہوجائے (آرزو یہ تھی کہ) شراب ناب کے ایک دو ساغر مل جائیں۔ دانشمند مہیش داس نے مجھ کو وہ آب حیات بخش دیا جس کو سکندر

نے اپنے لیے ڈھونڈا تھا۔"

یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس نیکی پسند شخص (مہیش داس) نے (شہر میں) مسلمانوں کی آبادکاری کے متعلق کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ خدا کی مرضی نہیں تھی، کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ (شہر میں) ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہربان حاکموں کی محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس نیکی پسند بہی خواہ (مہیش داس) کا اس انتظام میں دخل رہا ہے، قصہ مختصر خوش نصیب شخص ہے۔ لوگوں کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ زندگی عیش و مسرت کے ساتھ گزارتا ہے۔ اگرچہ مجھ سے بہت پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔

میرے دوسرے متعلقین اور شاگردوں میں سے ہیرا سنگھ، جو ایک نیک نام نوجوان اور تعلقات کا بہت خیال رکھنے والا ہے (برابر) آتا رہتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نصف آباد نصف ویران شہر کے لوگوں میں سے عالی نسب شیو جی رام برہمن جو ایک عقل مند نوجوان ہے اور مجھ کو بیٹے کی طرح عزیز ہے، مجھ مصیبت زدہ غم زدہ کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ فرماں برداری اور کارسازی کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا لڑکا بال مکند جو ایک پرہیزگار اور خوش اخلاق نوجوان ہے، اپنے والد کی طرح تعمیل حکم میں مستعد اور غم گساری میں یکتا ہے۔

دور دراز کے دوستوں میں سے (ایک دوست) آسمانِ محبت کے ماہِ کامل شیوا بیان[1]، ہرگوپال تفتہ بھی ہیں، جو میرے پرانے مونس و ہمدم ہیں اور اس بنا پر کہ مجھ کو اپنا استاد کہتے ہیں ان کا کلام ساری خداداد خوبیوں کے ساتھ میرے لیے سرمایۂ ناز ہے۔ مختصر یہ کہ بہت اچھے آدمی ہیں سراپا محبت و اخلاص۔ شاعری سے ان کو فروغ (شہرت) حاصل ہے اور ان کے دم سے شاعری کے ہنگامے گرم رہتے ہیں۔ انتہائے محبت سے میں نے ان کو اپنا جزوِ روح سمجھ لیا ہے اور "مرزا تفتہ" خطاب دیا ہے۔ انہوں نے میرٹھ سے ایک ہنڈی[2] میرے پاس بھیجی، نیز غزل اور خط برابر بھیجتے رہتے ہیں۔

---

[1] "التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم و نثر میں ۔۔۔ ہے وہ بھی اسی شرط کے ساتھ ۔۔۔ ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے، وہ عربی، ہندی، انگریزی جو ہیں وہ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً تمہارا نام "منشی ہرگوپال"۔ منشی لفظ عربی ہے؟ نہیں لکھا گیا، اس کی جگہ "شیوا زبان" لکھ دیا ہے۔" (بنام تفتہ: ۔۔۔ اگست ۱۸۵۸ء) [2] یہ ہنڈی سو روپے کی تھی۔ ۔۔۔ جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا تھا کہ: "تم ۔۔۔ (۱۸۵۷ء) سے ۔۔۔ نہیں پایا۔ ۔۔۔ جیسے ۔۔۔ ہو گئے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔" اس پر تفتہ نے بڑی ۔۔۔ دکھائی اور فی الفور سو روپے کی مالیتی ہنڈی بھجوائی۔ غالب نے اس کی رسید دیتے ہوئے اس رقم کا قصہ جس طرح تمام ہوا اس کی جو تفصیل لکھی ہے وہ لطف سے خالی نہیں: "سو روپے کی ہنڈی جو ۔۔۔ ایک آدمی رسید مہر کر کے ۔۔۔ کے کٹرے میں چلا گیا۔ سو روپے ۔۔۔ لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ ۔۔۔ روپے داروغہ کی معرفت"

باتیں جن کا لکھنا لازمی نہیں تھا، صرف اس لیے لکھیں کہ (ان لوگوں کی) فیاضی اور محبت کا شکریہ ادا ہو جائے، نیز اس لیے بھی (لکھیں) کہ جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھوں میں آئے تو وہ سمجھ لیں کہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ راتوں کو ان لوگوں کے گھر چراغ سے محروم رہتے ہیں، اور دن میں دیواروں کے روزن دھویں سے۔ غالب جس کے شہر میں ہزاروں دوست تھے ہر گھر میں شناسا اور واقف کار موجود تھے۔ اس تنہائی میں قلم کے سوا کوئی اس کا ہم زبان اور (اپنے) سایہ کے علاوہ کوئی ساتھی نہیں ہے:

"اب میرے چہرے پر اس وقت تک آب و رنگ نہیں آتا ہے جب تک کہ ہزار بار اشکِ خوں سے چہرے کو تر نہ کر دوں۔ میرے جسم میں غم و افسوس، جان و دل بن گئے ہیں اور میرے بستر کا تانا بانا کانٹوں سے (تیار ہوا) ہے۔"

اگر شہر میں یہ چاروں شخص نہ ہوتے تو کوئی شخص میری بے کسی کا گواہ بھی نہ ہوتا۔ (گردش) روزگار پر رشک آتا ہے کہ اس لوٹ مار میں جب کہ شہر کے کسی گھر میں مٹی بھی نہیں بچی، اگرچہ میرا گھر لوٹ مار کرنے والوں کی دراز دستی سے محفوظ رہا (لیکن) میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستہ اور پہننے کے کپڑوں کے علاوہ گھر میں کچھ نہیں رہا۔[1] اس عقدۂ دشوار کا حل اور اس درد و غم کی حقیقت یہ ہے کہ جس وقت کالوں (باغیوں) نے شہر پر قبضہ کیا، بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں۔ زیور وغیرہ جو کچھ تھا خفیہ طور پر کالے صاحب پیرزادہ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں تہ خانے میں محفوظ کر دیا گیا اور دروازہ مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

جب فاتح (انگریزوں) نے شہر کو فتح کیا اور سپاہیوں کو لوٹ مار کا حکم مل گیا، تب بیگم نے یہ راز مجھ سے کہا، وقت نکل چکا تھا (وہاں تک جانے اور (سامان) لانے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی میں خاموش ہو گیا اور دل کو سمجھا لیا کہ یہ چیزیں جانے والی ہی تھیں، اچھا ہوا کہ میرے گھر سے نہیں گئیں۔

اب یہ جولائی کا پندرھواں مہینہ ہے۔ قدیم پنشن جو سرکار انگریزی سے (ملتی تھی) اس کے ملنے کا کوئی ذریعہ نہ نکلا۔ بستر اور کپڑے بیچ بیچ کر زندگی گذار رہا ہوں۔[2] گویا دوسرے لوگ روٹی کھاتے ہیں

لٹے تھے وہ دیئے گئے، پچاس روپے محل میں بھیج دیئے۔ جیبیں روپے باقی رہے وہ بکس میں رکھ لیے۔۔۔۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور جو رکھے جائی بری آئی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔" (بنام تفتہ: ۳ فروری ۱۸۵۸ء)

[1] غالب کے خطوں سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی بلکہ اس کی تکذیب ہوتی ہے: "میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزم خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا، نہ پکڑا گیا نہ نکالا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا کیا عرض کروں میرے خدا نے مجھ پر کیسی عنایت کی جان و مال و آبرو میں کسی طرح کا فرق نہیں آیا۔" (غالب بنام محمد امیر ذریعہ سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

[2] کپڑے بیچنے کا ذکر انہی ایام کے ایک خط میں اس طرح کیا ہے: "کئی دن ہوئے۔۔۔۔ جو میں نے ایک ولایتی جبہ اور ایک شالی

میں کپڑے کھاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ جب کپڑے سب (بیچ کر) کھالوں گا عالم برہنگی میں بھوک سے مرجاؤں گا۔ اس قیامت سے پرانے نوکروں میں سے دو، تین، نوکر میرے پاس سے نہیں گئے۔ ان کی بھی پرورش کرنا ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ آدمی، آدمی کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ نوکر کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس گروہ (ملازمین) کے علاوہ دوسرے ضرورت مند جو ہمیشہ سے مجھ سے کچھ نہ کچھ فائدہ اُٹھانے کے عادی ہیں، اس بُرے وقت میں بھی اپنی رُوح فرسا آواز (سوال) سے مرغ کی صدائے بے ہنگام سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اب جبکہ جسمانی تکلیفوں کے دباؤ اور رُوحانی اذیتوں کی گُداختگی نے جسم و جان کو تباہ کر دیا ہے، یکایک دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کو آراستہ کرنے میں (جس کا نام تصنیف ہے) کب تک مشغول رہا جا سکتا ہے۔ یقیناً اس کش مکش کا انجام یا تو موت ہے یا بھیک مانگنا۔ پہلی صورت میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو گا کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے انجام و اختتام سے محروم رہے اور پڑھنے والوں کے دلوں کو افسردہ کرے۔ دوسری صورت میں (یہ بات) ظاہر ہے کہ اس ساری داستان میں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا کہ فلاں گلی سے سرِ بازار دھتکار دیا گیا اور فلاں دروازے پر کچھ مل گیا۔ پھر یہ باتیں کب تک بیان کی جا سکتی ہیں اور اپنے آپ کو (کہاں تک) رسوا کیا جا سکتا ہے۔ باقی پنشن اگر مل گئی، تب بھی آئینہ (دل) سے زنگ (غم) صاف نہیں ہو سکے گا۔ (قرض ادا نہیں ہو گا) اگر نہیں ملی، اس صورت میں شیشہ پتھر سے چور چور ہو جائے گا (تباہی یقینی ہے) اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں چونکہ یہاں (دہلی) کی آب و ہوا، مصیبت زدہ لوگوں کو سازگار نہیں آتی ہے، یقیناً شہر سے بھاگنا ہو گا اور کسی دوسرے شہر میں رہنا ہو گا۔

مئی سال گذشتہ سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی رُوداد میں نے لکھی ہے، یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش میری ان تینوں خواہشوں یعنی خطاب، خلعت اور پنشن کے اجرا کا حکم شہنشاہ فیروز بخت کے حضور سے آجائے جن کے متعلق میں نے اس تحریر میں بھی (کچھ) لکھا ہے۔ میری آنکھیں اور میرا دل انہیں کی طرف لگا ہوا ہے وہ شہنشاہ کہ چاند جس کے سر کا تاج ہے، آسمان جس کا تخت ہے، جمشید نشان، فریدوں فر، کاؤس مرتبہ، سنجر شکوہ۔ سکندر حشم، وہ شہنشاہ کہ شاہِ روم اس بات کے لیے اس کا شکر گذار ہے

رومال دُھانی کو (دلال) کو دیا۔۔۔ اور وہ اس وقت روپیے کر آیا۔" (تفتہ، ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

قریب سوا سال بعد تفتہ ہی کو لکھتے ہیں:

"کپڑا ایام تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اس کا فکر کچھ نہیں۔" (۵ نومبر ۱۸۵۹ء)

دہلی کے تخت و تاج کی عزت رہ گئی فرماں روائے روس کا دل اس کی لشکر کشی کے خوف سے دو نیم ہے آفتاب اس خیال سے کہ (یہ) جہاں سوزی اس کی ناراضی کا سبب ہے اگر ڈرتا نہیں ہے تو پھر وہ کیوں ہر لمحہ کانپتا رہتا ہے اور ماہ کامل اس اندیشے سے کہ دنیا کو منور کرنے میں اس کی برابری کا احتمال ہے اگر اپنی گستاخی کی معافی نہیں چاہتا ہے تو پھر کیوں ہر رات خوف سے گھٹتا رہتا ہے:

" وہ مالک تیغ و نگیں و علم ہے۔ وہ شہنشاہ سلطنت بخش اور بادشاہ ساز ہے۔ صاحب دانش، فرخ طلعت اور نیک خو ہے اس کا مرتبہ انصاف میں نوشیرواں سے بلند تر ہے۔ جمشید کے پاس جو درخشاں علم تھا وہ اس لیے اس کو متانت سے رکھتا تھا کہ اس ملکۂ نامور کے سپرد کر دے، خسرو کی طرف سے ترنج زر اور اس کے ساتوں خزانے بغیر زحمت اٹھاتے ہوئے ملکہ کو بہ طور تحفہ ملے ہیں۔

وہ تخت (سلیمانؑ) جس کو ہوا اپنے کاندھوں پر لیے جاتی تھی فرشتۂ غیب نے ملکہ کے سامنے بہ طور پیش کش پیش کیا ہے۔

تم نہیں دیکھتے ہو کہ پہاڑوں میں پتھروں کے جگر سے گوہر رنگا رنگ بر آمد ہوتے ہیں سورج کو اس کے تاج کا خیال رہتا ہے، ورنہ اُسے موتیوں سے کیا کام۔

اگر وہ (ملکہ وکٹوریہ) موتی لٹانے کا ارادہ کریں اور لٹائیں تو کثرتِ بخشش سے حالت ہو گی کہ اگر کوئی شخص ان موتیوں کو شمار کرنا چاہے گا تو شمار کرتے کرتے اس کی انگلیاں گھس جائیں گی۔

اس کی فوج کے خوف سے جو لڑائی کے وقت دریاؤں اور پہاڑوں کو تباہ کر دیتی ہے، پہاڑوں میں اژدھے اور دریاؤں میں نہنگ سر پٹک کر مر جائیں گے۔

اس کی شان و شوکت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ (اس کے در کے) گدا ہیں، اس کی ضیا بخشی اور کرم بے دریغ کا یہ فیض ہے کہ یہ سورج روشن ہے اور بادل میں برسنے کی صلاحیت ہے۔

وہ کرم و فیاضی سے اہلِ علم و دانش کو نوازتی ہیں اور ان کی دانشمندی کی برکت سے دوسرے لوگ صاحب خرد ہو جاتے ہیں۔ ان کی سخاوت حیرت آفریں ہے اور ان کی عقل رسا ہے ان کا نام ملکۂ عالم وکٹوریہ ہے۔

خدائے پاک ان کا نگہبان رہے (خدا کرے) اس محفل (ہستی) میں اُن کا قیام دیر تک رہے۔"

اگر ملکۂ عالم کی بخشش سے میں کچھ حاصل کر لوں گا تو اس دُنیا سے ناکام نہیں جاؤں گا:

"جب بات یہاں تک آ پہنچی تو میں خاموش ہو گیا، میں داستان کہنا نہیں چاہتا ہوں"

مکمل ہونے کے بعد اس کتاب کا نام "دبستو" رکھا گیا (یہ کتاب) لوگوں کو دی گئی اور ادھر اُدھر بھیجی گئی تاکہ صاحبانِ علم و دانش کی رُوح کو تسکین بخشے، اور انشاء پرداز (اندازِ نگارش پر) فریفتہ ہو جائیں اُمید ہے کہ یہ مجموعۂ دانش (دبستو۔) انصاف پسند لوگوں کے ہاتھوں میں گلدستۂ پُر رنگ و بُو ہو گا اور شیطان فطرت لوگوں کی نگاہوں میں آتشیں گیند، آمین ۔

"ہماری طبیعت جو ہمیشہ رواں رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم راز ہائے آسمانی کا سرچشمہ ہیں۔ یہ کتاب دساتیر ہی کا ایک حصہ ہے اس کاردانی کے لحاظ سے (گویا) ہم سُاسان ششم ہیں"

"دستنبو" اور "غدر" کے بارے میں غالب کی ایک اہم تحریر:

ریختہ کے دیوان اور اس کتاب کا
پہنچنا معلوم ہوا دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپکو اختیار ہے مگر یہ چار جزو کا رسالہ جو
اب چھاپا ہے اسکا دیکھنا ضرور درکار ہے فارسی قدیم اور بہر حسن معنے اور صنعت الفاظ بایں
ہر امر کے احتیاط اور ہر بات کا لحاظ جناب عاطفہ معاملہ ہے خدا کا شکر ہے اور اپنی قسمت کا گلہ
ہے خدا کا شکر یہہ کہ باوجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں قسمت کا
گلہ یہ کہ علاقے پنسن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں یہ نومبر ۱۸۵۸ء انیسواں مہینا ہے گویا
بن کھائے جیتا ہوں کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنسن دارونکو روپیہ ملیگا دیکھئے کیا بنا
گل کھیلیگا پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہو گیا ہے کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکۂ معظمہ
عالیمقام ہو گیا ہے میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں اور وزرائے ملکہ دادو دہش
ذو سایۂ ملکت پا چکا ہوں اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیے تو اسکتاب موسوم
بہ دستنبو میں دیکھا چاہیے خشنودی کا طالب غالب نگاشتہ روز یکشنبہ ہفتم نومبر ۱۸۵۸ء

زمانہ کا رنگ اور، کوئی حاکم کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں، ہاں میرے مربی و قدردان جناب
اڈمنسٹن صاحب. وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے، لفٹنٹ گورنر ہو گئے، وہ سکرتر رہتے
تو مجھے کچھ غم نہ تھا، اب تک میں اپنی کو یہ بھی نہیں سمجھا ہوں کہ بیگناہ ہوں یا گناہگار
مقبول ہوں یا مردود. مانا کہ کوئی خیرخواہی نہیں کی جو تئیں انعام کا مستحق ہوں
لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستور قدیم کو برہم کر ڈالے، بہرحال اسکی
تشویش میں ہوں، راہ چارہ مسدود اور موجہ عرفی خوب کہتا ہے ع مرا
زمانۂ طناز دست بستہ و تیغ زند بفرقم و گوید کہ ہاں سرے خارد
مرقومۂ صبح یکشنبہ ۷ نومبر ۱۸۵۹ء

اِنقلاب ۱۸۵۷ء :

رُوداد اور اثراتِ مابعد

ماخذ : خطوطِ غالب

" ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا۔ لاکھوں مرگئے، جو زندہ ہیں اُن میں سینکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں —— جو زندہ ہے، اُس میں مقدور نہیں۔ "

غالب، بنام شیونراین آرام، ۱۹۔ اپریل ۱۸۵۹ء)

"میں نہیں جانتا کہ ۱۱-مئی ۱۸۵۷ء کو پیرون چڑھے وہ فوج باغی بہ میرٹھ سے دہلی تک آئی تھی یہی
کا پے بہ پے نزول ہوا تھا۔ بقدر بخصوصیت سابق۔ دلّی ممتاز ہے اور نہ سرتاسر قلمرو ہند میں فتنہ و بلا کا ہنگامہ
برپا ہے۔" (ماخوذ: انوارالدولہ شفق، ۲۴ اگست ۱۸۶۰ء)

"دلّی کی سلطنت کا جتنا پے درپے اس شہر دلّی پر ہوا: پہلا باغیوں کا لشکر۔ اس میں اہلِ شہر کا اعتبار
لُٹا۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا[1]۔ اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر
لُٹ گئے۔ ——" (انوار الدولہ شفق، ۱۸۶۰ء)

"آدمی کثرت سے مرتے جاتے ہیں۔ خدا کرے یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو۔ اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب
ہوا تو کہا جائے گا۔ ورنہ قصہ مختصر، قصہ تمام ہوا۔ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں اور وہ بھی کون سی خوشی کی
بات ہے جو لکھوں؟" (ثاقب، ۸ فروری ۱۸۵۸ء)

"مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے تھے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، اہلِ حرفہ
کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے۔ بازپرس اور
داروگیر میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔"
(تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"انصاف کرو، خط لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ ... بس
اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے، نہ میں لکھوں گا ——"
(غلام نجف خاں، ۲۶ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء
تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو معلوم نہیں، بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کی توجہ بھی نہیں،

---

[1] "خاکیوں سے مراد انگریزی فوج کے آدمی ہیں، ہندوستانی بھی اور گورے بھی کیونکہ ان کی وردی خاکی تھی":
(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۳۲)

ہے، انجام کار کیا ہوتا ہے ؟" (تفتہ ، دسمبر ۱۸۵۷ء)

"جو دم ہے غنیمت ہے ، اس وقت تک مع اعیال و اطفال جیتا ہوں ۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں ۔ قلم ہاتھ میں لیے پر بھی بہت لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ لکھ نہیں سکتا ۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ۔ ورنہ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلیہِ راجِعُون ؂"

(غلام نجف خاں، ۱۹۔جنوری ۱۸۵۸ء)

"منہ پیٹتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں، نہیں لکھ سکتا ۔ الٰہی حیاتِ جاودانی نہیں مانگتا ، پہلے انور الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں ، پھر اس کے بعد مروں ــــ"

(انور الدولہ شفق ، اکتوبر ۵۸ ۱۸ء)

"وہ عزت اور ربط ضبط جو ہم میں رئیس زادوں کا تھا ، اب کہاں ! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے ــــ" (تفتہ ، ۱۲۔ مارچ ۱۸۵۸ء)

"کئی دن ہوئے . . . جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گزا (پیسوں کی ضرورت سے فروخت کے لیے) دلال کو دیا تھا اور وہ اس وقت روپیہ لے کر آیا ۔"

(تفتہ ، ۱۸۔جولائی ۱۸۵۸ء)

"روٹی کھانے کو نہیں ، شراب پینے کو نہیں ۔ جاڑے آتے ہیں ، لحاف تو شک کی فکر ہے ــــ"

(مجروح ، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی ، رات کو شراب ملتی تھی ۔ اب صرف روٹی مل جاتی ہے ، شراب نہیں ۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہُوا ابھی ہے ، اس کی فکر کچھ نہیں ــــ"

(تفتہ ، ۵۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں اور بیرنگ لفافے میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ غمگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے، آج کاغذ اور ٹکٹ کہیں سے منگاؤں گا ــــ"

(مجروح ، ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔ اُس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی اُمید، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رامپور سے کچھ آیا تو خیر، ورنہ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون ہ"

(یوسف میرزا ، ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رامپور، کہ میرے آشنائے قدیم ہیں، اس سال ۱۸۵۵ء میں، میرے شاگرد ہوئے۔ ناظم اُن کو تخلص دیا گیا۔ بیس پچیس غزلیں اُردو کی بھیجتے، میں اصلاح دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ اُدھر سے آتا رہتا۔ قلعے کی تنخواہ جاری، انگریزی پنسن کھلا ہوا، اُن کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں تو زندگی کا مدار اُن کے عطیے پر رہا ــــ"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود۔ انگریزی پنسن مسدود۔ یہ بزرگوار (والیٔ رامپور) وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا، تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی ــــ"

(میاں داد خاں سیاح ، ۳۰۔ جولائی ۱۸۶۵ء)

"خاص، اپنا دکھ روتا ہوں، ایک بیوی، دو بچے، تین چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز، یہ باہر۔ مداری کی جورو بچے بدستور، گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھمن گئے، گئے مہینے بھر سے گئے کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی، تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں، بیس آدمی روٹی کھانیوالے موجود۔ مقام معلوم (رامپور) سے کچھ آتے جاتا ہے، وہ بقدر سد رمق ہے۔ محنت وہ ہے کہ دن رات میں فرصت کام سے کم ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایک فکر برابر چلی جاتی ہے۔ آدمی ہوں، دیو نہیں،

ـوت نہیں۔ ان رنجوں کا تحمل کیوں کر کروں ؟"

(یوسف مرزا ، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"اب یوں سمجھو کہ نہ ہم کبھی کہیں کے رئیس تھے ، نہ جاہ و حشم رکھتے تھے ، نہ املاک تھے ، نہ پنسن رکھتے تھے ـــــ "
(حسین مرزا ، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"عمر بھر نوکری نہ کی ، نوکری کی تو بہادر شاہ سے نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطاب پایا۔ کچھ دنوں بادشاہ کا مصاحب رہا ، پھر اُستاد کہلایا ـــــ "

(میر بندہ علی خاں ، ۱۸۔ جنوری ۱۸۶۴ء)

"بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا۔ اُن کے ولی عہد (مرزا فخرو) نے چار سو روپے سال۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ دلّی کی سلطنت سخت جان تھی ، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔" (چودہری عبدالغفور سرور ، نومبر ۱۸۶۰ء)

"۔۔۔ واز مئی (۱۸۵۷ء) خود آشکار است کہ حال چیست ؟ پیوندِ تعلق با بہادر شاہ جُز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال بہ تحریرِ تاریخ سلاطینِ تیموریہ و از دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہریاری پرداختم۔ درین ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدین اندیشہ کہ مبادا، گر یک قلم ترکِ آمیزش کنم خانۂ من بتاراج رود و جان در معرضِ تلف اُفتد ، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔ ہر گاہ شہر بردستِ سپاہِ انگریز فتح شد ، ہمہ جاگیرداران و پنسن داران از شہر بدر رفتند ، چنانکہ تا امروز آوارۂ دشت و کوہ اند ، من از جا نجُنبیدم ، و ہم چناں گوشہ گیر ماندم۔ درین بند و بست کہ خاصہ از بہرِ سیاست مجرمان ست، و تحقیقاتِ جُرم از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مُخبران می کنند ، ہیچ گونہ آلایش دامنِ من پدید نیامد و دار و گیر و باز پُرس رو نہ داد۔ بودنِ من در شہر از حُکام نہان نیست۔ اما چون پرسشی در میان نیست ، لاجرم محفوظ ماندہ ام۔ می بایست کہ خود سلسلہ جُنبان گشتی و باحکام پیوستی۔ درین بارہ سخن آنست کہ درین فرماندہان با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم۔ و معہذا ہنوز موقع دمل آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم و خواہشِ ملاقات بمیان آورم۔ راستی اینکہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام۔

لیکن مقام شکر است، کہ بتقدیم رسیدن خدمت از راہ بیدستگاہی است، و ذریعۂ اخلاص و گوں
ہمان بیگناہی است ــــــ" (نواب یوسف علی خاں ، ۱۴- جنوری ۱۸۵۸ء)

"مَیں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہُوا ہوں۔ خواہ اس کو
نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اِس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، مَیں نے دخل نہیں دیا،
صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا
حکّام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں
پائی گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بُلائے ہُوئے یا پکڑے ہوئے آئے
ہیں۔ میری کیا حقیقت تھی ــــــ" (تفتہ ، ۵- دسمبر ۱۸۵۷ء)

"حقیقتِ حال، اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں، بھاگ نہیں گیا، نکالا نہیں گیا،
لُٹا نہیں، کسی محکمے میں اب تک بُلایا نہیں گیا، معرضِ بازپُرس میں نہیں آیا۔ آیندہ دیکھیے کیا
ہوتا ہے؟" (غلام نجف خاں ، ۲۱- دسمبر ۱۸۵۷ء)

"بھائی! میرا خیال ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مُندرج نہیں نِکلا۔ کسی مُخبر نے بہ نسبت میرے
کوئی خبر، بدخواہی کی نہیں دی۔ حُکّامِ وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش
نہیں ہُوں، بُلایا نہیں گیا، دار و گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی بازپُرس ہو تو بُلایا جاؤں۔ مگر
ہاں، جیسا کہ بُلایا نہیں گیا، خود بھی بروئے کار نہیں لایا۔ کسی حاکم کو نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا،
کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی ــــــ" (تفتہ ، ۳۱- جنوری ۱۸۵۸ء)

"میرا حال بدستور ہے، دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے؟ حاکمِ اکبرآباد نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری
نہیں کیا۔ یہ صاحب، میرے آشنائے قدیم ہیں مگر مَیں مِل نہیں سکتا۔ خط بھیج دیا ہے، ہنوز کچھ جواب
نہیں آیا ــــــ" (تفتہ ، ۵- مارچ ۱۸۵۸ء)

"مَیں مخفی نہیں ہُوں، روپوش نہیں ہوں۔ حُکّام جانتے ہیں کہ یہاں ہے۔ مگر نہ بازپُرس و دار و گیر

یکہ ا بیٹا ہوں ، نہ خود اپنی طرف سے قصدِ ملاقات کیا ہے۔ بایں ہمہ ایمن بھی نہیں ہوں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہے ؟"

(مجروح ، ۷۔ فروری ۱۸۵۸ء)

"بھائی بُری آبنی ہے ، انجام اچھا نظر نہیں آتا۔" (تفتہ ، ۳۔ فروری ۱۸۵۸ء)

"میرا حال بدستور ہے ، نہ نویدِ کامیابی ، نہ نہیبِ نااُمیدی۔" (تفتہ ، ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء)

"مَیں مع زن و فرزند ، ہر وقت ، اِسی شہر میں قُلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا ، نہ نکالا گیا ، نہ قید ہُوا ، نہ مارا گیا ——"

(چودہری عبدالغفور سرور ، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"مئی (۱۸۵۷ء) سے پنسن نہیں پایا۔ کہو یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے ؟ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا ؟ زندہ ہوں ، مگر زندگی وبال ہے ——"

(تفتہ ، ۳۱۔ جنوری ۱۸۵۸ء)

"کیا پنسن اور کہاں اس کا مِلنا ! یہاں جان کے لالے پڑے ہیں ؎

ہے موجزن اِک قُلزمِ خوں کاش یہی ہو !
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے ؟

اگر زندگی ہے اور پھر مِل بیٹھیں گے تو کہانی کہی جائے گی ——"

(مجروح ، ۷۔ فروری ۱۸۵۸ء)

"یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور مَیں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہُوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو (۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے) لگاؤ نہ تھا ——"

(تفتہ ، ۱۲۔ مارچ ۱۸۵۸ء)

"خدا کا شکر، یہ کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ، کسی طرح کے جُرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں ـــــ"
(نواب یوسف علی خاں، ۷۔ نومبر ۱۸۵۸ء)

"پنشن کی درخواست دے رکھی ہے۔ بہ شرطِ اجرا بھی میرا کیا گزارا ہوگا؟ ہاں، دو باتیں ہیں: ایک تو یہ کہ میری صفائی اور بے گناہی کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ موافق قولِ عوام "چولہے ولدنہ ہوگا۔"
(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"مجھ کو صاحب ڈپٹی کمشنر نے بُلا بھیجا تھا۔ صرف اتنا ہی پوچھا کہ "غدر" میں تم کہاں تھے؟ جو مناسب ہُوا، وہ کہا گیا۔ دو ایک خط آمدۂ ولایت مَیں نے پڑھ لئے۔ تفصیل لکھ نہیں سکتا۔ انداز و ادا سے پنشن کا بحال و برقرار رہنا معلوم ہوتا ہے ـــــ"
(غلام نجف خاں، جولائی۔ اگست ۱۸۵۸ء)

"پنشن اگرچہ ملے گا، لیکن دیکھیے کب ملے گا؟ اس کے ملنے تک کیا ہوگا اور اس کے ملنے سے میرا کیا کام نکلے گا؟ قطعِ نظر اِن اُمور سے، اس وجہِ قلیل کو کس بستی میں بیٹھ کر کھاؤں گا؟ یہ شہر، اَب شہر نہیں، قہر ہے ـــــ"
(غلام نجف خاں (؟) ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

"بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اس مہینے میں پنشن کی تقسیم کا حکم آجائے گا۔ دیکھیے کہ آتا ہے یا نہیں؟ اگر آتا ہے تو مَیں مقبولوں میں ہوں یا مردودوں میں؟"
(یوسف میرزا، ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"لِلّٰہِ الحمد کہ گنہ گار نہیں ٹھہرا ـــــ" (چودھری عبدالغفور سرور، فروری مارچ ۱۸۵۹ء)

"گنہ گار ٹھہرتا، گولی یا پھانسی سے مرتا۔ اس بات پر کہ مَیں بے گناہ ہوں، مُقید اور مقتول نہ ہونے سے آپ اپنا گواہ ہوں ـــــ" (خواجہ غلام غوث بے خبر، ۳۰۔ جون ۱۸۵۹ء)

(میرا حال) : تو بیکسی و غریبی ترا کہ می پرسد ؟ نہ جزا ، نہ سزا ، نہ نفریں ، نہ آفریں ، نہ عدل ، نہ ظلم ، نہ لطف ، نہ قہر ۔۔۔"
(تفتہ ، ۵۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"دربار میں جاتا تھا ، خلعت فاخرہ پاتا تھا ۔ وہ صورت اب نظر نہیں آتی ۔ نہ مقبول ہوں ، نہ مردود ہوں ۔ نہ گنہ گار ہوں ، نہ مُخبر ، نہ مُفسد ۔۔۔"
(یوسف میرزا ، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء ؟)

"میرا دربار اور خلعت ، دریا بُرد ہو گیا ۔ نہ پنشن کی توقع ، نہ دربار اور خلعت کی صورت ۔ نہ جزا ، نہ سزا ، نہ انعام ، نہ رسمِ معمولِ قدیم ۔۔۔"
(حُسین میرزا ، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"اب تک مَیں اپنے کو یہ بھی نہ سمجھا کہ بے گناہ ہوں یا گنہ گار ؟ مقبول ہوں یا مردود ؟ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی ، جو سنئے انعام کا مستحق ہوں ، لیکن کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے ۔"
(نواب یوسف علی خاں ، ۲۷۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"نانا نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو ؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں ۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے ۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے ؟"
(یوسف میرزا ، جون ۱۸۵۹ء)

"مَیں کروں کیا ؟ فی الحال وہ دامنِ معنیٰ کا وہ حال ہے جو ہندوستان کا غدر کے بعد ہو گیا ۔ جہلاء جانتے نہیں ، علماء ، اعتنا نہیں کرتے ۔۔۔"

(جنوں ، ۸۔ مئی ۱۸۶۴ء)

"(میرا) حال بہ سبیلِ اجمال یہ ہے کہ سیاست سے محفوظ ہوں اور حکام کی عنایت سے محفوظ ہوں ۔ بے وفائی کا داغ نہیں لگا ہے ۔۔۔"
(احمد حسن عرشی ، ۱۸۶۰ء)

"میرا دُکھ سنو : بھاگا نہیں ، پکڑا نہیں گیا ۔ دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں نکلا ۔ کسی طرح کی

بے خیالی دنمک حرامی کا دَھبّا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا۔ اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللّٰہ خاں غالب نے یہ سکّہ کہہ کر گزرانا۔

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے؟ مَیں نے کہا غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر مَیں نے کہہ گزرانا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ کو چاہیے حکیم احسن اللّٰہ خاں سے پوچھیے۔ اس وقت تو چُپکا ہو رہا۔ اب جو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھی کہ یہ جو اسد اللّٰہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور ہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکّہ لکھا۔ ہمارے نزدیک پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے۔"

(حسین میرزا، ۱۸۔ جون ۱۸۵۹ء)

" بھائی، یہاں منشی میر احمد حسین ولد میر روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں، تو مَیں مرشد آباد میں تھا، وہاں مَیں نے یہ سکّہ سنا تھا۔ اُن کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ جہاں چھاپی تھی، وہاں اِس سکّے کا گزرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہُوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع رکھتے ہیں۔ اگر وہاں کہیں اس کا پتہ پاؤ گے اور وہ پرچۂ اخبار اصل بجنسہٖ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے۔ مَیں نے اکبر آباد و فرخ آباد و مارہرہ و میرٹھ اپنے احباب کو لکھا ہے۔ اب تم کو بھی لکھا ہے۔ ایک کالپی کو لکھنا باقی ہے۔ وہ بھی کل پرسوں لکھوں گا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء تین مہینوں کے بارہ پرچۂ اخبار دیکھے جائیں ۔۔ "

(حسین میرزا، ۱۸۔ جون ۱۸۵۹ء)

" جناب چودھری صاحب! آج کا خط کاسۂ گدائی ہے۔ یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں۔ تفصیل یہ کہ محمد باقر دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا تھا، مسمّیٰ بہ" دہلی اردو اخبار"

س انتخاص شیں ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آتے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے آگے کے اوراق دیکھے جائیں، جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے ذو سکے اُن کے نام کہہ گزرنے کا ذکر مُندرج ہو۔ بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہٖ میرے پاس بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۳۷ء میں یہ تخت پر بیٹھے ہیں اور ذوق نے اس مہینے کے بعد سکے کہہ کر گُزرانے ہیں۔ احتیاطاً پانچ مہینے تک کے اخبار دیکھ لیے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام (اصرار) ہے کہ اگر بمثل کسی اور شہر میں کوئی آپ کا دوست جامع ہو اور آپ کو اس پر علم ہو تو وہاں سے منگا بھیجیے ——" (چودھری عبدالغفور سرور، جون ۱۸۵۹ء)

"وہ "دہلی اُردو اخبار" کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مُفید مطلب ہے، ورنہ خیر کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ مَیں نے سکہ کہا نہیں، اگر کہا تو اپنی جان و حُرمت بچانے کو کہا، یہ گناہ نہیں۔ اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ مُعظّمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے؟ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں؟ ہاں صاحب، گولہ انداز کا بہنوئی مددگار ہے اور شاعر کا سالا بھی جانب دار نہیں ——" (یوسف میرزا، جون ۱۸۵۹ء)

سکے کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھُرا یا کوئی گُرا ب۔ کس سے کہوں؟ کس کو گواہ لاؤں؟ یہ دونوں سکے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر، جو ذوق کے مُعتقدین میں تھے، اُنھوں نے "دلی اردو اخبار" میں یہ دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ اب (تک) وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اُس زمانے میں مُرشد آباد اور کلکتے میں یہ سکے سُنے ہیں اور اُن کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سکے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گُزرانے ہوئے ثابت ہوتے ہیں۔ مَیں نے ہر چند قلمرو ہند میں "دلی اُردو اخبار" کا پرچہ ڈھونڈا، کہیں ہاتھ نہ آیا[1]۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنسن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و

---

[1] "لیکن اگر یہ پرچے دستیاب ہو جاتے تو بھی، اُن کے مفید مطلب نہیں ہو سکتے تھے۔ کیوں کہ اگرچہ اُس وقت میرزا کی عمر ۱۸۳۷ء ... ہے.

دربار بھی مِلا۔ خیر، جو کچھ ہُوا، چونکہ موافق رضائے الٰہی کے ہے، اس کا گلہ کیا:

چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داورست

بیداد نبود آنچہ با آسمان دہد

(صاحب عالم مارہروی، ۱۸۵۹ء)

"آپ نے خط لکھا اور میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش، بحکم، نشتر کا رکھتی ہے۔ اب رگِ قلم کی خوں نابہ فشانی دیکھو۔"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"گورنر اعظم نے میرٹھ میں دربار کا حکم دیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے سات جاگیرداروں میں سے جو تین بقیۃ السیف تھے (پٹودی، دوجانہ اور لوہارو) اُن کو حکم دیا اور دربارِ عام میں سے سوائے میرے کوئی نہ تھا یا چند مہاجن۔ مجھ کو کوئی حکم نہ پہنچا۔ جب میں نے استدعا کی تو جواب ملا کہ اب نہیں ہو سکتا۔ جب یہ سرزمین مخیم خیام گورنری ہوئی، میں اپنی عادت قدیم کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچا۔ میر منشی (مولوی افتخار حسین خاں صاحب بہادر) سے ملا۔ چیف سکرتر بہادر کو اطلاع کی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں۔ میں سمجھا کہ اس

(صفحہ ۱۲۹ سے آگے) غالب کو اس کا علم نہ ہو سکا، یہ سکہ، ذوق کا کہا ہوا تھا ہی نہیں۔ اس لیے پرچے مل جاتے جب بھی یہ سکہ ان میں موجود نہیں تھا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ مخبر (گوری شنکر) کی یہ اطلاع محض افترا تھا۔ نہ یہ سکہ میرزا نے کہا تھا، نہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کیا بلکہ یہ سکہ جیسا کہ صادق الاخبار (دہلی) کی اشاعت ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ/۶۔ جولائی ۱۸۵۷ء سے عیاں ہے، حافظ غلام رسول ویران (تلمیذ ذوق) نے لکھا تھا۔"

(مالک رام، ذکرِ غالب، طبع چہارم، دہلی ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۴۲)

"غالب کی طرف جو سکہ منسوب کیا گیا تھا، وہ ذوق کا نہیں، بلکہ ذوق کے شاگرد حافظ ویران کا تھا، جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت شروع ہونے کے بعد کہا تھا اور یہ سکہ دہلی کے صادق الاخبار میں "سکۂ نو" کے عنوان سے شائع ہوا تھا ... (صادق الاخبار: ۱۳۔ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ) نیشنل آرکائیوز آف انڈیا (نئی دہلی) میں "غدر کی دستاویزیں" میں جو مخبروں کے خطوط ہیں، اُن میں سے ایک میں گوری شنکر نے یہی سکہ میرزا غالب سے منسوب کیا ہے۔ غالباً اسی خط کی بنا پر غالب پر سکہ کہنے کا الزام لگا تھا۔"

(عتیق صدیقی، غالب اور ابوالکلام، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۲)

وقت فرصت نہیں، دوسرے دن پھر گیا۔ میری اطلاع کے بعد حکم ہُوا کہ ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟ اُس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط اُن کے نام کا لکھ کر، اُن کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص ملنا محض ہے، اُمیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہِ گذشتہ یعنی فروری میں پنجاب کے مُلک سے جواب آیا کہ لارڈ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔ پس یہ مقدمہ طے ہُوا۔ دربار و خلعت موقوف، پنسن مسدود وجہ نامعلوم۔ لاموجود الا اللہ، لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۰ء)

"۱۸۶۰ء میں لارڈ صاحب بہادر نے میرٹھ میں دربار کیا۔ صاحب کمشنر بہادر دہلی، اہالی دہلی کو ساتھ لے گئے۔ مَیں نے کہا 'میں بھی چلوں؟' فرمایا کہ "نہیں۔" جب لشکر میرٹھ سے دلّی میں آیا، موافق اپنے دستور کے، روز ورودِ لشکر مخیّم میں گیا۔ میر منشی صاحب سے ملا۔ اُن کے خیمے میں سے اپنے نام کا کٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہ باغی کی خوشامد کیا کرتے تھے، اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں۔ مَیں گدائے مبرم۔ اِس حکم پر ممنوع نہ ہوا۔ جب لارڈ صاحب بہادر کلکتہ پہنچے۔ مَیں نے قصیدہ حسبِ معمول قدیم بھیج دیا، مع اس حکم کے واپس آیا کہ اب یہ چیزیں ہمارے پاس نہ بھیجا کرو۔ مَیں مایوس ہو کر بیٹھ رہا اور حکّام شہر سے ملنا ترک کیا ــــــ"

(خواجہ غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۳ء)

"دربار لارڈ صاحب کا میرٹھ میں ہُوا۔ دِلّی کے علاقے کے جاگیردار، بموجب حُکم کمشنر دہلی، میرٹھ گئے۔ موافق دستورِ قدیم مل آئے۔ غرض کہ پنجشنبہ ۲۹۔ دسمبر کو پہر دن چڑھے لارڈ صاحب یہاں پہنچے۔ کابلی دروازہ کی فصیل کے تلے ڈیرے ہُوئے۔ اُسی وقت توپوں کی آواز سُنتے ہی مَیں سوار ہو کر گیا، میر مُنشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر کو خبر کروائی۔ جواب آیا کہ فرصت نہیں، یہ جواب سُن کر نومیدی کی پوٹ باندھ کر لے آیا ــــــ"

(مجروح، یکم جنوری ۶۰)

"پرسوں (پنجشنبہ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۹ء) پہر دن چڑھے لارڈ صاحب کا لشکر آیا۔ کابلی دروازے کی فصیل کے قریب، مبولوشاہ کی قبر کے سامنے، خیمۂ خاصہ برپا ہوا اور باقی لشکر تیس ہزاری؛ ع تمہ اُترا ہے۔ (میں) ... لشکر کو گیا۔ میر منشی سے ملا۔ اُن کے خیمے میں بیٹھ کر صاحب سکرتر بہادر کو اطلاع کروائی۔ چپراسی کے ساتھ کو بھی گیا۔ جواب آیا کہ ہمارا سلام دو اور کہو فرصت نہیں ہے۔ خیر میں اپنے گھر آیا۔ کل پھر گیا، خبر کروائی، حکم ہوا کہ غدر کے زمانے میں تم باغیوں کی خوشامد کرتے رہتے تھے، اب ہم سے ملا کیوں مانگتے ہو؟ عالم نظر میں تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ جواب پیام نومیدی جاوید ہے۔ نہ دربار، نہ خلعت، نہ پنشن۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

(حسین میرزا، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"سنو داستان: صاحب کمشنر بہادر دہلی یعنی جناب سانڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا۔ پنجشنبہ ۲۴۔ فروری کو میں گیا۔ صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اُلٹا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵۔ فروری کو گیا، ملاقات ہوئی، کرسی دی۔ بعد پرسشِ مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اُٹھا کر پڑھتے رہے، جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے میکلوڈ صاحب، حاکم اکبر صدر بورڈ پنجاب کا۔ تمہارے باب میں لکھتے ہیں کہ ان کا حال دریافت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ معظمہ سے خلعت کیا مانگتے ہو؟ حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا، وہ پڑھوا دیا۔ پھر پوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے؟ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا: "ایک میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے اور ایک ہم کو دو"۔ میں نے عرض کیا: "کل حاضر کروں گا"۔ پھر پنشن کا حال پوچھا، وہ گزارش کیا۔ اپنے گھر آیا اور خوش آیا ——

دیکھو میر مہدی، حاکم پنجاب کو مقدمۂ ولایت کی کیا خبر؟ کتابوں سے کیا اطلاع؟ پنشن کی پرسش سے کیا مدعا؟ یہ استفسار بحکم نواب گورنر جنرل بہادر ہوا ہے۔ یہ صورت مقدمہ فتح و فیروزی ہے۔ غرض کہ دوسرے دن یک شنبہ یوم تعطیل تھا، میں اپنے گھر رہا۔ دو شنبہ ۲۸ فروری کو گیا۔ باہر کے کمرے میں بیٹھ کر اطلاع کروائی۔ کہا: "اچھا توقف کرو"۔ بعد تھوڑی دیر کے ... باہر نکلے میں نے کہا: "وہ کتابیں حاضر ہیں"۔ کہا: "منشی جیون لال کو دے جاؤ ——" ... سہ شنبہ یکم مارچ کو پھر گیا، بہت التفات اور اختلاط سے باتیں کرتے رہے۔ کچھ سرٹیفکیٹ گورنروں کے ساتھ لے گیا تھا، وہ دکھائے۔ ایک خط میکلوڈ صاحب بہادر کے نام کا لے گیا تھا، وہ بکر

یہ استدعا کی کہ کتاب کے ساتھ یہ بھی بھیجا جائے۔ "بہت اچھا" کہہ کر رکھ لیا۔ پھر مجھ سے کہا کہ ہم نے تمہاری پنشن کے باب میں اجرٹن صاحب بہادر (مجسٹریٹ دہلی) کو کچھ لکھا ہے، تم اُن سے ملو۔ عرض کیا "بہتر"۔ اجرٹن صاحب بہادر ... گئے ہوئے تھے، کل وہ آ گئے۔ آج مَیں نے اُن کو خط لکھا ہے۔ جیسا وہ حکم دیں گے، اُس کے موافق کروں گا۔ جب بُلائیں گے، تب جاؤں گا۔

دیکھو سید، اسد اللہ الغالب علیہ السلام کی مدد کو، کہ اپنے غلام کو کس طرح سے بچایا۔ بائیس مہینے تک بھوکا پیاسا بھی نہ رہنے دیا۔ پھر کس ڈھب سے کہ وہ آج سلطنت کا دہندہ ہے، میرے تفقد کا حکم بھجوایا۔ حکام سے مجھ کو عزت دلوائی۔ میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اُسی کا بخشا ہوا تھا۔ مَیں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا؟"

(مجروح، مارچ ۱۸۵۹ء)

"راہ و رسم مراسلت، حکام عالی مقام سے بدستور جاری ہو گئی ہے"

(چودھری عبدالغفور سرور، اپریل ۱۸۶۰ء)

"دلّی کے سب پنشن داروں کو مئی ۱۸۵۷ء سے پنشن نہیں ملا۔ یہ فروری ۱۸۵۹ء بائیسواں مہینہ ہے۔ چند اشخاص کو بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بطریق مددِ خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپے کے باب میں اور آیندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ حکم نہیں ہوا ... علی بخش خاںؔ[1] پچاس روپے مہینہ پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو روپے ہوتے ہیں، ان کو چھ سو روپیہ مل گیا، باقی روپیہ چڑھا رہا، آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاںؔ[2] سو روپیہ مہینے کا پنشن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو روپے ہوتے ہیں، اس کو بارہ سو روپے ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں، اس کو اٹھارہ سو روپے ملے۔ مناجاعہ دار دس روپے کا سکو لبر، سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو مددِ خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط پر خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے

---

[1] علی بخش خاں، بن الٰہی بخش خاں معروف، میرزا غالب کے برادرِ نسبتی۔
[2] غلام حسن خاں محو، بن غلام حسین خاں مسرور، جو غالب کے ہم زلف تھے۔

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب جلد ۱، ص ۳۵۳)

ے حکم دیا کہ سائل کو بطریق مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔ میں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپے ہوتے ہیں۔ سب پنسن والوں کو سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھ بھی سال بھر کا روپیہ مل جاتے، ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا —۔"

(میر مہدی مجروح ، فروری ۱۸۵۹ء)

"میرے پنسن اور ولایت کے انعام کا حال کما حقہٗ سمجھ لو۔ ولالرحمٰن الطاف خفیہ۔ ایک خاص طرز پر تحریک ہوئی۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکمِ پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کے پنسن کے چڑھے ہوئے روپے یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر، اپنی منظوری لکھ کر، ہمارے پاس بھیج دو تاکہ ہم منظوری دے کر تمہارے پاس بھیج دیں۔ سو اُس کی تعمیل بطرزِ مناسب یہاں ہوگی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب روپیہ مل جائے گا اور ہاں، صاحب کمشنر بہادر نے یہ بھی کہا کہ اگر تم کو روپیے کی ضرورت ہو تو سو روپے خزانے سے منگوا لو۔ میں نے کہا: صاحب، یہ کیسی بات ہے کہ اوروں کو برس دن کا روپیہ ملا اور مجھے سو روپے دلواتے ہو؟ فرمایا کہ اب چند روز میں سب روپیہ اور اجراء کا حکم مل جائے گا، اوروں کو یہ بات برسوں میں میسر آئے گی۔ میں چپ ہو رہا۔ آج دوشنبہ یکم شعبان اور ہفتم مارچ ہے، دوپہر ہو جائے تو اپنا آدمی مع رسید بھیج کر سو روپے منگا لوں۔ پر، یار، ولایت کے انعام کی توقع خدا ہی سے ہے۔ حکم تو، اسی حکم کے ساتھ اُس کی رپورٹ کرنے کا بھی آیا ہے، مگر یہ بھی حکم ہے کہ اپنی رائے لکھو۔ اب دیکھیے، یہ دو حاکم یعنی حاکم دہلی اور حاکم پنجاب، اپنی رائے کیا لکھتے ہیں۔ پنجاب کے گورنر بہادر کا یہ بھی حکم ہے کہ "دستنبو" منگا کر اور تم دیکھ کر ہم کو لکھو کہ وہ کیسی ہے اور اس میں کیا لکھا ہے؟ چنانچہ حاکم دہلی نے کتاب یہی کہہ کر مجھ سے مانگی اور میں نے دی۔ اب دیکھو، حاکم پنجاب کیا لکھتا ہے؟"

(میر مہدی مجروح ، ۷، مارچ ۱۸۵۹ء)

"پنسن جاری ہو گیا۔ تین برس کا چڑھا ہوا روپیہ مل گیا۔ بعد ادائے قرض ستاسی روپے گیارہ آنے بچے۔ اب ماہ بماہ روپیہ ملتا ہے، مگر یہی تین مہینے ستمبر، اکتوبر، نومبر ملیں گے۔ دسمبر ۱۸۶۰ء سے تنخواہ ششماہی ہو جائے گی۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ چار روپے سیکڑا سالانہ عموماً وضع ہوا کرے گا۔ اِس

سے میرے حصے میں ڈھائی روپیہ مہینہ آیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے کے ساٹھ رہیں گے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"صاحب! میری داستان سُنیے۔ پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرِ مجتمعہ سہ سالہ یکشت مل گیا۔ بعد اَدائے حقوق چار سو روپے دینے باقی رہے اور ساسی روپے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینہ بدستور ملا۔ آخر جون میں حکم ہو گیا کہ پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں، ماہ بماہ پنشن تقسیم نہ ہوا کرے۔"

(علائی، ۸۔ جولائی ۱۸۶۰ء)

"اب میری کہانی سُنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن داران قدیم ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بطریقِ ششماہہ، فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رامپور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سُود چھ مہینے تک اسی طرح گنوان دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی۔"

(تفتہ، ۲۰۔ جولائی ۱۸۶۰ء)

"تنخواہ کی سنو۔ دو برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوتے۔ سو (روپے) مدد خرچ کے جو پائے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات میں اُٹھ گئے۔ مختار کار، دو ہزار لایا۔ چونکہ میں اس کا قرضدار ہوں، روپے اُس نے اپنے گھر میں رکھے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ حساب کیا، سود مول سات کم پندرہ سو روپے ہوتے۔ میں نے کہا، میرے قرضِ متفرق کا حساب کر۔ کچھ اوپر گیارہ سو نکلے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ گیارہ سو روپیہ بانٹ دے، نو سو بچے، آدھے تو لے، آدھے مجھے دے۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو مجھ کو دو، پانچ سو سات تم لو، یہ جھگڑا مٹ جائے گا، تب کچھ ہاتھ آئے گا۔ خزانے سے روپیہ آگیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں۔ بات رہ گئی، پت رہ گئی۔ حاسدوں کو موت آگئی۔ دوست شاد ہو گئے۔ میں جیسا ننگا بھوکا ہوں، جب تک جیوں گا، ایسا ہی رہوں گا۔ میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللہی ہے۔ اِن پیسوں کا ہاتھ آنا عطیۂ ید اللہی ہے۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنشن پانے کا مستحق نہیں، حاکم صدر مجھ کو پنشن دلوائے اور پورا دلوائے۔"

(مجروح، مئی ۱۸۶۰ء)

"بعد غدر، بجرمِ مصاحبتِ بہادر شاہ، دربار و خلعت دونوں بند ہو گئے۔ میری برأت کی درخواست گزری، تحقیقات ہوتی رہی، تین برس کے بعد پنسن چھٹا ــــــ"

(حبیب اللہ ذکا، ۱۵۔ فروری ۱۸۶۷ء)

"غدر کے رفع ہونے اور دلی کے فتح ہونے کے (تین برس) بعد میرا پنسن کُھلا۔ چڑھا ہُوا روپیہ دام دام ملا۔ آئندہ کے لیے بے کم و کاست جاری ہوا۔ مگر لاٹ صاحب کا دربار و خلعت جو معمولی و مقرری تھا، مسدود ہو گیا۔ یہاں تک کہ صاحب سکرتر بھی مجھ سے نہ ملے اور کہلا بھیجا کہ اب گورنمنٹ کو تم سے ملاقات کبھی منظور نہیں۔ میں فقیر متکبر، مایوس دائمی ہو کر اپنے گھر بیٹھ رہا اور حکامِ شہر سے بھی ملنا موقوف کر دیا ــــــ" (شیو نرائن آرام، ۱۸۶۳ء)

"اب میرا حال سنو:

در نومیدی بسے اُمید است

پایانِ شبِ سیہ سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر، خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ نااُمید ہو کر بیٹھ رہا اور مُدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انہوں نے مجھ کو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلی میں دربار نہ کریں گے۔ میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں ان اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا، تم بھی انبالے جاؤ، شریک ہو کر خلعتِ معمولی لے آؤ۔ بھائی! کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری؟ گویا مُردہ جی اُٹھا ــــــ"

(تفتہ، ۴۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"بڑے لاٹ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آ گئے۔ دربار کیا۔ خیر، کرو، مجھ کو کیا۔ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا اور کہا نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ (بیماری کی وجہ سے) ... اُٹھنا دشوار ہے ... بہ ہر حال سوار ہوا، گیا۔ پہلے صاحب سکرتر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ تصور میں کیا، بلکہ تمنا میں بھی جو

بت تھی، وہ حاصل ہوئی۔ یعنی عنایت سی عنایت۔ اخلاق سے اخلاق۔ وقتِ رخصت خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور مژدہ دیتے ہیں کہ لارڈ صاحب کے دربار میں بھی تیرا نمبر اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن (بیماری کا) حال عرض کیا گیا۔ فرمایا خیر۔ اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔ اس بکھیڑے کا بُرا ہو۔ انبالے نہ جا سکا ——"

(شیو نرائن آرام، ۱۸۶۳ء)

"نواب لفٹنٹ گورنر جنرل منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے، توجہ کرتا رہا۔ بہت عنایت فرمائی۔ ایک شالی رومال سوزنی کا اور ایک گوشہ بند سوزنی کار اور ایک الوان کی فرد چار گزی، یہ تین کپڑے مجھ کو دیے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے۔ مگر میری جان اُلجھی ہوئی ہے، لارڈ صاحب کے دربار و خلعت میں۔ فرمایا: "اچھا، اچھا" دوسرے دن لارڈ صاحب آئے ---- تیسرے دن لفٹنٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا۔ پھر میں نے عرض کیا کہ میں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اسلوری کے سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید تین رقم ہمیشہ پایا کیا۔ اب یہ، اور دربار اور خلعت بند ہے۔ اِس کا مجھ کو بڑا غم ہے، فرمایا کہ غم نہ کرو۔ تمہارا دربار اور خلعت کھل گیا، انبالے جاؤ گے تو دربار و خلعت پاؤ گے۔ میں نے اپنا ہاتھ دکھایا کہ حضرت! بوڑھا ہوں اور زخمی ہو گیا ہوں۔ انبالہ کس طرح جاؤں گا؟ ---- خیر آئندہ دربار میں پاؤ گے ---- مولوی اظہار حسین خاں میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمہارے دربار و خلعت کے واگزاشت کا حکم دے کر کلکتہ سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں ——"

(میرزا عباس بیگ، ۱۲۔ مئی ۱۸۶۳ء)

"اوا خرماہِ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۳ء میں نواب لفٹنٹ گورنر پنجاب دلّی آئے۔ اہالی شہر، صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر و صاحب کمشنر بہادر کے پاس دوڑے اور اپنے نام لکھوا لئے۔ میں تو بیگانہ محض اور مُطرد و حکام تھا۔ جگہ سے نہ ہلا، کسی سے نہ ملا۔ دربار ہُوا، ہر ایک کامگار ہُوا۔ شنبہ ۸۔ فروری کو آزادانہ منشی من پھول سنگھ صاحب کے خیمے میں چلا گیا۔ اپنے نام کا ٹکٹ صاحب سکرتر بہادر کے پاس بھیجا، بُلایا گیا۔ مہربان پاکر نواب صاحب کی ملازمت کی استدعا کی، وہ بھی حاصل ہوئی۔ وہ حاکم جلیل القدر کی وہ عنایتیں دیکھیں، جو میرے تصور میں بھی نہ تھیں —— میر مُنشی لفٹنٹ گورنر سے سابقۂ تعارف نہ تھا، وہ بطریق حُسنِ طلب میرے خواہاں ہوئے تو میں گیا[1] جب حکام پہ مُجرد

---

[1] صفحہ ۱۳۸ پر ملاحظہ کیجیے:

استدعا مجھ سے بے تکلف ہے، تو میں قیاس کر سکتا ہوں کہ میر منشی کی حُسنِ طلب بہ ایمائے حکام ہو گی۔ ولالرحمان الطاف خفیہ — بقیہ رُوداد یہ ہے کہ دوشنبہ دوم مارچ کو سوادِ شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خان بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیّرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذ، انگریزی و فارسی دیکھے اور باجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت یہ امر کس اصل پر متفرع ہوا؟ فرمایا کہ ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ یہ حکم دفتر میں لکھوا کر چودہ یا پندرہ دن بعد ادھر کو روانہ ہوتے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔

کارساز ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

سہ شنبہ ۳۔ مارچ کو بارہ بجے لفٹنٹ گورنر نے مجھ کو بُلایا، خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ لارڈ صاحب بہادر کے ہاں کا دربار اور خلعت بھی بحال ہے۔ انبالہ جاؤ گے تو دربار اور خلعت پاؤ گے۔ عرض کیا گیا، "معشوق کے قدم دیکھے، خلعت پایا۔ لارڈ صاحب کا حکم سُن لیا، نہال ہو گیا۔ اب انبالے کہاں جاؤں؟ جیتا رہا تو اوّد دربار میں کامیاب ہو رہوں گا":

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرد مختصر گیرید

(غلام غوث بے خبر، مارچ ۱۸۶۳ء)

"غدر سے پہلے ہر دربار میں خلعت پاتا تھا۔ بعد غدر، دربار اور خلعت اور ملاقات سکرتروں کی، یہ سب موقوف۔ اب جو لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، تو انہوں نے خود مجھے بُلا بھیجا اور خلعت دیا اور فرمایا کہ یہ ہم اپنی طرف سے ازراہِ محبت دیتے ہیں اور یہ نوید علاوہ کہ گورنر جنرل بہادر کے ہاں بھی

صفحہ ۱۳۶ سے آ "کسی ذریعے سے میرزا غالب کو اطلاع پہنچی ہو گی کہ میر منشی ملاقات کے خواہاں ہیں۔ اسی بنا پر میرزا، لفٹنٹ گورنر پنجاب کی خیمہ گاہ میں پہنچے اور منشی من پھول سنگھ سے ملے۔"
(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، ص ۳۱۴)

اور خلعت کھُل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو پاؤ گے۔ مَیں انبالے نہ جا سکا۔ بالفعل نواب گورنر کے خلعت پر قناعت کی۔ اُس خلعت کو بشرطِ حیات اور وقت پر موقوف رکھا ـــــ"

(میر سرفراز حسین، ۲۷۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"ماجرا یہ ہے کہ مَیں ہمیشہ نواب گورنر جنرل بہادر کے دربار میں سیدھی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت پاتا تھا۔ غدر کے بعد پنسن جاری ہو گیا، لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اہلِ دفتر نے بموجب حکم مجھ کو اطلاع دی کہ تمہارا دربار اور خلعت واگذاشت ہو گیا، مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ مَیں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمروِ پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا۔ مَیں دربار میں نہ گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا ـــــ"

(قدر بلگرامی، ۱۸۶۳ء)

"منگل ۳۔ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا اور فرمایا کہ "ہم تمہیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا ـــــ" مَیں نے عرض کیا کہ "مَیں انبالے جاؤں؟" فرمایا: "البتہ جانا ہوگا ـــــ"

(نواب یوسف علی خاں، ۱۶۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت، اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا غار ہو گیا ہے ـــــ"

(تفتہ، ۴۔ مارچ ۱۸۶۳ء)

"واگذاشت کا حکم سُنتا ہوں کہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس تحریر اس حکم کی بھی ابھی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی، یعنی نہ میں دربار میں گیا، نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور امر ہے، یہ اور بات ہے۔ اس امر اور اس بات سے، اُس کو ہرگز علاقہ نہیں۔ اَب مَیں نے ۔۔۔۔ چیف سکرتر کو فارسی میں خط بھیجا ہے ۔۔۔۔ جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستور

جاری ہیں ؛ دربار، خلعت، خط۔ بعد غدر کے تینوں دستور بند ہو گئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگذاشت کی خبر سُن کر سکرتر صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب آنے پر دل جمعی کا مدار ہے ——"

(میرزا عباس بیگ ، ۱۲۔ مئی ۱۸۶۳ء)

"جب انبالے میرا جانا نہ ہوا تو مَیں نے قصیدۂ مدح جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا بہ طریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مُراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نوابِ معلّی القاب کی نظر سے گزرانیں اور یہ دستورِ قدیم تھا کہ جب مَیں قصیدہ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بے واسطۂ حکّام تحت مجھ کو آجاتا —— اب جو مَیں نے موافقِ معمول، قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا۔ صدائی بَرنخواست۔ نااُمید ہو کر بیٹھ رہا، بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسمِ تحریرِ خطوط نہ رہی تو دربار اور خلعت کہاں ؟ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرتر بہادر کا خط ڈاک میں آیا، وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔"

(نواب محمد یوسف علی خاں ، ۴۔ اگست ۱۸۶۳ء)

"پیش از غدر گورمنٹ کے دربار میں سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھ کو ملتی تھیں۔ بعدِ غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل بارہ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباریوں کو پہنچ گیا تھا۔ مَیں نواب مہدی علی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہو گی، ایک رباعی کا غذ مذہب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ عنایت سن کر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم[1]۔ بارے بروقتِ ملاقات، تعظیمِ معمولی اور مصافحہ کر کے لارڈ صاحب نے

---

[1] "میرزا صاحب کے اس بیان سے کہ نہ تو کمشنر کو علم تھا کہ اسداللہ خاں کو خلعت ملے گا اور نہ مجھے اس کا خیال گزرتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اب تک خلعت بحال نہیں ہوا تھا، صرف شرکتِ دربار کی اجازت ملی تھی، ورنہ گورنر خلعت دیتے وقت کیوں کہتا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ اس کے شکریے میں مرزا صاحب نے جو قطعہ لکھا۔ اُس کا ایک شعر (یہ) ہے :

چو بے طلب بمن اینہا رسیدہ است، بود
ز بہر مطلبِ خویشم ترقعِ امضا !

باقی صفحہ ۱۴۱ پر دیکھیے

طرے کمڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا اور فرمایا کہ یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔ مالائے مروارید منشی نے گلے میں ڈال دی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے، دوشالا، ایک کمخواب کا تھان، ایک بنارسی تھان سنہری بوٹے، ایک بنارسی سیلا، ایک الوان کی چادر کلابتون، ایک کناویز کا تھان، ایک الوان کی چادر بے کنارہ، ایک ——— "

(نواب کلب علی خاں، ۱۸۔ دسمبر ۱۸۶۶ء)

"دلّی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلّی کہاں؟ ہاں، کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا ——— "

(مجروح، ۲۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"مرزا تم بڑے بے درد ہو۔ دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا، بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں صحاف اور نقاش کہاں؟ ——— "

(تفتہ، ۳۔ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے۔ ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم --- مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے کہ جس میں، میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک

(صفحہ ۱۴۰ سے آگے) اُس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ مرزا صاحب خلعت سے مایوس تھے، ورنہ بے طلب فی تیدکیوں بگڑتے۔ لیکن وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ۱۸۶۳ء میں منٹگمری صاحب نے بُلا کر خلعت دیا، تو کہا کہ "ہم تمہیں مژدہ دیتے ہیں۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا" ——— اس صورت میں یہ بھی فیصلہ کرنا پڑے گا، کہ انہوں نے کسی مصلحت سے اُس وقت یہ بات مشہور کر دی تھی۔ "

مولانا امتیاز علی عرشی، حواشی مکاتیب غالب، طبع چہارم، ص ۱۸۱)

کیمپ ہے ــــــ" (علائی ، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"اللہ اللہ ، دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے ، حُسنِ اعتقاد ! ارے بندۂ خدا ، اُردو بازار نہ رہا، اُردو کہاں ؟ دِلّی ، واللہ اب شہر نہیں ہے ، کیمپ ہے ، چھاؤنی ہے ۔ نہ قلعہ ، نہ شہر ، نہ بازار ، نہ نہر ــــــ"

(مجروح ، ۱۸۶۰ء)

"مَیں تم کو لکھ چکا ہوں کہ دِلّی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آکر کیا کرو گے ؟"

(تفتہ ، ۳۱۔ جنوری ۱۸۵۸ء)

"یہ شہر ، اب شہر نہیں ، قہر ہے ــــــ" (غلام بخت خاں (؟) ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء)

"یہاں سے باہر اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا ابھی دیکھا چاہیے مُسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں ــــــ"

(تفتہ ، ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"تم کہتے ہو کہ آیا چاہتا ہوں ، اگر آؤ تو بے ٹکٹ کے نہ آنا ــــــ"

(مجروح ، ۷۔ فروری ۱۸۵۸ء)

"مُسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا ــــــ"

(تفتہ ، ۵۔ مارچ ۱۸۵۸ء)

"اب اہلِ دہلی ہندو ہیں یا اہلِ حرفہ ہیں یا خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ــــــ"

(مجروح ، ماقبل ۱۸۶۱ء)

" - - - ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش۔ نہ سخنوری رہی، نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی؟ ہائے دلّی! وائے دلّی! بھاڑ میں جائے دلّی ـــــ"

(مجروح، ۲۳- مئی ۱۸۶۱ء)

" واب دہلی میں، مسلمان: اہل حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ (ظفر) کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیر زن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں، کسبیاں ـــ"

(علائی، ۱۶ جنوری ۱۸۶۲ء)

"ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا؟"

(مہر، اوائل ۱۸۵۸ء)

"بھائی، لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری میں ایسا امن و امان ہوگا، نہ اِس فتنہ و فساد سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا۔ اُمرا اور شرفا کی حکام سے مُلاقاتیں، بقدر رُتبہ تعظیم و توقیر، پنسن کی تقسیم علی العموم، آبادی کا حکم عام۔ لوگوں کو کمال مُلاطفت اور نرمی سے آباد کرتے جاتے ہیں۔ اور ایک نقل سُنو: وہاں کے صاحب کمشنر بہادر اعظم نے جو دیکھا کہ عملے میں ہنود بھرے ہوئے ہیں، اہلِ اسلام نہیں، ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور اُن کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرتی کیا۔ یہ آفت تو دِلّی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔ لکھنؤ کے سوا اور شہروں میں عملداری کی وہ صورت ہے جو غدر سے پہلے تھی ـــ"

(مجروح، فروری ۱۸۵۹ء)

"لکھنؤ کا کیا کہنا! وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی جو بے سر و پا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔ اُس باغ کی یہ فصلِ خزاں ـــ!"

(سیاح، ۳۰- جون ۱۸۶۰ء)

"رفعِ فتنہ و فساد اور بلاد میں مُسلّم۔ یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے، یہ داغ اُن کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا ۔۔۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۹ء)

"دلّی کے اُمراء خصوصاً اُمرائے شاہی، ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔"
(یوسف میرزا ، ۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء)

"دلّی۔ اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کیمپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے اُمراء، نہ اطرافِ شہر کے روسا۔"
(نواب یوسف علی خاں، ۲۶۔ دسمبر ۱۸۶۳ء)

"یہ شہر بہت غلبت زدہ ہے نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ ۔۔۔"

(جنوں ، ۲۲۔ فروری ۱۸۶۱ء)

"نہ کہیں جانے کا ٹھکانہ، نہ کوئی میرے پاس آنے والا ۔۔۔"

(یوسف میرزا ، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں، جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔"
(تفتہ، ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"میرن صاحب! کیوں شہر سے باہر ٹھہریں اور کیوں کسی کے بلانے کی راہ دیکھیں؟ شکرم میں، کرانچی میں، چوپہیے میں، یعنی ڈاک میں آئیں۔ بلّی ماروں کے محلّے میں میرے مکان پر اُتر پڑیں ... ڈاک کو زنہار کوئی نہیں روکتا ۔۔۔"
(مجروح ، مئی ۱۸۵۸ء)

"ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں میرے مکان تک آجاتے تو ممکن تھا، مگر رہنا شہر میں بے حصول

اجازتِ حاکم احتمال ضرور رکھتا ہے۔ اگر خبر نہ ہو تو نہ ہو، اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباحت ہے ___"
(چودھری عبدالغفور سرور، موسم گرما ۱۸۵۸ء)

"کہو، کوئی طرح شہر میں تمہارے آنے کی ٹھہری یا نہیں؟ بُعد تیس کوس اور آدھ کوس برابر ہے۔ میری جان، تم ہنوز وہ جانے میں ہو۔ مجھ کو تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں ہونا، بے اجازت سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ نہیں، پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؟ شہر میں تم ہوتے تو جرأت کر کے تمہارے پاس چلا آتا ___"
(غلام نجف خاں، جولائی ۱۸۵۸ء)

"آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو (میرٹھ سے) آتے ہوئے نواں دن ہے ۔۔۔۔؛

روز اِس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اُس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔"
(مجروح، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا: بھائی، تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ: اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب بہادر کے زبانی حکم پر، اس کی اقامت کا مدار ہے اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدار نے محلے کے نقشے کے ساتھ کوتوالی بھیج دی۔"
(مجروح، ۰، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"واللہ، ڈھونڈے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ، اگر کچھ ہیں تو

باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں ــــــ"

(تفتہ ، ۵۔ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"شہر کی آبادی کا حکم، خاص و عام کچھ نہیں۔ پنشن داروں سے حاکموں کا کام کچھ نہیں ۔۔۔۔۔۔ خلق نے از روئے قیاس، جیسا کہ دلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے، یہ بات اُڑا دی، سو سارے شہر میں مشہور ہے کہ جنوری ۱۸۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کیے جائیں گے اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیے جائیں گے۔ خیر، آج بدھ کا دن ۲۲۔ دسمبر کی ہے۔ اب کے شنبے کو "بڑا دن" اور اگلے شنبے کو جنوری کا پہلا دن ہے، اگر جیتے ہیں تو دیکھ لیں گے کہ کیا ہوا ــــــ"

(مجروح ، ۲۲۔ دسمبر ۱۸۵۸ء)

"اب یہاں (آبادی کے) ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے۔ فارسی عبارت یہ ہے:
"ٹکٹ آبادی در درون شہر دہلی بشرطِ ادخال جُرمانہ"
مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر ہے۔ آج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا ہے۔ کل اتوار یوم التعطیل ہے۔ پرسوں دوشنبہ سے دیکھیے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں۔؟"

(مجروح ، فروری ۱۸۵۹ء)

"(آبادی کے) پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے، اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر کے بسنے کی کون صورت ہے؟ جو رہتے ہیں، وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔"

(مجروح ، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ، شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں، انہیں ڈھا دو اور آیندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔" (مجروح ، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"آبادی یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر ایڈمنسٹن صاحب بہادر (مجسٹریٹ دہلی) بطریق ڈاک کلکتہ چلے گئے۔ دلی کے حقدار جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منہ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہوگی یا کوئی اور نئی صورت نکل آئے ــــ"

(مجروح ، فروری ۱۸۵۹ء)

"اہلِ شہر کی آبادی مسکن، یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے۔ اور جگہ سیاست ہے کہ منجملہ ضروریاتِ ریاست ہے۔ یہاں قہرِ الٰہی ہے کہ منشا رتباہی ہے۔"

(انور الدولہ شفق، نہم مارچ ۱۸۵۹ء)

"دلی کا حال تو یہ ہے:

گھر میں تھا کیا جو ترا غم اسے غارت کرتا
وُہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

یہاں دھرا کیا ہے جو کوئی لوٹے گا۔ وُہ خبر محض غلط ہے۔ اگر کچھ ہے تو بدیں نمط ہے کہ چند روز گوروں نے اہل بازار کو ستایا تھا، اہل قلم اور اہل فوج نے بہ اتفاق ہمدگر ایسا بندوبست کیا کہ وہ فساد مٹ گیا، اب امن وامان ہے ــــ"

(مہر ، ۱۸۵۹ء)

"آبادی کا آوازہ پھر فرو ہے۔ لاہوری دروازے کے علاقے میں کچھ کم سو گھر آباد ہوتے ہیں۔ کئی ہزار کی بستی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ دو چار برس میں وہ علاقہ آباد ہو جائے گا اور جب وہ علاقہ آباد ہو جائے گا تو دوسرا علاقہ شروع ہوگا۔ گھبراؤ نہیں، جلدی کیا ہے۔"

(حسین میرزا ، ۱۸۔ جون ۱۸۵۹ء)

"آمد و رفت کا ٹکٹ موقوف ہوگیا۔ فقیر، اور ہتھیار جس پاس ہو، وہ نہ آئے اور باقی ہندو، مسلمان، عورت، مرد، سوار، پیادہ، جو چاہے چلا آئے، چلا جائے۔ مگر بغیر آبادی کے ٹکٹ کے رات کو رہنے نہ پائے۔"
(یوسف میرزا ، ۱۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

"شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرائے کے مکان ملنے لگے۔ چار پانسو گھر آباد ہوئے تھے کہ پھر وہ قاعدہ مٹ گیا۔ خدا جانے کیا دستور جاری ہوا ہے، آئندہ کیا ہوگا۔۔۔؟"

(مجروح ، ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۵۹ء)

"آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا اژدحام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں، کرایہ دار نہ رہیں، پرسوں سے حکم ہوگیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ سے کرائے کے مکان میں رہتے تھے، وہ بھی آرہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں۔"

(حسین میرزا ، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"مسلمان کی املاک کی واگذاشت کا حکم عام ہوگیا ہے۔ جن کو کراتے پڑ ملی ہے، ان کو کرایہ معاف ہو گیا ہے۔۔۔"

(مجروح ، یکم جنوری ۱۸۶۰ء)

"شہر کی عمارت جو سڑک میں نہیں آئی اور برسات میں ڈھے نہیں گئی، وہ سب خالی پڑی ہے، کرایہ دار کا نام نہیں۔۔۔"

(یوسف میرزا ، ۲۰۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"مکانات کے گرنے کا حال یہ ہے کہ چار پانچ برس ضبط رہے۔ ینمائی (لٹیرے)، لوگ، کڑی، تختے، کواڑ، چوکھٹ، بعض مکانات کی چھت کا مسالہ، سب لے گئے۔ اب ان غربا کو وہ مکان ملے تو ان میں مرمت کا مقدور کہاں؟ فرمائیے مکانات کیوں کر نہ گریں؟"

(انورالدولہ شفق ، ۱۱۔ اگست ۱۸۶۲ء)

"حضرت! انہدام مساکن و مساجد کا حال کیا گزارش کروں؟ بانیِ شہر کو وہ اہتمام مکانات کے بنانے میں نہ ہوگا، جو اب والیانِ ملک کو ڈھانے میں ہے۔ اللہ، اللہ! قلعہ میں اکثر اور شہر میں بعض بعض وہ شاہجہانی عمارتیں ڈھائی گئی ہیں کہ کدال ٹوٹ ٹوٹ گئے ہیں بلکہ قلعے میں تو ان آلات سے کام نہ نکلا، سرنگیں کھودی گئیں اور بارود بچھائی گئی اور مکانات سنگیں اڑا دیے گئے۔۔۔"

(انورالدولہ شفق ، ۲۴۔ اگست ۱۸۶۰ء)

"آغا باقر کا امام باڑہ، اس سے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے، ایک بنائے قدیم رفیع مشہور، اس کے انہدام کا غم کس کو نہ ہوگا؟"

(یوسف میرزا، ۲۶۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"مسجد جامع کے باب میں کچھ پرسشیں لاہور سے آئی تھیں، یہاں سے ان کے جواب گئے ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار کا حکم آئے اور مسلمانوں کو مل جائے۔ ہنوز بدستور پہرا بیٹھا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔"

(سیّاح، ۲۔ مئی ۱۸۶۲ء)

"مسجد جامع کی واگذاشت کی خبر مشہور ہے[1]۔ اگر سچ ہو جائے تو کیا دور ہے۔ شاہِ اودھ کی املاک بھی واگذاشت کی خبر مشہور ہے[2] ———"

(مجروح، ۲۰۔ نومبر ۱۸۶۲ء)

"مسجد جامع واگذاشت ہو گئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنا لیں۔ انڈا، مرغی، کبوتر بکنے لگا ہے۔ عشرہ مبشرہ یعنی دس آدمی مہتمم ٹھہرے: مرزا الٰہی بخش، مولوی صدر الدین، تفضل حسین خاں تین یہ، سات اور ———"

(مجروح، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۶۲ء)

"کیسی صاحبزادوں کی سی بات کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو، جیسی آگے تھی؟ قاسم جان کی گلی،

---

[1] "۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے جامع شاہجہانی پر بھی قبضہ کر لیا تھا کیوں کہ وہاں سے بھی نمازیوں کے ایک گروہ نے انگریزوں پر شدید حملہ کیا تھا۔ بعض انگریزوں کی یہ تجویز تھی کہ مسجد ڈھا دی جائے، بعض کہتے تھے کہ اسے گرجے میں تبدیل کر دیا جائے۔ کئی سال کے بعد انگریزوں نے اسے واگزار کر دیا اور انتظام کے لیے ایک کمیٹی بنا دی جس میں انگریز اپنے معتمد علیہ مسلمانوں کو نامزد کرتے ———"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اول، لاہور ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۴۴)

[2] "یعنی شاہِ اودھ کی وہ املاک جو دہلی میں تھیں، ان کے لیے اودھ سے خاص منتظم مقرر ہو کر دہلی آتا تھا۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً)

میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں، اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء اللہ خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی مع قبائل و عشائر لوہارو ہیں۔ لال کنویں کے محلے میں خاک اُڑتی ہے ۔۔۔ لکھمی کی دُکان پر کتے لوٹتے ہیں۔"

(مولوی عزیز الدین ، ۱۸۵۸ء)

"یہاں شہر ڈھے رہا ہے۔ بڑے بڑے نامی بازار: خاص بازار اور اُردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا، اب پتا بھی نہیں کہ کہاں تھے؟ صاحبانِ امکنہ و دکاکین نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی؟"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰)

"جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ (دارالبقاء فنا ہو جائے گی، رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا، دونوں طرف سے پھاوڑہ چل رہا ہے ـــــ"

(مجروح ، ۸- نومبر ۱۸۵۹ء)

"چوک (چاندنی) میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے، حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ و خشت ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔"

(مجروح ، ۲۲- دسمبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں دو سڑکیں دوڑتی پھرتی ہیں: ایک ٹھنڈی سڑک، ایک آہنی سڑک (ریلوے لائن) محل، ان کا الگ الگ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا پارک بھی شہر میں بنے گا اور قلعے کے آگے جہاں لال ڈگی ہے، ایک میدان نکالا جائے گا۔ جنوب کی دکانیں، بھیلیوں کے گھر، فیل خانہ، بلاقی بیگم کے کوچے کے دروازے سے قلعے کی خندق تک سوائے لال ڈگی اور دو چار کنوؤں کے، آثارِ عمارات باقی نہ رہیں گے۔ آج جان نثار خاں کے چھتے کے مکان ڈھینے شروع ہو گئے ہیں۔ کیوں میں دلّی کی ویرانی سے خوش نہ ہوں؟ جب اہلِ شہر نہ رہے، شہر کو لے کے کیا چولہے میں ڈالوں؟"

(یوسف مرزا ، ۲۶- جولائی ۱۸۵۹ء)

"وُہ شور و غل تھا کہ سڑکیں نکلیں گی اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی، کچھ بھی نہ ہُوا۔ مرہٹ کر ایک جاں نثار خاں کے چھتے کی سڑک نکلی ــــ"
(یوسف میرزا، ۱۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

"تم آتے ہو، چلے آؤ۔ نثار خاں کے چھتے کی سڑک، خان چند کے کوچے کی سڑک دیکھ جاؤ۔ بلاقی بیگم کے کوچے کا ڈھینا، جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز میدان نکلنا، سُن جاؤ، غالبِ افسردہ دل کو دیکھ جاؤ، چلے جاؤ ــــ"
(مجروح، ۲۰۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"فیل خانہ، فلک پیرا، لال ڈگی کے محاذی کے مکانات، سب گرائے گئے۔ بلاقی بیگم کا کوچہ التوا میں ہے۔ اہلِ فوج ڈھانا چاہتے ہیں، اہلِ قلم (سول حکام) بچاتے ہیں۔ پایانِ کار دیکھیے کیا ہو ــــ"
(حسین میرزا، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"کشمیری کٹرا بگڑ گیا ہے۔ ہائے! وہ کیا اُونچے اُونچے دَر اور وُہ بڑی بڑی کوٹھریاں دو رویہ نظر نہیں آتیں کہ کیا ہوئیں ــــ؟"
(مجروح، ہفتم جنوری ۱۸۶۰ء)

"لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے۔ مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہوگا (بگاڑ کے بعد بناؤ کی صورت نکلے گی)، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ جو دیکھے گا، وہ داد دے گا ــــ اور دِلی کے فساد کے بعد کون بنیں ہے۔ یہاں فساد در فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت' سوائے اُس بازار کے جو قلعے کے لاہوری دروازے سے، شہر کے لاہوری دروازے تک ہے سراسر بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے ــــ"
(میاں داد خاں سیّاح، ۱۱ر جون ۱۸۶۰ء)

"قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ جامع مسجد ہوتا ہوا، راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک، بے مُبالغہ ایک صحرا لق و دق۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اُٹھ جائیں تو ہُو کا مکان ہو جائے ــــ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، وُہ اب باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ راج گھاٹ

کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اَٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا پنجابی کٹرا، دھوبی واڑا، رام جی گنج، سعادت خاں کا کٹرا، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا، اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا ــــ"

(مجروح، ۱۸۶۱ء)

"دِلّی دنوں، شہر چپ چاپ، نہ کہیں پھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دِلّی شہر، شہر خوشاں ہے ــــ"

(مجروح، ۲۲۔ ستمبر ۱۸۶۱)

O

"غلّے کی گرانی، آفتِ آسمانی ــــ" (انور الدولہ شفق، ۲۴۔ اگست ۱۸۶۰)

"غلّہ گراں ہے، موت ارزاں ہے۔ میوے کے مول اناج بکتا ہے۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ سولہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر، گھی ڈیڑھ سیر، ترکاری مہنگی ــــ"

(چودھری عبدالغفور سرور، ستمبر ۱۸۶۰ء)

"گرانی اور ارزانی اُمورِ عامّہ میں سے ہے۔ دُنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں ــــ" (چودھری عبدالغفور سرور، نومبر ۱۸۶۰ء)

"یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں، سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں ــــ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس (اخبار کی خریداری) کی طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم اِدھر کا خیال دل سے دھو ڈالو ــــ" (شیو نراین آرام، ۱۲۔ جون ۱۸۵۹ء)

"یہاں آدمی کہاں ہے کہ اخبار کا خریدار ہو؟ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں، وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوں گے تو جنس پوری تول دیں گے، کاغذ (بطور اخبار) روپے مہینے کا کیوں مول لیں گے ــــــ"

(شیو نراین آرام ۰ ۱۸۵۸ء)

"مہر کے واسطے صاحب، زمرد کا نگینہ اور پھر چنے کی دال کے برابر اور ہشت پہلو، اس اُجڑے شہر میں کہاں ملے گا ــــــ؟"

(شیو نراین آرام ، ۱۰- دسمبر ۱۸۵۹ء)

"بادشاہ (ظفر) کی تصویر کی یہ صورت ہے کہ اُجڑا ہوا شہر، نہ آدمی، نہ آدم زاد، مگر ہاں دو ایک مُصوّروں کو آبادی کا حکم ہو گیا ہے، وہ رہتے ہیں، سو وہ بھی بعد اپنے گھروں کے لُٹنے کے آباد ہوتے ہیں۔ تصویریں بھی اُن کے گھروں سے لُٹ گئیں۔ جو کچھ رہیں، وہ صاحبانِ انگریز نے بڑی خواہش سے خرید کر لیں۔ ایک مُصوّر کے پاس ایک تصویر ہے، وہ تیس روپے سے کم کو نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ تین تین اشرفیوں کو میں نے صاحب لوگوں کے ہاتھ بیچی ہیں، تم کو دو اشرفی کو دوں گا۔ ہاتھی دانت کی تختی پر وہ تصویر ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کی نقل کاغذ پر اتار دے، اس کے بھی بیس روپے مانگتا ہے ---- میں نے دو ایک آدمیوں سے کہہ رکھا ہے، اگر کہیں سے ہاتھ آ جائے گی تو لے کر تم کو بھیج دوں گا۔ مُصوّروں سے خرید کرنے کا نہ مجھ میں مقدور، نہ تمہارا نقصان منظور ــــــ"

(شیو نراین آرام ، ۲۳- اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"دِلّی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لُوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے ــــــ"

(میر مہدی مجروح ، ۷- مارچ ۱۸۵۹ء)

"دہلی کی ایجنٹی کا دفتر بِزد فرد لُٹ گیا۔ کوئی کاغذ باقی نہیں رہا ــــــ"

(چودھری عبدالغفور سرور ، فروری مارچ ۱۸۵۹ء)

"دِلّی علاقہ لفٹننٹ گورنر سے اِنقطاع پا گئی اور احاطۂ پنجاب کے تحتِ حکومت آ گئی ــــــ"

(انورالدولہ شفق ، نہم مارچ ۱۸۵۹ء)

"اب یہ شہر پنجاب احاطہ میں مل گیا۔ پنجاب کا نواب لفٹنٹ گورنر بہادر یہاں کا صدر ٹھہرا۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، فروری مارچ ۵۹ء)

"زنہار کبھی یہ گمان نہ کیجیے کہ دلی کی عملداری میرٹھ اور آگرہ اور بلادِ شرقیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطے میں شامل ہے۔ نہ قانون، نہ آئین۔ جس حاکم کی جو رائے میں آوے، وہ ویسا ہی کرے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، موسم گرما ۱۸۵۸ء)

"قواعد عملداری کے برہم ہو گئے، نئے نئے دستور ہیں۔"

(مجروح، ۱۸۶۳ء)

"نہ وہ حکام ہیں، جن کو میں جانتا تھا۔ نہ وہ عملہ ہے جس سے میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے قواعد ہیں جن کو پچاس برس میں نے دیکھا ہے۔ ایک کونے میں بیٹھا ہوا نیرنگِ روزگار کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ "یا حافظ"۔ "یا حفیظ" وردِ زبان ہے۔"

(کاشف، ۱۳۔ مئی ۱۸۶۳ء)

"ہر شخص کی سرنوشت کے مطابق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی قانون ہے، نہ قاعدہ ہے۔ نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دو سو روپے کی پنشن کی منظوری کی رپورٹ آگئی اور ان کی دو بہنیں سو سو روپیہ مہینا پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی مجرم تھے، تمہاری پنشن ضبط! بطریقِ ترحم دس دس روپے مہینا تم کو ملے گا۔ ترحم یہ ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا!! میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس، پیشتر نہیں الکھیڑ سکتا۔ ترپن برس کا پنشن، تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک اور بہ منظوری گورنمنٹ، اور پھر نہ ملا ہے، نہ ملے گا، خیر احتمال ہے ملنے کا۔"

(یوسف میرزا، ۱۵۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"ایک لطیفہ پرسوں کا سنو: حافظ مموں بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں۔ قبض و تصرف ان کا ثابت ہو چکا، صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ

حاضر ہوئے، مِسَل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا :
" حافظ محمد بخش کون ؟"
عرض کیا کہ : " مَیں "
پھر پوچھا کہ : " حافظ ممّو کون ؟"
عرض کیا کہ : " مَیں ، اصل نام میرا محمد بخش ہے ، ممّو مشہور ہوں۔"
فرمایا کہ : " یہ کچھ بات نہیں ، حافظ محمد بخش بھی تم ، حافظ ممّو بھی تم ، جو دُنیا میں ہے ، وہ بھی تم ، ہم مکان کس کو دیں ؟"
مِسَل ، داخلِ دفتر ہوئی ، میاں ممّو اپنے گھر چلے آئے ــــــ "

(یوسف میرزا ، جون ۱۸۵۹ء)

جو تدبیر وثیقے[1] کے باب میں تم نے کی ہے ، وہ بہت مناسب ہے ، بشرط پیش ہونے کے اور ولایت پہنچنے کے ، سجّاد میرزا اور اکبر میرزا اپنی پیرانہ سری میں اس پر قابض ہو رہیں گے[2]۔ انشاء اللہ العلی العظیم۔"

---

[1] " وثیقے کی کیفیت یہ ہے کہ شاہان و بیگمات اودھ کا ایک دستور یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو ہندوستان کے مختلف حصوں پر مُسلّط ہو چکی تھی ، بڑی بڑی رقمیں بطور قرض دے دیتے اور ان کے سود کی رقم اپنے عزیزوں ، متوسلوں یا ملازموں کے نام لکھ دیتے تھے ۔ کمپنی کی حکومت کے خزانے سے سود کی رقمیں مُقررہ لوگوں کو ملتی رہتیں ۔ حسین میرزا اور ان کے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں کے لیے بھی وثیقے مقرر تھے ، جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضبط ہو گئے ۔ مُظفر الدولہ بیچارے تو الور سے پکڑے آئے اور اُس گروہ کے ساتھ شہید کر دیے گئے ، جنہیں مقدمہ چلائے اور تحقیق کیے بغیر گوڑ گانوہ میں شہید کر دیا گیا تھا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ حُسین میرزا وثیقے کی بحالی کے لیے مُقدمہ ، ولایت تک لے جانا چاہتے تھے ۔ یقیناً اُنہیں اس کا پُورا حق حاصل تھا ، کیوں کہ وثیقہ ، قرض دی ہوئی رقم کا سود تھا ، یا رقم واپس ملتی یا سود ادا ہوتا رہتا ۔ یہ انگریزوں کا عطیہ نہ تھا کہ اسے ضبط کر لینا جائز ہوتا ۔"
(مولانا غلام رسول مہر ، خطوطِ غالب (جلد دوم) ، ۱۹۶۹ء ص ۶۰۹)

[2] " میرزا غالب نے لکھا ہے کہ بے شک ، مقدمہ دائر کر دو ، لیکن نتیجہ شاید اس وقت برآمد ہو ، جب آپ کے فرزند (سجاد میرزا اور اکبر میرزا) بوڑھے ہو جائیں گے ــــــ " (مولانا غلام رسول مہر ، ایضاً)

میں حکم کی نقل کے واسطے تم لکھتے ہو، وہ اصل کہاں ہے، جس کی نقل لوں؟ ہاں زبان زد خلق ہے کہ قدیم نوکروں سے باز پرس نہیں، مشاہدہ اس کے خلاف ہے ــــــ"

(یوسف مرزا ، جون ۱۸۵۹ء)

"ہمشیر کی درخواست کیوں کر گزرے؟ جب وہ خود آئیں اور درخواست دیں اور منظور ہو اور مکان ملے تو اس تمام شہرستان ویران میں سے ایک حویلی ملے گی اور ان کو یہاں رہنا ہوگا۔ کیوں کر اس ویرانے میں تنہا رہیں گی؟ سہم کر دم نکل جائے گا۔ مانا کہ جبر اختیار کر کر رہیں، کھائیں گی کہاں سے؟ بہر حال ــــ نقل حکم لینی اور پھر مرافعہ کرنا اور پھر اس حکم کی نقل لینی، یہ امور ایسے نہیں کہ جلد فیصل ہو جائیں۔ حکام بے پروا، مختار عدیم الفرصت ــــــ"

(حسین مرزا ، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"بھائی فضلو ــــ آئے ہوئے ہیں۔ دوڑتے ہیں، عرضیاں دیتے پھرتے ہیں؛ کوئی سنتا نہیں ــ"

(یوسف مرزا ، ۱۸۔ اگست ۱۸۵۹ء)

"تم اب تک سمجھے نہیں ہو کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ کبھی سمجھو گے ــــ کیسی نقل حکم، کیسا مرافعہ، جو احکام کہ دلی میں صادر ہوئے ہیں، وہ احکامِ قضا و قدر ہیں، ان کا مرافعہ کہیں نہیں ــ"

(حسین مرزا ، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"ایک محکمہ لاہور میں معاوضۂ نقصان رعایا کے واسطے تجویز ہوا ہے اور یہ حکم ہے کہ جو رعیت کا مال، کالوں نے لوٹا ہے، البتہ اس کا معاوضہ بحساب دہ یک سرکار سے ہوگا، یعنی ہزار روپیہ مانگنے والے کو سو روپیہ ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت گری ہے، وہ ہدر اور بحل و مباح اور معاف ہے، اس کا معاوضہ نہ ہوگا ــــ"

(حسین مرزا ، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"بھائی یہاں کا نقشا ہی کچھ اور ہے۔ سمجھ میں کسی کے نہیں آتا کہ کیا طور ہے۔ اوائل ماہ انگریزی میں

دوک ٹوک کی شدت ہوتی تھی۔ آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو جاتی تھی۔ اِس مہینے میں برابر وہی شور رہی، آج ۲۷۔ مارچ کی ہے۔ پانچ چار دن مہینے کے باقی ہیں۔ آنچ ویسی ہی تیز ہے۔ خدا اپنے بندوں پر رحم کرے۔"

(مجروح، ۲۷۔ مارچ ۱۸۵۹ء)

"یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا بچھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے۔ جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔"

(مجروح، ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء)

"آج کل یہاں پنجاب احاطے کے بہت حاکم فراہم ہیں۔ پون ٹوٹی (ٹاؤن ڈیوٹی = محصول چونگی) کے باب میں کونسل ہوئی، پرسوں، ۔ نومبر کو جاری ہو گئی۔۔۔ غلّے اور اُپلے کے سوا، کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہ ہو۔۔۔"

(حسین میرزا، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"پون ٹوٹی" کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے اناج اور اُپلے کے کوئی چیز ایسی نہیں، جس پر محصول نہ لگا ہو۔۔۔"

(مجروح، ۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"سُنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ (الور) کو اختیار ملے گا، مگر وہ اختیار ایسا ہوگا، جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔۔۔"

(مجروح، ۲۶۔ ستمبر ۱۸۶۲ء)

"حضرت، یہاں دو (ایک) چیزیں مشہور ہیں۔ اُن کے باب میں آپ سے تصدیق چاہتا ہوں۔۔۔ لوگ کہتے ہیں، آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔ سچ ہونا (اس) کا آپ کے خط لکھنے پر منحصر ہے"

(مہر، ۲۱۔ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حکم ہوا ہے کہ دوشنبے کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت سب خیر خواہانِ انگریز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے ـــــ"

(آرام، ۱۱ اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں پہلی نومبر کو (دوشنبے) کے دن حسب الحکم حکام، کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آنا سنایا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکۂ معظمہ انگلستان نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں:

تا نہالِ دوستی کے بردہد ‏ حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

(انور الدولہ شفق، پنجم نومبر ۱۸۵۸ء)

"حکم عفوِ تقصیرِ عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب و پیکار دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں ـــ"

(تفتہ، ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء)

O

"صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے ـــ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ـــ میں جس شہر میں ہوں، اُس کا نام بھی دلّی اور اُس محلّے کا نام بھی بلی ماروں کا محلّہ ہے لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔"

(تفتہ، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء)

"اس چرخِ کج رفتار کا بُرا ہو۔ ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ملک و مال و جاہ و جلال کچھ نہیں

رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا، ایک جگہ فراہم ہو کر ہنس بول لیتے تھے۔

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا، اُے فلک!
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

(مجروح، اپریل ۱۸۵۹ء)

"درخت جگہ سے اکھڑ کر بہ دشواری جمتا ہے۔ خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں تو ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے؟ سُنّی الگ، شیعہ الگ، نیک جُدا، بد جُدا!"

(مجروح، ۷۔ستمبر ۱۸۵۸ء)

"وہی بالاخانہ ہے اور وہی مَیں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر کہ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف میرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا، بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ، اللہ، اللہ! ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، مَیں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔؟۔۔۔ کیا مجمع برہم ہوا ہے! مجھ کو کیسا غم ہُوا ہے —"

(امیر سرفراز حسین، ۱۸۵۸ء)

"تمہارا شہر میں ہونا، موجبِ تقویتِ دل تھا۔ گو، نہ ملتے تھے، پر ایک شہر میں تو رہتے تھے۔ بھائی! ایک سیر دیکھ رہا ہوں۔ کئی آدمی طیورِ آشیاں گم کردہ کی طرح، ہر طرف اُڑتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے دو چار بھولے بھٹکے کبھی یہاں بھی آجاتے ہیں —"

(نواب امین الدین احمد خاں، ۲۲۔جون ۱۸۶۴ء)

"آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے، بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت ۔۔۔ غمِ فراق، حسین میرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے، وہاں خوش ہوتے، گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔"

(یوسف میرزا، ۲۸۔نومبر ۱۸۵۹ء)

"میرن صاحب کو، جب تک تم کہو، میں دلّی نہ بلاؤں، گویا اُن کے عاشق تمہیں ہو، میں نہیں۔ بھائی ہوش میں آؤ، غور کرو یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ اُن کو یہاں بُلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں اور اگر زیادہ نہیں تو تیس روپے مہینہ مقرر کر دوں کہ بھائی یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازے کا بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوران خان کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو۔ اُسے میر مہدی! تو درماندہ چلیز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلّی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غم ہائے جانگداز کی تاب لاؤں؛ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا:

اَے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

(مجروح، ۸۔ دسمبر ۱۸۶۰ء)

"بزم مرگ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، میرزا عاشور بیگ، میر امجانجا، اس کا بیٹا احمد میرزا، اُنیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں، مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو، بھول گیا: حکیم رضی الدین احمد خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ، ان کو کہاں سے لاؤں؛ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے ـــــ۔"

(یوسف میرزا، ۲۸۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"احمد حسین میکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں؛ مخنوق ہوا (پھانسی پائی)۔ گویا، اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں ـــــ"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"طالع یار خاں کے دو بیٹے رُخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب نہ جا سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی، دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں۔ زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مُردے سے بدتر ہوں گے ـــــ"

(انور الدولہ شفق، ۱۸۶۰ء)

"ــــ کیوں کر لکھوں؛ حکیم رضی الدین خاں کو قتلِ عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں

ان کے چھوٹے بھائی، اُسی دن مارے گئے ---- میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی ــــ "

(انورالدولہ شفق ، ۱۸۶۰ء)

" اُمرائے اسلام میں سے اَموات گِنو : حسن علی خاں، بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنسن دار، سو روپے مہینے کا روزینہ خوار بن کر نامُرادانہ مرگیا۔ میر نصیرالدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا ہے، بیمار پڑا، نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمہارے چچا کی طرف سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احبا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا ــــ "

(علائی ، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

" ہائے میرجان جاکوب[1]، کیا جوان مارا گیا ہے۔ سچ، اس کا شیوہ یہ تھا کہ اُردو کی فکر کو مانع آتا اور فارسی زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ بندہ پرور! یہ بھی اُنہیں میں ہے کہ جن کا میں ماتمی ہوں۔ ہزاروں دوست مرگئے۔ کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں؟ جیوں تو کوئی غم خوار نہیں، مروں تو کوئی عزادار نہیں "

(مہر ، اوائل ۱۸۵۸ء)

" انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے اس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیوں نہ دُشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو کوئی میرا رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون ؀

(تفتہ ، ۱۸۵۸ء)

---

[1] میرجان کوب، اکبرآباد (آگرہ) سے دہلی میں وارد ہوئے۔ مرزا اسداللہ خاں غالب نے رفاقتِ قدیم کے سبب سے مہمان داری اور استقبال کی رسومات کو شان و شوکت کے ساتھ انجام دیا اور نواب صاحب ضیاءالدین خاں کے مکان میں جو پہلے ہی سے مہمان داری کا انتظام کیا گیا تھا، ٹھہرایا۔ دو دن کے بعد میجر صاحب نے مٹسن مٹکاف بہادر اور دیگر اشخاص سے ملاقات فرمائی۔ دہلی میں آپ کی خاطر و مدارات بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ سراج الاخبار، دہلی : احسن الاخبار، دہلی ۱۴۔ ماہ دسمبر ۱۸۴۳ء (بحوالہ حسن نظامی، بہادر شاہ کا روزنامچہ، طبع پنجم کتوبر ۱۹۳۰ء)

"اس فتنہ و آشوب میں تو کوئی میرا جاننے والا نہ بچا ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو جو دوست، اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔ واللہ! دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو ـــــ"

(غلام نجف خاں ، اپریل ۱۸۵۸ء)

"مولانا (فضل حق خیرآبادی)[1] کا حال ـــ کچھ تم مجھ سے معلوم کرو۔ مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا، بلکہ تاکید ہوئی کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کرو۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا، اُن کا بیٹا ولایت میں اپیل کیا چاہتا ہے، کیا ہوتا ہے؟ جو ہونا تھا، سو ہو لیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ٥

(یوسف میرزا ، جون ۱۸۵۹ء)

"ہاں خاں صاحب! آپ جو کلکتے پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اُس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے (انڈیمان) میں اس کا کیا حال ہے؟ گزارا کس طرح ہوتا ہے ـــ؟" (میاں داد خاں سیاح ، ۴۔ اکتوبر ۱۸۶۲ء)

"مولوی صدرالدین صاحب (آزردہ) بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ وتباہ لاہور گئے۔ فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے ازراہِ ترحم نصف جائداد واگزاشت کی، اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں، کرائے پر معاش کا مدار ہے ـــــ"

(احمد حسن مودودی ، ۱۹۔ جنوری ۱۸۶۲ء)

"مصطفیٰ خاں (شیفتہ): جنہیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کے بے بنیاد الزام پر سات سال

---

[1] "مولانا فضل حق خیرآبادی جن پر غلطی سے ایک ہم نام کے دھوکے میں مقدمہ قائم ہوا اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل کی گئی مگر حکم سزا بحال رہا اور تاکید کی گئی کہ مولانا کو جلد انڈیمان بھیج دیا جائے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۶۱۲)

قید کی سزا دی گئی ، کا حال سُنا ہوگا ۔ خُدا کرے مرافعے میں چھُوٹ جائے ۔ ورنہ جیسی ہفت سالہ کی تاب اس نازپروردہ میں کہاں ؟

(غلام نجف خاں ، اپریل ۱۸۵۸ء)

نواب مُصطفےٰ خاں بہ میعاد سات برس کے قید ہو گئے تھے ، سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی ملی ۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے ۔ جہانگیر آباد کی زمینداری اور دِلّی کی املاک اور پنسن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہُوا ۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں ۔ بہ مجردِ استماع اس خبر کے ، ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا ، اُن کو دیکھا ۔ چار دن وہاں رہا ، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا ۔ "

(مجروح ، ۲ ۔ فروری ۱۸۵۹ء)

" مصطفیٰ خاں (شیفتہ) کی رہائی کا حکم ہوا ، مگر پنسن ضبط ـــــ"

(یوسف میرزا ، ۱۹ ۔ مئی ۱۸۶۰ء)

" کل یوسف میرزا کا خط لکھنؤ سے آیا ۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر خاں ، عرف نواب جان ، والد ان کا دائم الحبس ہو گیا ۔ حیران ہوں کہ یہ کیا آفت آئی ۔ یوسف میرزا تو جھوٹ کا ہے کو لکھے گا ، خُدا کرے اُس نے جھوٹ سُنا ہو ۔"

(مجروح ، اپریل ۱۸۵۹ء)

" مُبارک ہو کہ حکیم صاحب[1] (احسن اللہ خاں) پر سے ، وُہ سپاہی ، جو اُن کے اُوپر متعین تھا ، اُٹھ گیا اور ان کو حکم ہو گیا کہ اپنی وضع پہ رہو ۔ مگر شہر میں رہو ۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر ہفتے میں ایک بار کچہری میں حاضر ہُوا کرو ۔ ۔ ۔ ۔ مقدر میرے پاس آیا تھا ، یہ اُس کی زبانی ہے ۔"

(غلام نجف خاں ، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

---

[1] " حکمت مآب ، کمالات اکتساب ، جامع نفائس علوم ، مبانی مفہوم ، حاکم ، محاکم حکم حکیم مسیحادم محمد احسن اللہ خاں المخاطب بہ خطاب احترام الدولہ ، عمدۃ الحکماء ، مُعتمد الملک حاذق الزماں حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر ثابت جنگ ۔"

(سرسید احمد خاں ، آثار الصنادید ، طبع اوّل ، مطبع سید الاخبار ، ۴۷ ۔ ۱۸۴۶ء ، باب چوتھا)

" حکیم احسن اللہ خاں ۱۸۵۷ء میں دَر پردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے ۔" دیکھیے ،

(غالب اور ابوالکلام ، دہلی ، ۱۹۶۹ء ص ۱۶۸ ۔ ۱۶۷)

"حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) کے دیکھنے کو جی چاہتا ہے مگر از راہِ احتیاط جا نہیں سکتا ــــــ"

(غلام نجف خاں، یکم اپریل ۱۸۵۸ء)

"جناب حکیم صاحب (احسن اللہ خاں) ایک روز از راہِ عنایت یہاں آئے۔ کیا کہوں کہ اُن کے دیکھنے سے دل کیا خوش ہوا ہے۔ خدا اُن کو زندہ رکھے ــــــ"

(غلام نجف خاں، اپریل ۱۸۵۸ء)

"حکیم احسن اللہ خاں کے مکانات پر اُن کو قبضہ مل گیا۔ زنانے مکان میں ـ ـ ـ ایک انگریز اُترا ہوا ہے پینتیس روپے مہینہ اُن کو کرایہ دیتا ہے ـ ـ ـ احسن اللہ خاں اپنے مکان میں جا رہے۔ دیوان خانے کو محل سرا بنایا، خود جہاں اصطبل تھا، وہاں بیٹھتے ہیں ــــــ"

(حسین مرزا، ۲۸۔ جولائی ۱۸۵۹ء)

"حکیم جی (احسن اللہ خاں) کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں ـــ اتنا حکم اُن کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں ــ"

(تفتہ، ۵۔ نومبر ۱۸۵۹)

"حامد علی خاں[1] کی ایک لاکھ تیس ہزار کئی سو روپے کی ڈگری بادشاہ پر ہو گئی ــــ"

(مجروح، ۲۲۔ ستمبر ۱۸۶۱ء)

"نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے۔ وہ قاضی کے حوض میں کرائے کے مکانات میں

---

[1] "حامد علی خاں، میرزا غالب کے عزیز دوست اور اعتماد الدولہ میر فضل علی نائب السلطنت اودھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ بیگم حامد علی خاں کو باپ کے ترکے سے نو لاکھ روپے ملے تھے۔ نواب لکھنؤ کے اُمراء میں منسوب تھے۔ اعتماد الدولہ کے انتقال پر حامد علی خاں دہلی آ گئے۔ روپیہ شاہی خزانے میں جمع کرا دیا۔ اس کا سود ساڑھے چار ہزار ماہوار ملتا تھا۔ ۵۷ء کی مصیبتوں سے کسی قدر نجات ملی تو شاہی خزانے میں جمع کرائے ہوئے روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ڈگری اسی سلسلے میں ہوئی۔ غالباً باقی روپیہ وہ پہلے لے چکے ہوں گے۔" (مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۹۲)

مع متوسّلوں کے رہتے ہیں۔ باہر جانے کا حکم ان کو بھی نہیں ـــــ"

(حسین میرزا ، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو؟ وہ مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال ہو گیا۔ باغ کی صورت بدل گئی۔ محل سرا اور کوٹھی میں گورے رہتے تھے۔ اب پھاٹک اور سرتاسر دکانیں گرا دی گئیں۔ سنگ و خشت کو نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا، مگر یہ نہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا ملبہ بِکا ہے۔ سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا۔ جب بادشاہِ اودھ کی املاک کا وہ حال ہو تو رعیت کی املاک کو کون پوچھتا ہے ـــــ؟"

(حسین میرزا ، ۳۱۔ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"ناظر حسین میرزا ۔۔۔ اس کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان، اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے ـــــ"

(علائی ، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"بے سبب حسین میرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور مجھ کم بخت سے اس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے!"

(یوسف میرزا ، ۲۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"حال، صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگ گئے تھے، وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے۔ سرکار سے اُن کی صفائی ہو گئی۔ لیکن صرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی، جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ، اور خواجہ صاحب کی حویلی، یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پا کر ضبط ہوئی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا ـــــ"

(انور الدولہ شفق ، ۱۸۶۰ء)

---

[1] معین الدولہ، عمدۃ الامراء، صفدر الملک، ذوالفقار الدین حیدر نظامت خاں بہادر ذوالفقار جنگ۔

"بڈھے[1] صاحب، ساری املاک بیچ کر، زرِ نقد جان کر کے، بیگ بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔"
(علائی، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"ضیاء[2] الدولہ کی پانسو روپے کرائے کی املاک واگذاشت ہو کر، پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے ۔۔۔" (علائی، ۱۶۔ فروری ۱۸۶۲ء)

"تمہارے ماموں۔۔۔ کی جاداد کی واگذاشت کا حکم تو ہو گیا ہے ۔۔۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے۔۔ ہو گا کیا؟ اگر جادادیں مل بھی گئیں تو قرضدار دام دام لیں گے ۔۔۔"
(یوسف مرزا، ۱۹۔ مئی ۱۸۶۰ء)

"روپے کا نقصان اگرچہ جانکاہ اور جانگزا ہے، پر بموجب "تلف المال خلف العمر" عمر فزا ہے۔ جو روپیہ ہاتھ سے گیا، اُس کو عمر میں قیمت جانیے اور اثباتِ ذات اور بقائے عرض و ناموس کو غنیمت جانیے۔"
(انور الدولہ شفق، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"ہاں، غلام فخر الدین[3] خاں کی رہائی۔ زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔۔۔"
(غلام نجف خاں، جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

---

[1] "بڈھے صاحب کا نام غلام محی الدین تھا اور نواب تھے۔ دہلی کے سرکردہ رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ ایک ہزار روپے ماہوار پنشن تھی۔ تین سو روپے ریاست بہاولپور سے ملتے تھے اور پانسو روپیہ ماہانہ کرایہ آتا تھا۔۔۔"
(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد دوم، ۱۹۶۹ء صفحہ ۲۶۷)

[2] "رکن الدولہ کے فرزند۔ یہ بھی بڑے رئیس تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد پانی پت چلے گئے تھے، وہاں سے پکڑے آئے ۔۔۔"
(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً ص ۲۶۷)

[3] "میرزا غالب کے برادرِ نسبتی علی بخش خاں کے فرزند اور مرزا غالب کی بھتیجی عزیز النساء بیگم کے شوہر۔ وہ اس لیے معرضِ بازپرس میں آ گئے تھے کہ بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے ناظم و مہتمم تھے۔"
(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء صفحہ ۵۰۲)

"یہ دوسرا حادثہ، مجھ کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا۔ قضا و قدر کے اُمور میں دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کہیں جاگیر پر جانے کی اجازت جلد ہو جاتے تاکہ سب یک جا باہم آرام سے رہیں ـــــ"

(ثاقب ، مارچ ۱۸۵۸ء)

"امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال ـــ کیونکر دکھوں) ـــ اُن کو جاگیر اگست میں ملی ـــــ"

(مجروح ، ۱۸۵۸ء)

"سُنا ہے لوہارو بھی ان دونوں صاحبوں (امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں) کو مل گیا۔ یہ بھی ایک تہنیت ہے، خدا سب کا بھلا کرے ـــــ" (غلام نجف خاں، جولائی اگست ۱۸۵۸ء)

O

"نواب گورنر جنرل بہادر، ۱۵۔ دسمبر کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اُترتے ہیں اور کیوں کر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار تھے (دہلی کے آس پاس سے سات چھوٹی چھوٹی ریاستیں) کہ اُن کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں۔[2] جو باقی رہے، اُس میں دوجانہ و لوہارو تحت حکومت ہانسی حصار، پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں (دوجانہ و لوہارو) کو یہاں لے آئے تو تین رئیس، ورنہ

---

[1] "ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے خاتمے پر اہل دہلی شہر چھوڑ کر نکلے تو امین الدین احمد خاں اور ضیاءالدین احمد خاں نے لوہارو کا قصد کیا، مہرولی پہنچے تو ان کا سامان لوٹا گیا۔ دہلی میں ان کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی گئی تھی۔ وہ دوجانہ پہنچے تو وہاں سے پکڑے آئے اور خاصی مدت انگریزوں کی حراست میں لال قلعے کے اندر گزاری۔ آخر بیگناہ ثابت ہوئے اور انہیں جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد لوہارو جانے کی اجازت ملی ـــــ"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹، صفحہ ۳۱۹)

[2] "(چار:) جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ اور فرخ نگر۔ جھجر کے نواب عبدالرحمٰن خاں، بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ اور فرخ نگر کے رئیس احمد علی خاں کو بے گناہ پھانسی دے دی گئی اور اُن کی ریاستیں ضبطی میں آئیں۔ بہادر گڑھ کے رئیس بہادر جنگ کی ریاست ضبط ہوگئی اور انہیں پنشن دے کر لاہور بھیج دیا گیا ـــــ"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۶۸)

ایک رئیس ——— دربارِ عام والے مہاجن لوگ، سب موجود۔ اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین خاں، بلّی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود و مطرود، محروم و مغموم:

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

(مجروح ، ۲۰ دسمبر ۱۸۵۹ء)

"بقصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ کی ریاستیں مٹ گئیں۔ اس باب میں جو حرفِ مختصر میں نے لکھا ہے، اس کو ... سچ جانو ———"

(علائی ، ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء)

"مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں[1] کے حال پر اور رئیس فرخ آباد[2] پر خصوصاً کہ جہاز سے اتار کر سرزمین عرب میں چھوڑ دیا۔ ہا ہا ہا:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو"

(علائی ، ۱۹ جون ۱۸۶۲ء)

"یہاں کا حال یہ ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی: نواب حسن علی خاں[3]، نواب حامد علی خاں،

۱؎ "وہ لوگ جنہیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کی بنا پر انڈیمان بھیج دیا گیا تھا ———"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۲۷۲)

۲؎ "نواب تفضل حسین خاں، رئیس فرخ آباد۔ ان پر بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شرکت کا الزام لگا تھا اور ریاست ضبط کر لی گئی تھی۔ نواب کو، ان کی خواہش کے مطابق حجاز بھیج دیا گیا۔ ان کی زندگی کے باقی دن مکہ مکرمہ میں بسر ہوئے۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، صفحہ ۲۷۲)

۳؎ "نجابت علی خاں والیٔ جھجر کے چھوٹے بیٹے۔ اپنے بڑے بھائی نواب فیض محمد خاں کے عہدِ حکومت (باقی صفحہ ۱۶۹)

حکیم احسن اللہ خاں، سو اُن کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں۔ معہذا یہاں کی اقامت میں متذبذب۔ خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں نے (اخبار) "آفتاب عالمتاب" کی خریداری کی ہے۔ اب وہ کرتہ "حالاتِ دربارِ شاہی" کیوں لیں گے؟ سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں ہے۔ وہ لوگ اس طرف کیوں توجہ کریں گے؟ تم ادھر کا خیال، دل سے دھو ڈالو ———"

(آرام، ۱۲- جون ۱۸۵۹ء)

— — — — —

"معزول بادشاہ (ظفر) کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، کٹنیاں اور جو جوان ہیں کسبیاں ———"

(علائی، ۱۶- فروری ۱۸۶۲ء)

— — — — — —

"(یہ حقیقت) جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں ———"

(تفتہ، ۹- اپریل ۱۸۶۱ء)

"تاج محل (بہادر شاہ کی ایک بیگم)، مرزا قیصر (شاہ عالم ثانی کے چھوٹے بھائی، میرزا سلیمان شکوہ کے فرزند) مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ، بجے پوری کی زوجہ، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی ہے۔"[1]

(مجروح، ۲۲- دسمبر ۱۸۵۸ء)

"بادشاہ (ظفر) کی روانگی کا حال کیونکر لکھوں،... بادشاہ اکتوبر میں گئے۔" (مجروح، ۸ ، ۱۸۵۸ء)

(صفحہ ۱۶۸ سے آگے) میں جرنیل کے عہدے پر مامور رہے... (مسند نشینی کے موقع پر) اختلافات شروع ہو گئے۔ آخر کار سرکارِ انگلشیہ نے تصفیہ کرایا۔ حسن علی خاں کے لیے تین ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر ہوئی جو ریزیڈنسی کی معرفت ملتی تھی اور وہ دہلی میں رہنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان پر بھی بڑی آفتیں نازل ہوئیں۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۹۲)

[1] "مطلب یہ کہ انہیں اجازت مل گئی۔ چاہیں، ہندوستان میں رہیں، چاہیں بادشاہ کے ساتھ جائیں۔"
(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، صفحہ ۳۴۷)

"بادشاہ ، میرزا جواں بخت ، میرزا عباس شاہ (بہادر شاہ ظفر کے ایک فرزند جو جواں بخت سے چھوٹے تھے)، زینت محل، کلکتہ پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی ہوگی۔ دیکھیے کیپ[1] میں رہیں یا لندن جائیں ۔۔۔"
(مجروح ، ۲۲- دسمبر ۱۸۵۸ء)

"میرزا الٰہی بخش[2] جو شہزادوں میں ہیں، اُن کو حکم کرانچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں' دیکھیے کیا ہو؟ ۔۔۔"
(تفتہ ، ۵- نومبر ۱۸۵۹ء)

---

[1] "کیپ سے بہ ظاہر مراد (کیپ آف گڈ ہوپ) یعنی "راس اُمید" ہے، جو برّاعظم افریقہ کے انتہائی جنوبی گوشے میں واقع ہے۔ اس زمانے میں ولایت جانے والے جہاز عموماً راس اُمید کا چکر لگا کر اوقیانوس میں داخل ہوتے تھے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں افواہ گرم تھی، بادشاہ کو یا تو راس امید میں رکھیں گے یا ولایت لے جائیں گے، لیکن اس مظلوم کو رنگون میں رکھا گیا۔۔۔"

(مولانا غلام رسول مہر، خطوطِ غالب، جلد اوّل، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۴۷)

[2] بہادر شاہ ثانی کے دوسرے ولی عہد، مرزا فخرو کی شادی، مرزا الٰہی بخش کی بیٹی سے ہوئی اور شہزادہ ابوبکر اسی کے بطن سے تھا جسے ہاڈسن نے بہادر شاہ کے دو بیٹوں کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے پاس گولی ماردی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میرزا الٰہی بخش انگریزوں کا مخبر بنا رہا اسی کے مشورے کے مطابق بہادر شاہ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کیا تھا اور شاہی خاندان کے اکثر افراد انتہائی بے دردی سے مارے گئے تھے، بعد میں میرزا الٰہی بخش کو تیموری خاندان کا سرخیل مان لیا گیا اور پنشن ملتی رہی۔۔۔"

(مولانا غلام رسول مہر، ایضاً، صفحہ ۹۶)

"میرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ اُنہوں نے زمین پکڑی ہے۔ سلطان جی میں رہتے ہیں، عُذر کر رہے ہیں۔ دیکھیے یہ جبراً اُٹھ جاتے ہیں یا یہ خود اُٹھ جائیں۔" (حسین میرزا، ۹۔ نومبر ۱۸۵۹ء)

"اودھ اخبار" میں بادشاہ کے مرنے کی خبر دیکھی، مگر پھر کہیں سے تصدیق نہیں ہوئی۔" (مجروح، ۲۰۔ نومبر ۱۸۶۲ء)

"۷۔ نومبر/ ۱۴۔ جمادی الاوّل سال حال (۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) جمعہ کے دن ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے آزاد ہو گئے۔ اِنّا للّٰہ و انّا الیہ راجعُون ○" (مجروح، ۱۶۔ دسمبر ۱۸۶۲ء)

○

"—— بعد غدر، ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا"
—— غالب

بھائی ضیاء الدین خاں
کا مجموعہ نثر و نظم فارسی اردو سراسر دیکھا ہوا میرا جو اونکی کتابخانہ
میں تھا غدر میں لٹ گیا بعد غدر مجھ کو شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا فارسی
غزلیں فارسی چند جو لکھی ہیں اونکا انتخاب بھی پہنچیگا سو تم سلامت رہو ہزار
برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

[illegible]

نواب کلب علی خاں کے نام غالب کا خط مورخہ ۱۸-دسمبر ۱۸۶۶ء : پیش از غدر گورنمنٹ
کے دربار میں ۔ پارچہ اور جیغہ سرپیچ مالا مروارید تین رقمیں جواہر کی مجھ کو
ملتی تھیں بعد غدر اگرچہ پنسن اور دربار بحال رہا لیکن خلعت موقوف ہو گیا

اِنقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویّہ

"اِنقلاب ستاون کی غارت گری کے اِس اَلیے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا۔"

—: ڈاکٹر سیدمُعین الرحمٰن

"فتح دہلی کے بعد جو عالم گیر و عدیم النظیر مصیبت اشراف و اعیان شہر پر نازل ہوئی اور جس طرح شاہجہان آباد کی اُن سڑکوں پر جہاں کبھی صاحبِ قرانِ اعظم کی سواری کے لیے جمنا کے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا، مسلمانوں کے خون کے فوارے بہے، مرزا غالب نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناظرِ خونیں اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان چیخوں کو اپنے کانوں سے سُنا جو عرصے تک دار الخلافے کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں:

فلا تسئلن عما جرىٰ يوم حصرہم
و ذالک مما ليس يدخل فی حصر[1]

علی الخصوص قلعۂ معلّیٰ کی بربادیاں جن کے لیے اگر تمام حیواناتِ ارضی کی آنکھیں اشک بار ہو جائیں اور جن کے غم میں آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا، جب بھی اُن کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔ وہ اجسادِ محترمہ و رفیعہ جو تیمور و بابر کی یادگار اور اکبرِ اعظم و صاحب قرانِ ثانی کے خونِ عظمت و جبروت کے حامل تھے، جنہوں نے چھ صدیوں سے متصل شہنشاہی و فرماں روائی کی گود میں پرورش پائی تھی، جنہیں حکومت و اجلال کے سوا کسی مصیبت کا کبھی تصور بھی نہیں ہوا تھا، اور جو ہمیشہ ان کروڑوں انسانوں کو جن کی آبادیاں کابل کے کوہستان سے لے کر آسام کے جنگلوں تک پھیلی ہوئی تھیں، اپنے سامنے سربسجود پاتے تھے —— کون تھا جو سنگ و آہن کا دل و جگر پیدا کر کے بھی یہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح گلیوں میں مارے جائیں اور ان کی لاشیں اس عظمتِ رفتہ کا ماتم سنائیں، جو چند روز پیشتر دنیا میں صرف ان ہی کے لیے تھی ......

لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے لیے مرزا غالب دہلی میں زندہ تھے، اور دیکھتے رہے۔ یہ وہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آتے ہیں، ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور اس کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں[2] ——"

مولانا ابو الکلام آزاد

۱۸۵۷ء کا واقعہ ہماری تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بہت سخت واقعہ سہی، لیکن ہمارے ادبی اور تہذیبی اُفق کا یہ المیہ بھی بجائے خود کچھ کم تلخ حقیقت نہیں کہ "مرزا غالب جیسے غم دوست شاعر" نے "یہ سب کچھ دیکھا"، لیکن یہ سب کچھ اُن کا شعری تجربہ نہیں بن پایا۔

○

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں،

"مرزا غالب نے اپنی فارسی اور اردو تصانیفِ نظم و نثر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ

---

[1] ترجمہ: "ان کی محصوری کے دن جو کچھ پیش آیا، اس کے بارے میں نہ پوچھو۔ یہ وہ امور ہیں جو شمار میں نہیں آ سکتے ہیں"
[2] الہلال کلکتہ، ۱۷ جون ۱۹۱۴ء بحوالہ، غالب اور ابو الکلام، عتیق صدیقی، دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۵۹ - ۶۱

خونیں) پر جو کچھ لکھا ہے، اگر اُسے الگ کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم مجلّا تیار ہو جائے[1]..."

فارسی نثر میں اس موضوع پر غالب کی ایک مستقل کتاب ہے۔ "دستنبو" یہ سراسر انگریز حکام کی تائید و تحسین میں ہے اور ذاتی تحفظ اور فروغِ مراتب کی غرض سے لکھی گئی ہے، اس لیے اس کے مندرجات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں انگریزوں سے سوچی سمجھی وفاداری کا اظہار کیا گیا ہے اور غالب کا سارا زورِ بیان انگریزوں کی وکالت اور اپنی مدافعت میں صرف ہوا ہے۔ فارسی نظم میں غالب کا آخری مجموعہ "سبدچین" مطبع محمدی، دہلی سے ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ/اگست ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ، غالب کے ان فارسی اشعار پر مشتمل ہے جو "کلیاتِ غالب" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا اس کی طباعت (۱۸۶۳ء) کے بعد موزوں ہوئے۔ چالیس صفحات کے اس مختصر سے مجموعے میں دو قصیدے، ایک ترجیع بند، چھ قطعات، تین رباعیاں اور مفرد اشعار کا اسی فیصد سے متجاوز حصہ انگریز حکام کی شان میں ہے۔ حامد الہندی نے ٹھیک کہا ہے کہ:

"غالب کی ان قصیدہ خوانیوں کے مقصد کو پانا کچھ مشکل نہیں۔ غالب، ایک بڑے شاعر تھے۔ دلی کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا، وہ بہادر شاہ کے نمک خوار رہ چکے تھے۔ ایسی صورت میں انگریزوں کی نظر میں اُن کا مشتبہ ہونا کچھ بعید نہ تھا.... غالب کے لیے ضروری تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کرتے جس سے انگریزوں کے دل سے، اس شک و شبہ کو دور کرنے میں مدد ملتی اور اس کے لیے قصیدوں سے اچھا اور کون سا ذریعہ ہو سکتا تھا، چنانچہ انہوں نے یہ قصیدے لکھے اور ان کو خاص اہتمام سے شائع بھی کیا۔ اس طرح "سبدچین" کو غالب کی فارسی شاعری میں وہی درجہ حاصل ہے، جو اُن کی فارسی نثر میں "دستنبو" کو[2]......"

یہ دونوں کتابیں تاریخی اہمیت کی حامل ضرور ہیں، لیکن حاسۂ ملّی سے خالی ہیں۔ میر مہدی مجروح کے نام ۲۔ فروری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں غالب نے دلی کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

روز اِس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے۔

یہ شعر، غالب کے انتقال سے کوئی ساڑھے تین ماہ پہلے "عودِ ہندی" میں شائع ہوا (عودِ ہندی،

---

[1] ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۳ء صفحہ ۳

[2] شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء صفحہ ۳۲۱

طبع اول، مطبع مجتبائی، میرٹھ، ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸، صفحہ ۸۲) اس واقعاتی شعر کے علاوہ، جو دیوانِ غالب سے خارج ہے، اردو نظم میں، غالب کے ہاں واقعہ ستاون سے متعلق محض ایک نو شعری قطعہ ملتا ہے۔ یہ ۱۸۵۸ء کے ایک خط بنام علائی میں محفوظ ہے:

بسکہ فعّال ما یُرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
مَیں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہای پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہای گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۷ء کے بعد غالب کا اردو دیوان، ان کی زندگی میں متعدد بار شائع ہوا، لیکن اس قطعے کو دیوان کی کسی اشاعت میں جگہ نہیں ملی۔ یہ قطعہ اُن کے انتقال کے معاً بعد مارچ ۱۸۶۹ء میں، "اردوئے معلّیٰ" کے ذریعے پہلی بار سامنے آیا — اس ایک استثنا کے علاوہ، غالب کے کلام میں ہمیں ۱۸۵۷ء کے دل دوز سانحے کا کوئی تاثر یا احساس نہیں ملتا — اور یہ اتنی غیر معمولی بات تھی کہ خود غالب کی زندگی میں سوال بن کر زبان پر آگئی تھی۔ غالب نے اس کا اچھا جواز پیش کیا ہے:

"ارے بھئی! مرثیہ لکھیں تو ایک کا لکھیں، نوحہ کیجیے تو دو کا کیجیے، جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جائے تو کیا خاک بن آئے...."

"وفورِ احساس" بھی اس کا باعث ہو سکتا ہے، اسے بے بضاعتی اور بے حسی یا لاتعلقی سے بھی

---

۱ مختارِ کُل ۲ سپاہی

۳ تفصیل کیلئے دیکھئے: اشاریۂ غالب؛ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۷۹ — ۸۳

۴ اردوئے معلّیٰ، طبع اول، اکمل المطابع، دہلی، مارچ ۱۸۶۹ء، صفحہ ۳۱۰

۵ سیر دہلی؛ شیخ محمد ریاض الدین امجد، مطبع حیدری، آگرہ ۱۸۶۱ء، صفحہ ۴۴۔ بحوالہ احوالِ غالب؛ ڈاکٹر مختار الدین احمد، علی گڑھ ۱۹۵۳ء، صفحہ ۴۷

تعبیر کیا جا سکتا ہے، سبب خواہ کچھ بھی ہوا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ، غالب کے ہاں شعری تجربہ نہیں بنا ——— انقلاب کے زمانے میں اور اس کے بعد تا آخر، غالب کا رویہ جدوجہد آزادی سے کسی جذباتی لگاؤ کو ظاہر نہیں کرتا ——— اس صورتِ حال میں عرف دارانِ غالب کی یہ "وکالت" کچھ حقیقت نہیں رکھتی کہ گو غالب نے:

"۱۸۵۷ء کی تباہی پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن متفرق طور پر ان کے کلام میں..... اس داستانِ الم کی جو تفاصیل اور اشارات ملتے ہیں، وہ کسی پُر درد مرثیے سے کم نہیں اور یہ اشارات اتنے واضح اور تفاصیل اتنی کافی ہیں کہ ہم مرثیے کے عدم وجود کا شکوہ نہیں کر سکتے[1] ———"

۱۸۵۷ء کے بعد سے غالب کے آخر عمر تک کے کلام پر نظر ڈالیے تو اس میں ہمیں ستاون کی داستانِ الم کا کچھ انعکاس نہیں ملتا ——— نہ کوئی داد، نہ اس کی طرف اشارہ، نہ اس کی کوئی تفصیل۔ "فتنہ و فساد" کا یہ اثر ضرور ہوا کہ ذوقِ شعر، گویا جاتا رہا اور شعر گوئی، ایک طرح سے ترک ہی کر دی، لیکن کچھ کہا تو اپنی مدافعت اور نئے نظام کی مدحت میں!

O

"دلّی کا وہ ادبی حلقہ جس کو مرزا غالب سے ذہنی اور فنی بیر تھا، ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں پیش پیش رہا ——— مولوی محمد باقر، ایڈیٹر اُردو اخبار، دہلی ——— جنہوں نے ۱۸۴۷ء میں مرزا کی گرفتاری پر بغلیں بجائی تھیں اور کوتوال کی حمایت کی تھی، مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو برطانوی اقتدار کا خاتمہ اور مغل شہنشاہی کی بحالی سمجھ رہے تھے ——— پھر یہ کہ باغی فوج میں تنظیم کی کمی، سر شوری کی زیادتی اور اُن انگریز دل کا قتلِ عام، جن میں سے کوئی غالب کا دوست کا تھا، کوئی اُمید گاہ تھا، کوئی قدر دان تھا، کوئی مُربّی تھا ——— اور اس کے سوا یہ بھی کہ غالب کو نظر آرہا تھا کہ آخر یہ بغاوت یا جنگِ آزادی، خود اپنی کمزوریوں کی بنا پر ناکام ہونے والی ہے۔ چنانچہ انہوں نے درپردہ اپنے ایک دوست اور اُمید گاہ والیٔ رامپور کو جو خفیہ خط لکھے اور سیاسی مشورے دیے، ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ غالب کو باغیوں سے ویسی ہمدردی نہ تھی جیسی، اُن کے طبقے کے دوسرے سر برآوردہ لوگوں کو رہی۔ چنانچہ ہندوستانی تاریخ کے اس عظیم الشان واقعے پر جو آنسو ہم ان کی تحریروں سے چھنتے ہیں، اُن میں غم تو ہے آگ نہیں ہے، مرنے والوں سے چاہے وہ کالے ہوں یا

---

[1] ابوسلمان شاہجہان پوری، العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۱۰۵

ڈرے اور ڈسنے والوں سے چاہے، وہ غریب ہو یا امیر، اُن کو گہری ہمدردی ہے۔ تاہم سب کا ہے لیکن کسی فریق کی حمایت یا تائید بالاعلان نظر نہیں آتی [1]۔۔۔ "

—— ڈاکٹر ظ۔ انصاری

غالب کے تعلقات [*] حکام انگریز سے ابتدا سے خوشامدانہ تھے۔ اُن کا وظیفہ، ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کم بخت وظیفے کو واگزار کرانے کے لیے انہیں بیسیوں قصیدے انگریزوں کی مدح میں اس جوش سے لکھنے پڑے گویا اکبر و جہانگیر کی مداحی ہو رہی ہے، پھر وقت بھی ایسا پُر آشوب تھا کہ مارشل لا جاری تھا اور سولی کے تختے اور درختوں کی ٹہنیاں ہمیشہ لاشوں سے بھری رہتی تھیں۔ ان حالات کی وجہ سے وہ بڑی مجبوریوں میں پھنس گئے تھے [2]۔۔۔ "

"ہندوستانی زبان کے علاقے کی قومی بغاوت سے غالب کی یہ بیگانگی اور بغاوت کی ناکامی پر انگریز گورنروں اور افسروں کے سامنے اپنے رقیے کی صفائی دیتے پھرنا، بظاہر ایک ایسے شاعر کے لیے نازیبا معلوم ہوتا ہے جو دربارِ شاہی کا منصب دار ہو اور اِشرافیہ میں اعلیٰ مقام رکھنے کا آرزومند ہو —— جس کے کلام میں جابجا آزادی اور آزادہ روی کے وعادی پائے جاتے ہوں اور جس نے بغاوت شروع ہونے تک بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کی تعریف میں پے در پے فارسی قصائد لکھے ہوں اور جاں نثاری کے دعوے کیے ہوں لیکن اس بہ باطن بیگانگی اور بظاہر آشنائی کے پیچھے، جہاں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اقتدار پسند طبقے کی وفاداریاں سو سال پہلے سے بٹ چکی تھیں، غالب کے ددھیالی اور سسرالی خاندانوں میں بھی یہی رسم چلی آرہی تھی —— وہاں اس حقیقت پر بھی نظر جاتی ہے کہ واقعہ چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، وہ کسی وقت بھی ہوش و حواس ۔۔۔۔۔۔ سے بے بہرہ نہیں ہوتے تھے [3] —— "

یہ صحیح ہے کہ "ضرورت و احتیاج نے انھیں انگریز حکام اور گورنروں کی چوکھٹوں پر گرا دیا تھا، اور مدحیہ قصیدے نظم و نثر میں لکھواتے تھے، تاہم "مرزا صاحب مشفق و مہربان" کے خطابات اور

---

[1] شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۷، ۵۹۸

[2] الہلال، کلکتہ ۱۷ جون ۱۹۱۴ء، بحوالہ: غالب اور ابوالکلام، عتیق صدیقی، دہلی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۶۲، ۶۳

[3] ڈاکٹر ظ۔ انصاری، شاعر بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء، صفحہ ۵۹۸

ساٹھ ستر روپے کی پنشن اور خلعت اس زخم کاری کا مرہم نہیں ہو سکتا تھا، جو حوادثِ غدر سے اُن کے دل پر لگا ہوگا۔ ایک ضعیف الارادہ انسان، وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے، مگر تاہم اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے۔ علی الخصوص ایسے حادثۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ کے موقعوں پر جس کو دیکھ کر بڑے بڑے غدار و ملت فروش دلوں سے بھی آہیں نکل گئی ہوں گی[1]۔"

لیکن ۱۸۵۷ء کے "حادثۂ کبریٰ" اور "مصیبتِ عظمیٰ" پر غالب کے دلی جذبات اور اصلی و حقیقی محسوسات شعری پیکر میں نہیں ڈھلے۔ ان کا اظہار تو کچھ ان کے خطوں میں ہوا ہے جو اس موضوع پر غالب نے زیادہ تر اس احساس کے بغیر لکھے کہ یہ کبھی چھپیں گے بھی۔ خطوں میں انقلاب ستاون سے متعلق غالب کے حقیقی جذبات اور ان کا سوزِ دروں چھلکا پڑتا ہے ——— اشعارِ غالب، اس سے یکسر خالی ہیں۔ ——— اس امر پر اصرار کہ کلامِ غالب میں اس داستانِ الم کی تفاصیل محفوظ ہیں، کسی طرح درست نہیں۔ اہلِ علم نے کلامِ غالب سے اس نوع کے نتائج، اس صورت میں نکالے ہیں، جب انہوں نے غالب کے اشعار کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھا اور شاعر کے کلام کا مطالعہ تاریخی اور زمانی ترتیب سے نہیں کیا۔

O

انقلاب ۱۸۵۷ء اور اس کے اثراتِ مابعد کے بارے میں کلامِ غالب سے استشہاد کی روایت پٹنہ کے ڈاکٹر سید محمود[2] نے ڈالی۔ انہوں نے ۱۹۱۹ء میں دیوانِ غالب، نظامی ایڈیشن پر ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا اور دو برس بعد ۱۹۲۱ء میں اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے زیادہ دلچسپ بنا دیا ڈاکٹر سید محمود نے بارہ تیرہ صفحات (ص ۳۳ - ۴۵) محض اس بحث کے لیے وقف کیے ہیں کہ "انقلاب ستاون کا غالب کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا، وہ سیاسی خیالات سے بے بہرہ نہیں تھے، انہیں ملکی و قومی تباہی کا بھرپور احساس تھا ——— "۔ اپنے اس موقف کی تائید میں ڈاکٹر سید محمود نے غالب کے تیس سے زیادہ اردو اشعار پیش کیے ہیں ——— لیکن اس نکتہ آفرینی کی کچھ حقیقت اور وقعت باقی نہیں رہتی، جب یہ معلوم ہو کہ غالب کے جن اشعار کو سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ بیشتر ۱۸۵۷ء سے ۲۵ تا ۴۱ سال پہلے کے ہیں جب غالب کی عمر ۱۸ سے ۴۲ سال کی رہی ہوگی۔ ان اشعار میں سے کسی ایک کا بھی انقلاب ستاون سے کچھ تعلق نہیں ——— اگلے صفحات میں ڈاکٹر سید محمود کے مقدمے[3] کے متعلقہ اقتباسات و اشعار کو

---

[1] الہلال، کلکتہ، ۱۷ رجون ۱۹۱۴ء بحوالہ: غالب اور ابوالکلام، ایضاً، صفحہ ۹۲

[2] مقدمہ، اردو دیوانِ غالب مع شرح نظامی، نظامی پریس، بدایوں طبع ششم، ۱۹۲۷ء، صفحہ ۹ - ۴۷

[3] ڈاکٹر گیان چند کو التباس ہوا ہے کہ یہ ڈاکٹر سید محمود "سر سید کے صاحبزادے" تھے ——— (صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۵۰)

راقم الحروف کے حواشی کی روشنی میں ملاحظہ کیجئے :

"اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا ہے کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے اور ان کو ملکی و قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا۔ میرے عزیز دوست سیّد راس مسعود صاحب ..... ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

"غالب کی اکثر تحریرات میرے پاس موجود ہیں جن میں انہوں نے انگریزوں کی اور انگریزی طرزِ حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں —"

مجھے اس سے انکار نہیں۔ لیکن کسی غیر ملکی حکومت یا طرزِ حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے۔ اس لیے میں نے اس تحریر میں جا بجا خود مرزا کے اشعار اور عبارتیں نقل کر دی ہیں تاکہ تاریخی حیثیت سے بھی پتہ چل جائے کہ وہ ان حالات سے کس درجہ متاثر تھے ان کو اپنے ملک کی مٹتی ہوئی عظمت کا کتنا گہرا احساس تھا ...... غالب نے کچھ تو اس زمانے کے حالات کے اعتبار کے باعث اور کچھ خود اردو شاعری کے خاص طرزِ بیان کی وجہ سے اگر ملکی و قومی جذبات کو الفاظ میں چھپایا ہے تو ...... تعجب کا کیا مقام ہے۔"

(مقدمہ : ۴۴)

"اس زمانے میں جو حالات تھے اُس کے اعتبار سے صاف صاف الفاظ میں ان خیالات کا اظہار کرنے سے وہ معذور تھے اور مجبوراً ایسے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں ہی میں کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوتے لکھتے ہیں، "دو مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں" اور پھر کہتے ہیں :

زبان اہلِ زبان میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع [1]

اور پھر کہتے ہیں :

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے [2]

---

[1] بیاضِ غالب (نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۳، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۵، نسخۂ عرشی، اوّل، دہلی، ۱۹۵۸ء صفحہ ۴۴) میں یہ شعر موجود ہے۔ یہ بیاض خود غالب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۶ء میں مرتب ہوئی۔ ظاہر ہے یہ شعر ۱۸۵۷ء کی ملکی تباہی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔

[2] یہ شعر، نسخۂ رامپور ۱۲۳۸ھ مطابق ۱۸۲۳ء میں موجود ہے (نسخۂ عرشی ص ۲۲۴)۔ اسے بھی ۱۸۵۷ء کی تباہی سے کوئی نسبت نہیں۔

ایک اور جگہ جتایا ہے:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے[1]

(مقدمہ: ۴۲)

"ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ بہ حیثیت ایک قوم کے ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے سے پہلے ہو چکا تھا اور اُس وقت کے شعراء اور صاحبانِ سیاست دونوں نے اسے محسوس کیا۔ اہلِ سیاست کے احساس کا نتیجہ ہنگامہ ہوا اور شعراء نے مختلف طریقوں سے اس پر نوحہ کیا۔ مرزا غالب کا احساس گہرا تھا اور انہوں نے نہایت پُردرد پیرایہ میں اس کا اظہار کیا ہے:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں[2]

پھر کہتے ہیں:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے[3]

(مقدمہ: ص ۴۳، ۴۴)

---

[1] یہ شعر، نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) میں شامل ہے۔ دیکھیے نسخۂ حمیدیہ، مرتبہ: پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۲

[2] ۲۲۔ شعبان ۱۲۶۶ھ ۴۔ جولائی ۱۸۵۰ء کو غالب قلعۂ معلّی سے متعلق ہوتے۔ شاہ دہلی نے انہیں خطاب اور خلعت دیا اور سلاطین تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت، اُن کے سپرد ہوئی تو غالب نے طرزِ تازہ پر ایک غزل لکھی (دیکھیے، مکاتیبِ غالب عرشی طبع دوم، متن، ص ۵۲)۔ یہ شعر اسی غزل کے ہیں۔ ہنگامہ ستاون، اِن اشعار کے کہے جانے کے سات برس بعد وقوع میں آیا، اس لیے اِن اشعار کو ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامے کا پُر درد نوحہ خیال کرنا، ہنسی کی بات ہے۔

[3] یہ شعر بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ص ۲۲۴ - ۲۲۵؛ نسخۂ عرشی زادہ، ص ۸۹) یعنی ہنگامہ ستاون سے چالیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا!

"ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد دلی اور نواح دلی پر جو آفتیں ٹوٹتیں، انہوں نے ہزار ہا بندگان خدا کو بے خانماں اور تباہ کر دیا۔ شہزادے اور شہزادیاں جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے دلی اجڑ گئی اور شرفاء کے مکان ویران و برباد کر دیے گئے ...... ان واقعات کو مرزا غالب نے بچشم خود دیکھا تھا، غالباً اسی کے متعلق فرماتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں[1]"

(مقدمہ، ص ۳۴)

"اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں، ان پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں...
...خاص کر مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ مرزا لکھتے ہیں ......:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں، دکھاتا ورنہ تجھ کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

---

[1] یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے۔ دیکھیے:
نسخۂ شیرانی مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۹ء ورق ۴۲ ب (حاشیہ)
اس لیے یہ یقیناً ۱۸۵۷ء کے واقعات سے متعلق نہیں۔

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا[۱]

(مقدمہ صفحہ ۳۴-۳۵)

"جو مصائب اہلِ ہند پر، ۱۸۵۷ء کے کچھ پہلے اور پھر اُس کے بعد نازل ہوئے، وہ بجائے خود آئندہ کے لیے ایک سبق تھے، جس کو مرزا نے کس خوبی سے ادا کیا ہے اور ان کی خواہش ہے کہ ان کے ہم وطن، اُن سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے مُتنبّہ ہوں:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث، مکتب
لطمۂ موج، کم از سیلیِ استاد نہیں"[۲]

(مقدمہ ۳۶)

---

[۱] یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ میں دیکھے جا سکتے ہیں (صفحہ ۴۲)، مقطع بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں شامل ایک غزل کے مقطع (نقوش، ص ۹۶-۹۷، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۲۵) کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۳۵ برس پہلے کے ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا کہ "۱۸۵۷ء میں اپنے ملک و شہر کے لوگوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں اُن پر مرزا خون کے آنسو بہاتے ہیں" یا یہ اصرار کرنا کہ ان اشعار میں: "اُن مظالم" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء میں خاص کر مسلمانوں پر توڑے گئے کسی طرح صحیح نہیں۔

[۲] یہ شعر نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے ورق ۴۳-ب پر موجود ہے یعنی ۱۸۵۷ء سے تیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ حکم لگانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے اور اس کے بعد اہلِ ہند پر جو مصائب نازل ہوئے" غالب نے انہیں خوبی سے شعر میں ادا کیا ہے؟ یا یہ کہ غالب کی خواہش یہ تھی کہ اُن کے ہم وطن اُن مصائب سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لیے مُتنبّہ ہوں ـ ؟؟"

"دلّی فتح ہونے کے بعد نہ صرف اہلِ دہلی نے بلکہ تقریباً تمام ملک نے انگریزی سرکار کی اطاعت قبول کرلی اور طرح طرح سے اپنی وفاداری کا اظہار کرنے لگے لیکن حکامِ انگریزی کا جوشِ انتقام کم نہ ہوا ہنگامے کے حالات اُن کو فراموش نہ ہوتے ۔ لوگوں کو سزائیں دی گئیں ۔ اُمرا کی جاگیریں ضبط ہوئیں ۔ غربا کے مکانات مسمار کر دیتے گئے ۔ مرزا ان حالات کا ذکر ...... شکایت کے پیرایہ میں یوں کرتے ہیں :

واے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں ہے[۱]"

(مقدمہ : ۳۶)

"ایک اور جگہ رقم فرماتے ہیں : " بھائی ، بڑی آپنی ہے " ...... اور پھر جو سزائیں دی گئیں ، ان کی سختی کی گویا یوں شکایت کرتے ہیں :

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گنہگار ہوں ، کافر نہیں ہوں میں[۲]"

(مقدمہ ۳۶، ۳۷)

"ایک دوست کو لکھتے ہیں : بھائی ہندوستان کا قلمرو بے چراغ ہوگیا ، لاکھوں مر گئے ، جو زندہ ہیں ، ان میں سیکڑوں گرفتارِ بندِ بلا ہیں ۔ " ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر .... کرتے ہیں .... حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں بہت کم فاتحین نے اپنے مغلوب حریف کے اہل و عیال و نسل کے ساتھ اس قسم کا سخت برتاؤ کیا ہوگا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندوں نے بہادر شاہ کے خاندان کے ساتھ روا رکھا ۔ ان تمام خیالات کے ہجوم سے مرزا غالب اِس قدر متاثر ہیں کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جاتا ہے اپنے دردِ دل کا اظہار ذیل کے اشعار میں کس خوبی سے اور کتنے پُر درد الفاظ میں کرتے ہیں :

---

[۱] یہ شعر بھی نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) میں شامل ہے (ورق ۴۳ ۔ ب) اس لیے یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ اس میں اُس ہنگامے کے حالات کا ذکر شکایت کے پیرائے میں ہوا ہے جو بجائے خود اس شعر کے کامل اکتیس برس بعد ظہور پذیر ہوا ۔

[۲] یہ شعر ، غالب کی اُس غزل کا ہے جو غالب نے بہادر شاہ ظفر سے خطاب و خلعت اور خدمت پانے پر طرزِ تازہ میں ۴ ۔ جولائی ۱۸۵۰ء یا اس کے معاً بعد لکھی ، اسے واقعۂ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں دیکھنا درست نہیں ۔

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج "[1]

(مقدمہ ۳۸)

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے اُن کے حُبِّ وطن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ بار بار اپنے مُلک کی بدنصیبی پر روتے ہیں۔ ایک ...... جگہ فرماتے ہیں:

ہندوستان سایۂ گل، پایۂ تخت تھا
جاہ و جلال عہدِ وصالِ بُتاں نہ پوچھ

---

[1] پہلا شعر، بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ص ۱۰۶ - ۱۰۷، نسخۂ عرشی زادہ، ص ۲۰) اور دوسرا شعر، نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) صفحہ ۹۲ کے حاشیے پر موٹے قلم سے شکستہ خط میں تحریر ہوا ہے۔ گویا دونوں شعر، ۱۸۵۷ء سے ۳۵، ۴۰ سال پہلے کے ہیں، اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غالب نے یہ شعر اہلِ ہند کی تباہی اور بہادر شاہ کے اہل و عیال پر انگریز حکام کے ظالمانہ سلوک سے متاثر ہو کر قطعاً نہیں لکھے ۔۔ غالب کے ایک جدید شرح نگار نے بھی ان اشعار کی توجیہہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے پس منظر میں کی ہے۔ اس کا یہاں درج کر دینا لُطف اور عبرت سے خالی نہ ہوگا:

" غالب کا یہ شعر غالباً اُن ایام میں لکھا گیا جب کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء واقع ہوا، یا بعد میں مگر اشارہ انہیں حالات کی طرف ہے، جو اس ہنگامے میں دہلی والوں پر گذرے۔ یہاں "گلشن" سے مُراد دہلی سے ہے اور "قمری" دہلی والوں سے۔ اس وقت دہلی کی تمام آبادی بہ استثنائے چند، جن کی رعایت انگریزوں کو منظور تھی، سب دہلی سے نکال دی گئی تھی۔ گھر کی محبت کس کو نہیں ہوتی اور بالخصوص جب بے سروسامانی کی حالت میں باہر پڑے ہوتے ہوں۔ باہر نکالے ہوئے لوگ رات کے اندھیرے میں چوری چھپے شہر میں داخل ہوتے اور پہرہ داروں سے بچ کر اگر گھر پہ پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو حکومت کا تالا لگا ہوا دیکھ کر مایوسی کی وجہ سے چوکھٹ پر سر ٹکا دیتے۔ اس زمانے میں کنڈا، زنجیر عام طور پر نیچے چوکھٹ میں ہی لگائی جاتی تھی۔ ان حالات کا بیان غالب اس شعر میں کرتے ہیں .... دوسرا شعر بھی اسی تأثر کے تحت لکھا گیا ہے۔"

(صاحب زادہ احسن علی خاں، مفہومِ غالب، مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۴)

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ[1]

(مقدمہ: ۳۹)

"ایک خط میں لکھتے ہیں، خدا وند کیا تم دلّی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو؟ بادشاہ کے دم تک یہ باتیں تھیں۔" ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں: "ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گذری۔ اموال کیا ہوئے، اشخاص کہاں گئے۔ خاندانِ شجاع الدولہ کے زن و مرد کا کیا انجام ہوا؟......ان تمام واقعات دل خراش پر روتے ہیں اور فرماتے ہیں:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں[2]

کس قدر معنی خیز اور دردناک شعر ہے۔" (مقدمہ: ۳۹)

"اگر مرزا غالب کے دیوان کو بغور پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو اپنے ملک سے کس درجہ محبت ہے۔ اپنے ضائع شدہ قومی وقار کا کس درجہ رنج ہے اور اپنی کھوئی ہوئی ملکی آزادی پر اُن کے آنسو کبھی نہیں تھمتے۔ فرماتے ہیں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں[3]

(مقدمہ: ۳۹-۴۰)

---

[1] یہ اشعار بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) سے ماخوذ ہیں (نقوش، ص ۱۹۲-۱۹۳، نسخۂ عرشی زادہ ص ۳۷) یعنی ۱۹ برس کی عمر کے غالب کے اور انقلاب ۱۸۵۷ء سے ۴۱ برس پہلے کے۔ اول الذکر شعر کی سند کے ساتھ بدر آفریدی نے بھی لکھا ہے کہ:

"غدر میں ہندوستانیوں کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی کے بعد دلی پر جو کچھ گزری، اس پر غالب کا دل رو پڑا۔" (بدر آفریدی، ادبی اقدار، اردو ریسرچ اکاڈمی، رامپور، ۱۹۷۳ء، ص ۶۰)

[2] [3] یہ اشعار غالب کی اس غزل سے ہیں جو دہلی اردو اخبار جلد ۱۳، نمبر ۳۲ مورخہ ۲۱ شوال ۱۲۶۸ھ مطابق ۸ اگست ۱۸۵۲ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ یہ اس ہفتے کا کلام ہے (نسخۂ عرشی، ص ۳۴۷) ظاہر ہے یہ اشعار اس وقت کے ہیں جب دلّی آباد، قلعہ معمور، سلطنت بدستور اور حکمراں (بادشاہ) موجود تھا!

"اس وقت ملک کی جو حالت تھی، اُسے یاد کر کے کہتے ہیں :

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہاں ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسماں ہے [۱]

(مقدمہ: ۴۰)

"اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے ہیں، لیکن ضبط نہیں ہوتا اور بے اختیار چیخ اٹھتے ہیں :

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں [۲]

(مقدمہ: ۴۰)

"جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا اور سلطنت کے مالک بن بیٹھے، اس وقت سے برابر ان کا یہی دعویٰ رہا کہ وہ ہندوستان میں صرف ہندوستانیوں کے مفاد کی غرض سے حکومت کر رہے ہیں اور یہ کہا گیا کہ ملکِ ہندوستان کی حکومت، ہندوستانیوں کو رفتہ رفتہ دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آئے گا جب حکومت کی ساری ذمہ داری اہلِ ہند کے سپرد کر دی جائے گی۔ مرزا غالب کہتے ہیں اور حسرت و مایوسی کے ساتھ کہتے ہیں :

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک،

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک [۳] (مقدمہ: ۴۱)

---

[۱] یہ شعر ۱۸۵۷ء سے چالیس سال سے بھی زیادہ پہلے کا ہے اور بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء) میں موجود ہے (نقوش، ۲۹۶، ۲۶۷؛ نسخۂ عرشی زادہ، ۱۱۰)

[۲] یہ شعر ملکی آزادی کے جانے سے کئی برس پہلے (اگست ۱۸۵۲ء) کا ہے!

[۳] یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ ۱۸۲۱ء میں شامل ہیں (نسخۂ حمیدیہ، ص ۱۲۸) اور کوئی متعین سیاسی پس منظر نہیں رکھتے۔

"۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد فاتح کے جوشِ انتقام نے مفتوح کے ملک و دولت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ اُن کے سرمایۂ ناز کارنامے اور فن و کمال، یہاں تک کہ ان کی تہذیب کو مٹانے اور برباد کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ مرزا غالب جیسے باکمال شاعر اور صاحبِ دل پر اس کا اثر نہ ہوتا۔ چنانچہ جس پوشیدہ مگر دردناک پیرایہ میں انہوں نے اس کا مرثیہ لکھا، وہ حقیقتاً دل ہلا دینے والا ہے اور ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رُلواتا ہے۔ اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر دل نہیں مانتا:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغباں و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے[1]

(مُقدمہ: ۳۷، ۳۸)

حقیقت یہ ہے کہ اشعارِ غالب کا واقعاتِ ستاون پر انطباق اور اشعارِ غالب کے لیے سنہ ستاون کے چوکھٹے یا پس منظر کی فراہمی، تاریخی غلطی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سیاق و سباق میں کلامِ غالب کی توجیہہ، دراصل نتیجہ ہے۔ غالب کے کلام کی زمانی ترتیب سے صرفِ نظر کا ——— اور یہ

---

[1] غالب کی یہ غزل ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے اکتیس برس پہلے کی زائیدۂ فکر ہے یہ نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے ورق ۶۱ - ب پر مندرج ہے۔ اِس غزل کو ۱۸۵۷ء کے حوالے سے "دل ہلا دینے اور خون کے آنسو رُلوا دینے والا دردناک مرثیہ" قرار دینا، تاریخی اعتبار سے صریح غلطی ہے۔ — دود آفریدی نے بھی اس قطعہ بند غزل کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ "مابعد غدر" غالب کی حد درجہ حسرت سامانیوں پر مظہر ہے۔
(ادبی اقدار، اثر دود ریسرچ اکاڈمی، رامپور، ۱۹۷۳ء ص ۹۰)

خرابی یا خصوصیت ڈاکٹر سیّد محمود ہی سے خاص نہیں ، جب اور جہاں غالب کے مُفسروں نے اِس کا لحاظ نہیں رکھا ، استنباطِ نتائج میں ٹھوکر کھائی ہے ـــــ اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں عہدِ موجودہ تک چلا آتا ہے :

"غالب ، ابھی مکتب ہی میں تھا کہ اُس نے شاعری شروع کردی ، لیکن اس کا کمال ، ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوتا ہے"[لہ]

ـــــ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

"مغلیہ سلطنت کے جانے سے جو صدمہ غالب کو ہوا ، اُس کا اثر غالب کے کلام میں درد و سوز سے پایا جاتا ہے"[ٹہ]

ـــــ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

یہ کہنا صحیح نہیں کہ غالب کا شعری کمال ، ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوا ، اس فتنہ و فساد کے بعد تو خود غالب کے بقول :

"شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی ـــ" (بنام : مسرور ، ۱۸۵۹ء)

"بعد غدر ، ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ . . . . دو تین غزلیں فارسی ، ہندی لکھی ہیں ـــ"

(بنام : کلب علی خاں ، ۱۰ . ستمبر ۱۸۶۶ء)

اور انقلاب ستّاون کے بعد کی یہ چند چیزیں غالب کے کمالِ شعری پر دال نہیں - اِسی طرح مغلیہ سلطنت کے جانے کے کس صدمے کا کوئی اِنعکاس یا اثر بھی درد یا سوز کے ساتھ کلامِ غالب میں نہیں ملتا ۔

O

ڈاکٹر حبشی حب دید اقبال ، چودھری محمد حُسین مرحوم کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب کے :

"سارے کلام میں صرف ایک شعر ہندی اسلام کے دورِ تنزل کی عکاسی کرتا ہے جو بہادر شاہ ظفر کے متعلق ہے ،

اک شمع رہ گئی ہے ، سو وہ بھی خموش ہے ـــ"

[متے لالہ فام ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ۲۰۹]

یہ شعر ، بہادر شاہ ظفر سے متعلق نہیں ، انقلاب ستّاون سے تیس کتیس برس پہلے ، یہاں تک کہ ظفر کی تخت نشینی سے بھی دس گیارہ سال قبل کا ہے ، دیکھیے : نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) ، ورق ۶۱ - ۹

O

"غالب کے عہد میں ہم پر جو وقت پڑا تھا ، اُس کا شعور اور اس کی ترجمانی غزلیات (غالب) میں عمومیت اور آفاقیت کے انداز میں ہے . . . . . جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جب انگریزوں کی وحشت و بربریت کی یلغار زوروں پر ہے ، ہر طرف کشت و خون اور شکست و ریخت کا ہنگامہ گرم ہے ، غالب گہرے دُکھ کے ساتھ سوچ رہے ہیں :

دل تا جگر ، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب ــ اس رہ گزر میں ، جلوۂ گل ، آگے گرد تھا
ہے موجزن اک قلزمِ خوں ، کاش ! یہی ہو ــ آتا ہے ابھی ، دیکھیے ، کیا کیا مرے آگے

[فتح محمد ملک ، صحیفہ ، لاہور اکتوبر ۱۹۶۹ء ، ص ۸۱]

سند اور تائید میں غزلیاتِ غالب سے جو دو شعر پیش کیے گئے ہیں ، اُن میں سے پہلا نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) سے

لہ اور ٹہ (و) ہم قلم ، کراچی ، اگست ۱۹۶۲ء ، ص ۹۶

(ب) اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی ، ۱۹۶۶ء ، جلد ۲ ، ص ۳۴۴

یعنی جنگِ آزادی سے چھتیس برس پہلے کا ادھورا شعر نسخۂ رامپور جدید (۱۸۲۱ء) میں موجود ہے۔ اِن اشعار کو جنگِ آزادی میں ناکامی، انگریزوں کی وحشت و بربریت کی پُر زور یلغار اور ہمہ جہتی کُشت و خون اور شکست و ریخت کے ہنگامۂ گرم پر غالب کے گہرے دُکھ اور فکر سے تعبیر کرنا درست نہیں۔

O

غالب کے شعری رویے پر انقلابِ ستاون کے اثرات کا کچھ اندازہ، خطوطِ غالب کے حوالے سے ممکن ہے۔ اشراف و اعیان ہی انقلاب کا شکار نہیں ہوتے، یہ سیلابِ بلا ہمارے بیش قیمت علمی اور تہذیبی سرمائے کو بھی بہا لے گیا، قلمی نسخے مِٹ گئے، کتابیں لُٹ گئیں۔

" انصاف کرو، کتاب کوئی سی ہو، اس کا پتہ کیونکر لگے؟ لُوٹ کا مال چوری چوری کونے کھتروں میں بِک گیا اور اگر سڑک پر بھی بِکا تو میں کہاں دیکھوں؟ صبر کرو اور چپ ہو رہو۔ "

(ثاقب، ۱۰ فروری ۱۸۵۸ء)

" آپ مرزا صابر (قادر بخش) کا تذکرہ (گلستانِ سخن) مانگتے ہیں۔ اس کا حال یہ ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا، اب ایک جلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔[1] "

(بنام حبیب اللہ ذکا، ۱۲ مئی ۱۸۶۶ء)

" خداوند کیا تم دلّی کو آباد اور قلعے کو معمور اور سلطنت کو بدستور سمجھے ہوئے ہو جو حضرتِ شیخ (کلیم اللہ جہاں آبادی) کا کلام اور صاحب زادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمت کا حال پوچھتے ہو؟ "ایں دفتر را گاؤ خورد، گاؤ را قصاب بُرد و قصاب در راہ مُرد" بادشاہ ظفر، کے دم تک یہ باتیں تھیں۔ خود میاں کالے صاحب مغفور (بہادر شاہ ظفر کے مرشد) کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی۔ کاغذ کا پُرزہ، سونے کا تار، پشمینہ کا بال باقی نہ رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمت اللہ علیہ کا مقبرہ اُجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اُن کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر، اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ اُن کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا، کچھ تبرکات بھی تھے۔ اب جب لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں؟ کیا کروں؟ کہیں سے یہ مدعا حاصل نہیں ہو سکے گا۔ "

(احمد حسن مودودی، یکم ستمبر ۱۸۶۳ء)

---

[1] مرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ "گلستانِ سخن" ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۵ء میں مکمل ہوا اور اسی سال مطبع مرتضوی، دہلی سے پہلی بار شائع ہوا۔ طبع اوّل کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو، پاکستان (کراچی) کے کتب خانۂ خاص میں موجود ہے اور ایک مجلد مجلس ترقی ادب، لاہور کے کتب خانے کی زینت ہے۔

خود غالب کے سرمایۂ علمی کا ایک بڑا حصہ ، ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد میں غارت ہوا۔ اس آفت کا ذکر انہوں نے اپنے خطوں میں اکثر بڑے درد اور حزن و رقت کے ساتھ کیا ہے :

"حضرت! اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لٹ گیا ۔"

(نواب کلب علی خاں، ۲۴ ستمبر ۱۸۶۶ء)

" غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں بہادر اور ناظر حسین مرزا ہندی اور فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو اُن دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی - نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں ؟ "

(یوسف علی خاں عزیز، نومبر ۱۸۵۹ء)

" میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو اُن کے لاکھوں روپے کے گھر لٹ گئے جس میں ہزاروں روپے کے کتاب خانے بھی گئے، اس میں وہ مجموعہ ہائے پریشان بھی غارت ہوئے ۔ "

(چودھری عبدالغفور سرور، جولائی ۱۸۵۹ء)

" میرا کلام کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کی فکر تھی، وہ مسودات مجھ سے لے کر جمع کرتے تھے۔ سو اُن دوستوں کا، زمانۂ غدر میں گھر ہی لٹ گیا، نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا، پھر میں اپنا کلامِ نظم و نثر کہاں سے لاؤں ؟ "

(تمنا مرزا پوری، ۱۳۔ جولائی ۱۸۶۷ء)

" میرا ایک سببی بھائی ہے، نواب ضیاء الدین خاں سلمہ اللہ تعالیٰ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا...... سب نسخے اس کے کتب خانے میں تھے۔ وہ کتاب خانہ، جو عرض کرتا ہوں، بیس ہزار روپے کی مالیت کا ہوگا، لٹ گیا، ایک ورق نہیں رہا ۔ "

(صاحب عالم، جولائی ۱۸۶۱ء)

" کیا کہوں تم سے، ضیاء الدین خاں جاگیر دار، لوہارو، میرے سببی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں، میں نے کچھ لکھا، وہ انہوں نے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ "کلیاتِ نظم فارسی" چوّن پچپن جزو اور "پنج آہنگ" اور "مہر نیمروز" اور "دیوانِ ریختہ" سب مل کر تخمیناً سوا سو جزو مطلّا اور مذہّب اور انگریزی ابری کی جلدیں الگ الگ، کوئی

ڈیڑھ سو دو سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب یک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادے نے اس مجموعۂ نظم و نثر کی نقل لی، اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہاں سے یہ فتنہ برپا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہوں کا کتاب خانہ، خوانِ یغما ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے۔ کہیں سے، ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ نہ آئی۔ وہ سب قلمی ہیں...... اگر کہیں ان میں سے کوئی نسخہ بکتا ہوا آوے، تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا۔ میں قیمت بھیج کر منگوا لوں گا۔"

(آرام، ۱۱ر دسمبر ۱۸۵۸ء)

"یہ شہر بہت غارت زدہ ہے۔ نہ اشخاص باقی، نہ امکنہ۔ کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا، اگر میری نظم و نثر کے رسالوں سے کوئی رسالہ آجائے گا تو وہ مول لے کر خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔"

(جنوں، ۲۲- فروری ۱۸۶۱ء)

یہی نہیں کہ غالب کا سرمایۂ علمی، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی ۱۸۵۷ء کے فتنہ و فساد کی نذر ہوا۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ستم یہ کہ اس غارت گری کے نتیجے میں غالب کا ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا، سخن سنجی اور جوہر فکر کی درخشندگی جاتی رہی۔ قوتِ ناطقہ پر تصرف باقی نہ رہا اور وہ شعر سے بیزار ہو گئے:

"بھائی ضیاء الدین خاں کا مجموعۂ نثر و نظم فارسی اور اردو سراسر دیکھا ہوا میرا، جو اُن کے کتاب خانے میں تھا، غدر میں لُٹ گیا۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ...... دو تین غزلیں فارسی، ہندی...... لکھی ہیں۔"

(نواب کلب علی خاں، ۱۰ر ستمبر ۱۸۶۶ء)

"شعر کو مجھ سے اور مجھ کو شعر سے ہرگز نسبت باقی نہیں رہی۔ اس فتنہ و فساد (۱۸۵۷ء) کے بعد ایک قصیدہ جو "دستنبو" (نومبر ۱۸۵۸ء) میں ہے اور ایک قصیدہ (مارچ اپریل ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال (جارج ایڈمنسٹن) کی مدح میں ایک اور قصیدہ (مارچ ۱۸۵۹ء) نواب لفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب (سر رابرٹ منٹگمری) کی مدح میں اور دو بیت کا ایک قطعہ اور ایک رباعی، اس نظم کے سوا، اگر کچھ لکھا ہو تو مجھ سے قسم لیجیے۔"

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۹ء)

"فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود یا مخبر

ہزاروں کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، عزم سفر پہ کھڑا ہے، پا بر کاب ہوں۔"

(جنوں بریلوی، ۸۔ ستمبر ۱۸۵۹ء)

" میں اموات میں ہوں، مُردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟..... گورنمنٹ کے دربار میں ہمیشہ سے میری طرف سے قصیدہ نذر گزرتا ہے..... خلعت (وغیرہ)...... مجھ کو ملا کرتا ہے۔ اب نواب گورنر جنرل بہادر یہاں آتے ہیں، دربار میں بُلائے جانے کی توقع نہیں، پھر کس دل سے قصیدہ لکھوں؟ صناعت شعر، اعضاء و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیئے، دماغ چاہیئے، ذوق چاہیئے، اُمنگ چاہیئے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں؟ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اس کے اسباب کہاں؟ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہِ راجِعُون۔

(چودھری عبدالغفور سرور ۱۸۵۹ء)

" اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورنمنٹ کا مداح تھا، مدح کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، مدح متروک۔ نہ غزل، نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں۔ پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کی سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں۔ اصلاح پا جاتے ہیں۔ باور کرنا اور مطابق واقعہ سمجھنا۔"

(علائی ۲۔ جولائی ۱۸۶۰ء)

" میں شاعرِ سخن سنج، اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں کا ہوں۔ بنا دش ذ سمجھنا شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا؟۔"

(تفتہ، ۱۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء)

" نثر کیا لکھوں گا اور نظم کیا کہوں گا۔ وہ نثر جو تم دیکھ گئے ہو وہی دو چار ورق ("دستنبو") اور بھی سیاہ کیے گئے ہیں..... جب آؤ گے اور مجھ کو جیتا پاؤ گے تو دیکھ لوگے۔"

(مجروح، ہفتم فروری ۱۸۵۸ء)

" نظم و نثر کا کام صرف پچاس برس کی مشق کے زور سے چلتا ہے، ورنہ جوہرِ فکر کی درخشندگی کہاں؟ بوڑھا پہلوان پیچ بتاتا ہے، زور نہیں دلوا سکتا۔"

(سیّد احمد حسن ۲۱۔ ستمبر ۱۸۶۰ء)

" قصیدے کا قصد ..... تو کر سکتا ہوں، تمام کون کرے گا ؟ سوائے ایک ملکے کے کہ دُہ پچاس برس کی مشق کا نتیجہ ہے، کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے، مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی اور کیوں کر یہ شعر کہے تھے ؟ "

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۹۔ نومبر ۱۸۶۰ء)

" از دیر باز بنظم و نثر نمی گرایم بنظم خواہی پارسی، خواہی اردو، خوابیست فراموش ۔ "

(رفعت بھوپالی، انشائے نورچشم ۔ ۱۴۔ اپریل ۱۸۶۱ء، بحوالہ مقدمہ دیوانِ غالب، عرشی ص، ۶۸)

" میاں! تمہاری جان کی قسم، نہ میرا اب ریختہ لکھنے کو جی چاہتا ہے، نہ مجھ سے کہا جائے۔ اس دو برس میں صرف وہ پچیس شعر بطریق قصیدہ تمہاری خاطر سے لکھ کر بھیجے تھے (ایڈن برون کے بیٹے کی ولادت کا اکیس شعری قصیدۂ اردو، جسے آرام نے غالب سے لکھوا کر ایڈن برون کو پیش کیا) سوائے اس کے اگر میں نے کوئی ریختہ کہا ہوگا تو گنہ گار، بلکہ فارسی غزل بھی واللہ نہیں لکھی۔ صرف دو قصیدے لکھے ہیں۔ کیا کہوں کہ دل و دماغ کا کیا حال ہے ؟ ۔ "

(شیو نرائن آرام، ۲۲۔ اپریل ۱۸۵۹ء)

" گماں زیست بود بر منت ز بے دردی
بد است مرگ، و لے بدتر از گمانِ توئیست

مجھے زندہ سمجھتے ہو، جو نثر فارسی کی فرمائشیں کرتے ہو، غنیمت نہیں جانتے کہ مُردہ کچھ لکھ کر بھیج دیتا ہے ؟ "

(غلام نجف خاں (؟)، ۱۸۔ جولائی ۱۸۵۸ء)
[خطوطِ غالب، مولانا غلام رسول مہر جلد ۲، صفحہ ۹۴۴]

" میرا حال اس فن (شعر و سخن) میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے شعر سب بھول گیا۔ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے، سو گاہ گاہ جب دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے !

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چُپ ہو جاتا ہوں :

اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے ؟

(چودھری عبدالغفور سرور، ۱۸۵۸ء)

"میاں کیا باتیں کرتے ہو ؟ میں کتابیں کہاں سے چھپواتا ؟ روٹی کھانے کو نہیں، شراب پینے کو نہیں ...... کتابیں کیا چھپواؤں گا ..

(مجروح، اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"اگر مجھے قوتِ ناطقہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو ..... حضرت کی مدح میں ایک قصیدہ لکھتا۔"

(جنوں بریلوی، ۴ جنوری ۱۸۶۴ء)

"اس تین برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں ؟ روح میری، اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ یہ جو لکھا ہے، بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے۔"

(جنوں بریلوی، ۱۹ جون ۱۸۶۳ء)

"اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار!"

(تفتہ، ۱۸۶۳ء)

"اِدھر قصیدے کی فکر، اُدھر روپے کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے وہ روپے کی فکر میں پریشان۔"

(تفتہ، ۴ مارچ ۱۸۶۳ء)

"سُبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو!"

(تفتہ، جولائی ۱۸۶۴ء)

"ہے ہے تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالبؔ شعر کہتا ہے ؟ یا کہہ سکتا ہے ؟"

(نیر کاکوروی ۱۸ جنوری ۱۸۶۴ء)

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ :

"ساٹھ برس کی زندگی میں غالب کے ذہن اور زندگی پر یہ آخری اور سب سے بڑی ضرب تھی۔ اس زمانے میں اور اس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے، ان کی توجہ نثر پر رہی۔ فارسی میں کم اردو میں زیادہ۔"

(غالب شناسی، بمبئی ۱۹۶۵ء، ص ۸۱)

انقلاب ستاون نے غالب سے دولتِ شعری چھین لیا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کے درمیان غالب نے گنتی کے شعر کہے۔ سخن سنجی جاتی رہی اور صرف سخن فہمی رہ گئی تھی اسی لیے شیخ محمد اکرام کا خیال ہے کہ :

"غدر اور غدر کے بعد جو اشعار لکھے گئے .... وہ تین اردو غزلیں اور چند فارسی قصائد ... ان سے ایک علاحدہ دورِ شاعری ترتیب دینے میں کوئی مصلحت نہیں — حقیقتاً یہ زمانہ مرزا غالب کی اردو نثر کا تھا۔"

(غالب نامہ، طبعِ اول ۱۹۳۶ء، ص ۱۷۱)

غالب نے اسی زمانے میں یہ جو لکھا ہے کہ : "اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار" یہ بے مبالغہ اور بیان واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ شیخ محمد اکرم کی اشعار شماری کے مطابق :

"چوتھے دور (۱۸۵۶ء — ۱۸۶۹ء) میں جس میں شاعر کا چودہ برس کا کلام درج ہے، مرزا غالب نے ایک قطعہ اور ایک غزل فقط دو نظمیں اردو میں لکھی ہیں —"

(غالب نامہ، طبع اول ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۶۳)

اکرام صاحب کے یہ اعداد و شمار قریب چالیس برس پہلے کے ہیں۔ اس دوران میں نئے مآخذ سے غالبیات میں اضافہ ہوا ہے۔ غالب کے خطوط یا دیگر ذرائع کی بنیاد پر، اب ہم غالب کے جن اردو اشعار کو ہنگامہ ستاون کے بعد سے آخر عمر ۱۸۶۹ء تک کے درمیان کا قرار دے سکتے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے : سات غزلیں، گیارہ قطعات، چار قصائد، تین رباعیات، ایک مرثیے کے تین بند، تین شعر مثنوی کی صنف سے اور کچھ متفرق اشعار! یہ ہے انقلاب اور اس کے بعد سے انتقال تک کے بارہ برسوں کا کل شعری اکتساب، اس کا بھی زیادہ حصہ غالب کے لفظوں میں "بلند رتبہ نہیں" — ان میں سے بیشتر چیزیں فرمائشی، ہنگامی اور وقتی نوعیت اور اہمیت کی ہیں — انقلاب ستاون کی غارت گری کے اس المیے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا :

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اس میں دم کیا ہے

(بنام مہر ۱۸۵۸ء)

اس کے برعکس نثر نگار غالب کا ظہور انقلاب ستاون کے بعد ہوا۔

"حقیقتاً یہ زمانہ (۱۸۵۷ء — ۱۸۶۹ء) مرزا غالب کی اردو نثر کا تھا[1]"

— ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

---

[1] غالب نامہ، طبع اول ۱۹۳۶ء، صفحہ ۱۷۱

"اس زمانے (١٨٥٧ء) میں اور اس کے بعد جب تک وہ (مرزا غالب) زندہ رہے، ان کی توجہ نثر پر رہی، فارسی میں کم اور اردو میں زیادہ [1]"

—— ڈاکٹر ظ۔ انصاری ——

غالب کی معروف اور ضخیم فارسی نثری کتب "پنج آہنگ" (١٨٤٩ء) اور "مہر نیمروز" (١٨٥٤ء) انقلاب سے پہلے کی ہیں۔ ١٨٥٧ء کے بعد فارسی نثر میں غالب کی صرف دو مختصر کتابیں شائع ہوئیں: ایک دستنبو (١٨٥٨ء) اور دوسری "قاطع برہان" (١٨٦٢ء) جس کی دوسری اشاعت معمولی رد و بدل اور کچھ مزید فوائد و مطالب کے ساتھ "درفش کاویانی" کے اضافی نام کے ساتھ ١٨٦٥ء میں سامنے آئی۔ "دستنبو" براہ راست انقلاب ستاون سے متعلق ہے جبکہ "قاطع برہان"، کو ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کے بقول: "دستنبو" کا تتمہ معنوی سمجھنا چاہیے [2]"

اردو نثر میں غالب کی کوئی کتاب سرے سے ماقبل انقلاب شائع نہیں ہوئی۔ اُن کی نثر اردو کی سب کی سب کتابیں ١٨٥٧ء کے بعد چھپیں۔ مباحثۂ برہان کے سلسلے کی چار کتابیں: لطائف غیبی (١٨٦٤ء) نامۂ غالب (١٨٦٥ء) سوالات عبدالکریم (١٨٦٥ء) اور "تیغ تیز" (١٨٦٨ء) تو لکھی بھی گئیں ١٨٥٧ء کے بعد۔ ایک سلسلے سے ایام انقلاب میں غالب کی خانہ نشینی کا حاصل ہیں۔ خطوط غالب کے سارے مجموعے بھی انقلاب کے بعد منظر عام پر آئے، دو ان کی زندگی میں: "عود ہندی" (١٨٦٨ء)، "اردوئے معلیٰ" (١٨٦٩ء) اور متعدد ان کی زندگی کے بعد، "مکاتیب غالب" (١٩٣٧ء) "نادرات غالب" (١٩٤٩ء)، "غالب کی نادر تحریریں" (١٩٦١ء) وغیرہ —— ان خطوط کا اسّی فیصد سے متجاوز حصہ انقلاب ستاون کے بعد کا ہے۔

اس عقب میں یہ کہنا بے جا نہیں کہ انقلاب ١٨٥٧ء نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اس انقلاب کے بعد ہوا۔ اور اُن کا کل سرمایۂ نثر اردو کسی نہ کسی سطح پر اسی انقلاب ہی کی دین ہے۔

---

[1] غالب شناسی، طبع اوّل ١٩٦٥ء، صفحہ ٨١
[2] غالب نامہ: آثار غالب، طبع چہارم، بمبئی، صفحہ ١٦٧

مزار غالب کی پرانی صورت

ضمیمہ اوّل :

مضمون اسداللہ خاں غالب درباب :

تباہی شہر دہلی

مطبوعہ :

[رسالہ دہلی سوسائٹی، شمارہ اوّل ۱۸۶۶ء ص ۲۲ - ۲۴]

رسالہ دہلی سوسائٹی، شمارہ اوّل (مطبوعہ ۱۸۶۶ء در مطبع سراجی، دہلی) میں غالب کا ایک مضمون بعنوان: "مضمون نواب اسد اللہ خاں صاحب المتخلص بہ غالب"، چھپا ہے (صفحہ ۲۲ - ۲۴) ختم مضمون پر غالب کا نام یوں درج ہے:

"راقم اسد اللہ خاں شاعر، غالب تخلص، برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں بہادر رئیس

سونگ سونسا۔ مرقومہ ۱۱۔ ماہ اگست ۱۸۶۵ء"

یہ مضمون غالب نے دہلی سوسائٹی کے دوسرے جلسے منعقدہ ۱۱۔ اگست ۱۸۶۵ء میں پڑھا۔ رسالہ دہلی سوسائٹی کے پہلے شمارے میں اس جلسے کی رُوداد چھپی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس جلسے میں اوّل دو اصحاب کے مضامین پڑھے گئے:

"پھر صاحب کمشنر بہادر نے نواب اسد اللہ خاں غالب سے فرمایا کہ میرزا صاحب آپ نے بھی کوئی مضمون ہماری سوسائٹی کے لیے لکھا ہے۔ نواب صاحب نے بیان کیا کہ میں نے کچھ لکھا ہے۔ مگر مجھ میں یہ طاقت نہیں کہ کھڑا ہو کر سناؤں۔ اگر اجازت ہو بیٹھے بیٹھے پڑھوں۔ صاحب موصوف نے فرمایا بہت اچھا۔ نواب صاحب نے اُسی وقت اپنی جیب میں سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔ اُس میں کچھ حال تباہی شہر دہلی اور کمی بارش کا تھا۔ سب حاضرین جلسہ سن کر بہت خوش ہوتے اور نواب صاحب کی بہت تعریف کی۔"

(رسالہ دہلی سوسائٹی، ۱: ۱۸۶۶ء، صفحہ ۵)

رسالہ دہلی سوسائٹی کے تیسرے شمارے (مطبوعہ ۱۸۶۷ء، اکمل المطابع، دہلی) میں، اُن مضمونوں کی فہرست دی گئی ہے جو سوسائٹی کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ اس فہرست میں غالب کے مضمون کا ذکر ان لفظوں میں ہے:

"نواب اسد اللہ خاں غالب در باب تباہی شہر دہلی"

(صفحہ ۲۹)

اس تحریر کا تعارف سب سے پہلے مالک رام نے کرایا (ادبی دُنیا، لاہور، شمارہ ستمبر ۱۹۳۹ء) پھر ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے اپنے ایک قیمتی مقالے "دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب"، مطبوعہ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء (صفحہ ۴۹ - ۶۴) میں غالب کی اس تحریر کو نقل کیا۔ "احوالِ غالب" (مختار الدین احمد، علی گڑھ، جون ۱۹۵۳ء) میں بھی یہ تحریر صدیقی صاحب کے مقالے کے ساتھ شائع ہوتی ہے۔ (۱۸۳ - ۱۸۶) غالب نے اپنے خطوں میں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے، اس سے الگ دہلی کی تباہی کے بارے میں غالب کی یہ واحد اُردو تحریر ہے جو مطبوعہ صورت میں ہمیں ملتی ہے۔ اس اہمیت کے پیشِ نظر اسے اگلے صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔

O

" حکامِ معدلت فرجام اور صاحبانِ والا مقام کی جناب میں اور حاضرینِ انجمن اور دانندگانِ علم و فن کی خدمت میں بلکہ جو شخص خدا پرست و حق شناس ہے، اس سے میرا التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دلّی کے بسنے والوں نے حاکموں پر شہر کا دروازہ بند کردیا اور ایسے فرماندہانِ دادگر سے لڑائی کا قصد کیا، میگزین کا دروازہ کھلوایا اور انہیں کی گولی بارود سے، اُن پر آگ کا مینہ برسایا۔ چار مہینے بارہ دن ظلم کی آنچ کی تیزی رہی، قلعہ اور شہر اور باہر خون ریزی رہی۔ ناگاہ قہرِ الٰہی اس شدت سے نازل ہوا کہ ہر جاندار کو جینا مشکل ہوا[1] قوم انگریز کو خدا نے فتح عنایت کی۔ انہوں نے سیاست کے بعد رعیت کی رعایت کی۔ ہر چند حکام کو عفوِ جرائم منظور رہا۔ مگر قہرِ حاکمِ حقیقی بدستور رہا، نہ مکین کا پتہ۔ نہ مکان کے آثار، نہ وہ گلی کوچے، نہ وہ بازار۔ مانا کہ شہر کی صورت اب اس سے بہتر ہے، مگر وہ عمارت جس پر خدا کے قہر کی آندھی چلی تھی، وہ کدھر ہے؟ شعر:

سپس ہر آئینہ شہرے جدید خواہد بود
نہ آں کہ شاہ جہاں ساخت در زمانِ قدیم

رفع فتنہ و فساد، ظہورِ امن و داد مسلّم، لیکن قہرِ الٰہی سے کچھ پیش نہیں جاتی، خلاف تقدیر، تدبیر بن نہیں آتی ــ تین برس برابر کال رہا، ہر شخص خستہ و بدحال رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری، طرح طرح کی مصیبت، رنگ رنگ کی بیماری، کلیجوں کا تپ کی حرارت سے سُلگنا، گھروں میں جابجا آگ کا لگنا، ہوا شرارہ ریز۔ خاک شعلہ انگیز، دریا اور کوئے کا پانی زہرِ آب، مینہ کے پانی کی بوند گوہرِ نایاب۔ اساڑھ اور ساون، برسات کے

---

[1] " قہرِ الٰہی " کی تفصیل غالب نے مجروح کے نام ۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں اس طرح رقم کی ہے:

" برسات کا نام آگیا، سو پہلے مجملاً سنو، ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدامِ مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے۔ آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے، جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں، اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی، کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جاتے، مبالغہ نہ سمجھنا، ہزارہا مکان گر گئے، سینکڑوں آدمی جابجا دب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے۔ قصہ مختصر، وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا، اناج نہ پیدا ہوا، یہ پن کال ہے کہ پانی ایسا برسا کہ بوئے ہوئے دانے بہہ گئے، جنہوں نے ابھی نہیں بویا، وہ بونے سے رہ گئے، سن لیا دلّی کا حال؟ ــــ "

دو مہینے تمام ہوتے۔ ساون کے آخر اور بھادوں کے اوّل دو چار مہینہ ہوئے جس میں پانی اس قدر برسا کہ زمینداروں نے حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھو لیے۔ پایانِ کار کا حال خدا جانے، خلق اُس کے اسرار کو کیا جانے۔ گرانی اور ارزانی ایک امرِ عام ہے، مجھے خاص اپنے عرضِ مدعا سے کام ہے۔ بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں۔ سچ اگر پوچھیے تو نیم جاں ہوں:

ضعف[1] نے، غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں اور بزم نشینی کہاں، نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں۔ سرکار کی خدمت گزاری کا شائق ہوں مگر اب حرف دو کام کے لائق ہوں۔ اگر کسی امر میں بذریعہ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے، تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے ـــــ یا اگر تحریر نظم و نثرِ فارسی و اردو کا حکم آوے تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔ آئندہ حکام کے پسند نہ ہو یا مقبول ہو جاوے ـــ

۱۸۰۶ عیسوی سے جس کو آج ساٹھ برس ہوتے سرکار انگریزی کا نمک خوار ہوں اور ۱۸۵۵ء یعنی دس برس سے شہنشاہِ بحر و بر حضرت فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا مدحت نگار ہوں۔ دو قصیدے میرے ولایت پہنچ گئے، اُن میں سے ایک کی رسید کی اطلاع مجھ کو آگئی۔ تیسرا قصیدہ میرے مسودات میں موجود اور مطلع اس کا یہ ہے ؎

---

[1] "متداول دیوان میں "ضعف" کی جگہ "عشق" ہے لیکن آخر عمر میں انہوں نے لفظ 'عشق' کو 'ضعف' سے بدل دیا تھا۔ مصنف "سیر دہلی"؛ ریاض الدین امجد نے غالب سے اپنی ایک ملاقات مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۰ء کے حال میں لکھا ہے کہ غالب کے سامنے یہ شعر پڑھا:

"........ جب یہ زبان پہ لایا تو مرزا نے برجستہ یہ فرمایا کہ "اے بھئی چپ رہو" یوں کہو کہ "ضعف نے غالب نکما کر دیا" یا "دہر نے غالب نکما کر دیا" عشق کیسا، عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا ـــ"

(سیر دہلی۔ مطبع سہیل، آگرہ، ۱۸۶۱ء ص ۲۶، ۲۷، بحوالہ احوالِ غالب ص ۵۰)

نامہ ز دکٹوریا چو نامور آمد   از افقِ نامہ آفتاب بر آمد[1]

یہ قصیدہ اس کے سزاوار ہے کہ ایران بھیجا جائے اور وہاں کے شعراء سے داد مانگی جائے۔ اب میں جناب صاحب کمشنر بہادر اور مجموعِ صاحبانِ عالی شان کو سلام کرتا ہوں اور نگارش کو تمام کرتا ہوں۔"

(۱۱-اگست ۱۸۶۵ء)

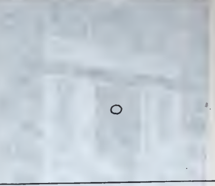

---

[1] ۶۵ اشعار کا یہ قصیدہ "کلیاتِ غالب" میں "قصیدۂ سی و یکم ہم در مدح شہنشاہ" کے عنوان سے چھپا ہے (کلیاتِ غالب، طبع دوم، نولکشور، لکھنؤ ۱۸۹۳ء ص ۲۶۳-۲۶۶) مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ: اصل قصیدہ یا اس کا حصہ چند سال پیشتر بہادر شاہ کے لیے کہا گیا تھا۔ بعد ازاں اس میں تبدیلیاں کر دی گئیں۔ علی گڑھ کے مخطوطے میں بعض اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے اس رائے کو تقویت پہنچتی ہے۔۔ مخطوطہ علی گڑھ میں اس شعر "نامہ ز دکٹوریا الخ کی یہ صورت درج ہے: شاہ و ولی عہد عین یک دگر آمد

فتح بہ معنی مرادفِ ظفر آمد

(قصائد و مثنویات، فارسی، مرتبہ: مہر، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۱۹ و ۲۴۲)

نوتعمیر مزارِ غالب

ضمیمۂ دوم:

ملکۂ وکٹوریہ کا اعلان اور بیگم حضرت محل کا فرمان

"……. ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہدنامے کیے ہیں، اُن کی سب شرطوں پر آئندہ ایمان داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔"

— اعلان: ملکہ وکٹوریہ، انگلستان

"اِس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو جو وعدے اور عہد و پیمان کیے ہیں، ملکہ انہیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اِس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے، اور اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اِس میں نئی بات کیا ہوتی؟"

— فرمان: بیگم حضرت محل، لکھنؤ

"آپ کو ہندوستان پر قبضہ کرنے کا اور مجھے سزا کا مستحق قرار دینے کا کیا حق ہے ؟ ہندوستان پر حکومت کرنے کا آپ کو کس نے اختیار دیا ؟ کیا آپ فرنگی لوگ بادشاہ ہیں اور ہم اپنے ملک کے اندر چور ہیں ؟"

(انقلابی رہنما، نانا صاحب، بنام: جنرل ہوپ گرانٹ، اپریل ۱۸۵۹ء)

"لوگ کہتے ہیں، آگرہ میں اشتہار جاری ہو گیا ہے اور ڈھنڈورا پٹ گیا ہے کہ کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ گیا اور بادشاہی عمل ہندوستان میں ہو گیا۔"

(غالب بنام: مرزا حاتم علی بیگ مہر، ۲۱۔ ستمبر ۱۸۵۸ء)

"حکم ہوا ہے کہ دو شنبے کے دن پہلی تاریخ نومبر کو رات کے وقت، سب خیر خواہان انگیز اپنے اپنے گھر میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی۔ فقیر بھی اس تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنسن مقرری نہیں پایا اپنے مکان پر روشنی کرے گا اور قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر[1] صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔"

(غالب، بنام: منشی نبی بخش آرام، اواخر اکتوبر ۱۸۵۸ء)

"یہاں پہلی نومبر (۱۸۵۸ء) کو (دو شنبے) کے دن حسب الحکم حکام، کوچہ و بازار میں روشنی ہوئی اور شب کو کمپنی کا ٹھیکا ٹوٹ جانا اور قلمرو ہند کا بادشاہی عمل میں آ جانا سنا گیا۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر کو ملکہ معظمہ انگلستان نے فرزندِ ارجمند کا خطاب دیا اور اپنی طرف سے نائب اور ہندوستان کا حاکم کیا۔ میں قصیدہ[2] اس تہنیت میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں۔"

(غالب بنام: انور الدولہ شفق، پنجم نومبر ۱۸۵۸ء)

O

"کمپنی کا راج اب ختم ہوا۔ اور اس کی جگہ پر ہندوستان کی حکومت کی باگ ہم نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ہماری انگریزی رعایا کے قتل میں حصہ لینے کے

---

[1] آرام کے نام، اس خط میں پندرہ بیت کا یہ فارسی قطعہ (روزگار چراغاں، اشتہار چراغاں) درج ہے۔ "دستنبو" طبع دوم (۱۸۶۵ء) میں بھی یہ شامل ہے۔

[2] ساٹھ بیت کا یہ فارسی قصیدہ در مدح ملکہ معظمہ انگلستان (شمار یافت، روزگار یافت) "دستنبو" طبع اول کے آغاز میں چھپا ہے۔

مجرم ہیں باقی جو لوگ ہتھیار رکھ دیں گے۔ ان سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کی گود لینے کی رسم آئندہ سے جائز سمجھی جائے گی اور متبنیٰ لڑکوں کو باپ کی جائیداد اور گدی کا مالک مانا جائے گا۔ کسی کے مذہبی عقیدوں یا مذہبی رسم رواج میں کسی طرح کی مداخلت نہ کی جائے گی۔ ہندوستانی والیانِ ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہد کیے ہیں، ان کی سب شرطوں پر آئندہ ایمان داری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کی ریاست یا اس کا کوئی حق چھینا جائے گا۔ سارے ہندوستانیوں کے ساتھ ٹھیک اسی طرح کا برتاؤ کیا جائے گا جس طرح انگریزوں کے ساتھ ......" ملکہ وکٹوریہ۔

ہندوستانی والیانِ ریاست اور ہندوستانی رعایا کے نام ملکہ وکٹوریہ کا یہ اعلان یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستان بھر میں شائع کیا گیا۔ اسی دن لارڈ کیننگ نے خود الہ آباد میں دارا گنج کے نزدیک قلعے کے نیچے یہ اعلان ہزاروں آدمیوں کو پڑھ کر سنایا — ملکۂ انگلستان کی طرف سے اِس اعلان کے شائع ہوتے ہی، اس کے جواب میں اَودھ کے معزول بادشاہ واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کی طرف سے رعایائے اَودھ کے نام، جمیعتِ ملی اور غیرتِ قومی کا حامل ایک بصیرت افروز اور ولولہ انگیز اعلان عام شائع ہوا جس کا ایک ایک لفظ بیگم حضرت محل کی بیدار مغزی اور روشن ضمیری پر دلالت کرتا ہے۔ اعلان اردو میں تھا۔ یہاں اس کے کچھ جملے، اس سرکاری انگریزی ترجمے سے اردو میں ترجمہ کر کے، ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:

"— پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کا اعلان، جو ہمارے سامنے آیا ہے، بالکل صاف ہے۔ اِس لیے ہم نے بہت سوچ سمجھ کر موجودہ اعلان شائع کرنے دیا تاکہ متذکرہ بالا اعلان کے خاص خاص اصلی مقصد ظاہر ہو جائیں اور ہماری رعایا ہوشیار ہو جائے۔

اس اعلان میں لکھا ہے کہ ملکِ ہندوستان جو ابھی تک کمپنی کے سپرد تھا، اب ملکہ نے اپنی حکومت میں لے لیا ہے اور آئندہ سے ملکہ کے قانون کو مانا جائے گا۔ ہماری مذہبی رعایا کو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ کمپنی کے قانون، کمپنی کے انگریز ملازم، کمپنی کے گورنر جنرل اور کمپنی کی عدالتیں وغیرہ سب، جوں کی توں بنی رہیں گی، تو پھر وہ نئی بات کون سی ہوئی جس سے عوام کو فائدہ ہو یا جس پر وہ بھروسہ کر سکیں؟

اس اعلان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جو جو وعدے اور عہد و پیمان کیے ہیں، ملکہ انہیں منظور کرے گی۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس چال کو غور سے دیکھ لیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا ہے، اور اگر یہ بات قائم رہی تو پھر اس میں نئی بات کیا ہوتی؟ — کمپنی نے بھرت پور کے راجا کو پہلے اپنا بیٹا بتلایا اور پھر اس کا علاقہ لے لیا۔ لاہور کے راجا کو وہ لندن لے گئے اور پھر کبھی اسے ہندوستان لوٹنے نہ دیا۔ نواب شمس الدین خاں کو ایک طرف انہوں نے پھانسی پر لٹکا دیا اور دوسری طرف اُسے سلام کیا۔ پیشوا کو انہوں نے پونا اور ستارا سے نکال دیا اور زندگی بھر کے لیے بٹھور میں قید کر دیا۔ بنارس کے راجا کو انہوں نے آگرہ میں قید کر دیا۔

بہار، اڑیسہ اور بنسال کے راجاؤں کا انہوں نے نام و نشان تک نہ چھوڑا. خود ہمارے قدیم علاقے انہوں نے ہم سے یہ بہانہ کر کے لے لیے کہ فوج کو تنخواہ دینی ہیں اور ہمارے ساتھ جو عہد نامہ کیا، اس کی دفعہ (۷) میں انہوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم آپ سے اور زیادہ کچھ نہ لیں گے، اس لیے جو انتظام کمپنی نے کر رکھے ہیں، وہ اگر سب قائم رکھے جائیں گے، تو اس سے پہلے کی حالت میں اور اب، اس نئی حالت میں کتنا فرق ہوا ؟

یہ سب تو پرانی باتیں ہیں ؛ لیکن حال میں بھی قسموں اور عہد ناموں کو توڑ کر، اور باوجود اس بات کے، کہ انگریزوں نے ہم سے کروڑوں روپے قرض لے رکھے تھے ــــــ، انہوں نے بغیر کسی وجہ کے صرف یہ بہانہ لے کر کہ آپ کا برتاؤ اچھا نہیں ہے، اور آپ کی رعایا غیر مطمئن ہے[1]، ہمارا ملک اور کروڑوں روپے کا مال ہم سے چھین لیا۔ اگر ہماری رعایا ہم سے پہلے کے نواب واجد علی شاہ سے غیر مطمئن تھی، تو وہ ہم سے مطمئن کیسے ہو گئی !! اور کبھی کسی حکمراں رواکے لیے رعایا نے اپنی جان اور مال کو اس طرح قربان کر کے، اپنی وفاداری کا ثبوت نہیں دیا۔

---

[1] "ملک اودھ کی رعایا برباد ہو رہی ہے۔ فوج تنخواہ سے محروم ہے۔ آئین و عدل کا نام نشان نہیں، ڈاکوؤں کے غول علاقوں کو برباد کرتے ہیں۔ سرکار انگریز ان خرابیوں اور برائیوں کی زیادہ متحمل نہیں ہو سکتی اور اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ملک اودھ کا تمام انتظام ہمیشہ کے لیے سرکار کمپنی کے سپرد کر دیا جائے ــــ"

ــــ گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی

(نقل اشتہار گورنمنٹ انگریزی جو ہر تھانے پر لگایا گیا : ۷۔ فروری ۱۸۵۶ء)

[بحوالہ : نجم الغنی، تاریخ اودھ، جلد پنجم، صفحہ ۲۶۵-۲۷۰]

درحقیقت جو کچھ بدانتظامی یا بے اطمینانی اس وقت اودھ میں تھی، وہ انگریزوں کی جان بوجھ کر پیدا کی ہوئی تھی۔ لارڈ ہیسٹنگز لکھتا ہے :

"حقیقت میں اس طرح کا نظامِ حکومت قائم کرنے کی جس سے رعایا خوشحال ہو، محض ایک ہی سچی اور کارگر ترکیب ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ انگریز ریزیڈنٹ کو واپس بلا لیا جاتے اور نواب اودھ کو اپنی ریاست کے انتظام میں پوری طرح آزاد چھوڑ دیا جاتے۔ اس طرح اس علاقے کی بے اطمینانی کا سارا گناہ کمپنی کے سر پر ہے۔"

Charles Ball :

History of the Indian Mutiny, Vol. I, p. 152

(بحوالہ : پنڈت سندر لال، سن ستاون، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء، صفحہ ۲۴)

جس طرح کہ ہماری رعایا نے ہمارے ساتھ[1] کیا ہے، پھر کیا کمی ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیتے ؟

---

[1] "ہم لوگوں میں یہ ایک رواج ہے کہ .... پہلے کسی ملکی راجا کا راج لے لیتے ہیں اور پھر تخت سے ہٹاتے ہوتے راجا یا اس کے ولی عہد کی جھوٹی برائیاں کرنے لگتے ہیں : [Sir John Kay :
History of the Sepoy War, Vol. III, p. 361—362]
(بحوالہ سن ستاون، ص، ۱۰۲)

"لارڈ ڈلہوزی کا بیان ہے کہ واجد علی شاہ کے مظالم سے اودھ کی رعایا دکھی تھی ! لیکن جس طرح ۱۸۵۷ء میں سارے اودھ کے زمینداروں، جاگیرداروں، راجاؤں، سپاہیوں، کسانوں، سوداگروں غرض یہ کہ سب ہندو اور مسلمانوں نے مل کر واجد علی شاہ کو پھر سے اودھ کے تخت پر بٹھانے کے لیے دس دن کے اندر انگریزی حکومت کو اکھاڑ کر پھینک دیا، اس سے واجد علی شاہ کی حکومت کی ہر دلعزیزی اور کمپنی کی حکومت سے ناراضی دونوں کا صاف پتہ چل جاتا ہے۔ اودھ کے اندر اس وقت ایک گاؤں بھی ایسا نہ بچا ہو گا جس نے کمپنی کے جھنڈے کو پھاڑ کر نہ پھینک دیا ہو۔"
(پنڈت سندر لال، سن ستاون، صفحہ ۱۱۱)

"سارے اودھ نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ نہ صرف باضابطہ فوج ہی بلکہ تخت سے اترے ہوتے نواب کی فوج کے ساٹھ ہزار آدمی، زمیندار، ان کے سپاہی، ڈھائی سو قلعے، جن میں سے بہتوں پر بھاری توپیں لگی ہوتی تھیں۔ سب کے سب ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے۔ ان لوگوں نے کمپنی کی حکومت کو اپنے نوابوں کی حکومت کے ساتھ تول کر دیکھ لیا تھا اور قریب قریب رائے سے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ان کے نوابوں کی حکومت بہ کمپنی کی حکومت سے بہتر تھی۔ جو پنشنر ہماری فوج میں کام کر چکے تھے، ان تک نے صاف صاف ہماری حکومت کے خلاف فیصلہ دے دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک بغاوت میں شامل تھا" [Red Pamphlet, by : G.B. Malleson]
(بحوالہ سن ستاون، ص۔ ۱۱۳)

"اودھ کی رعایا نے قیدی نواب واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر کو لکھنؤ کے تخت پر بٹھا دیا اور چونکہ نواب برجیس قدر ابھی نابالغ تھا اس لیے نظام حکومت کی باگ برجیس قدر کی ماں حضرت محل کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی۔ اودھ کے سب زمینداروں اور رعایا نے بڑی مسرت کے ساتھ بیگم حضرت محل کو اپنا حکمران منظور کر لیا۔ مگر حضرت محل کی تعریف کرتے ہوتے رسل لکھتا ہے :

اس کے علاوہ، اِس اعلان میں لکھا ہے کہ ملکہ کو اپنا علاقہ بڑھانے کی خواہش نہیں ہے، پھر بھی وہ، ان ہندوستانی ریاستوں کو اپنی حکومت میں ملا لینے سے باز نہیں رہ سکتی ـــ

O

"اِس اعلان میں لکھا ہے کہ عیسائی مذہب سچا ہے، لیکن اور کسی مذہب والوں کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی اور سب کے ساتھ ایک طرح کا قانونی برتاؤ کیا جائے گا۔ سچے نظامِ حکومت سے کسی مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کیا تعلق ہے ؟

سؤر کھانا اور شراب پینا، چربی کے کارتوس دانت سے کاٹنا اور آٹے اور مٹھائیوں میں سؤر کی چربی ملانا، سڑکیں بنانے کے بہانے مندروں اور مسجدوں کو گرانا، گرجا بنانا، گلیوں اور کوچوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے کے لیے پادریوں کو بھیجنا ـــــ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے لوگ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جائے گا۔ ؟

اس اعلان میں لکھا ہے کہ ـــــ جن لوگوں نے قتل کیے ہیں یا قتلوں میں مدد دی ہے، اُن پر کوئی رحم نہ کیا جائے گا، باقی سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ایک بے وقوف آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اِس اعلان کے مطابق قصوروار یا بے قصور کوئی آدمی بھی نہیں بچ سکتا ـــــ ایک بات اِس میں صاف کہی گئی ہے وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار آدمی کو نہ چھوڑا جائے گا۔ اس لیے جس گاؤں یا علاقے میں ہماری فوج ٹھہری ہے، اُس کے باشندے نہیں بچ سکتے ـــــ اِس اعلان کو پڑھ کر جس میں کہ صاف دشمنی بھری ہوتی ہے، ہمیں اپنی رعایا کی حالت پر بہت افسوس ہے۔

اب ہم ایک صاف اور معتبر فرمان جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں سے جن جن لوگوں نے بے وقوفی کر کے گاؤں کے مکھیوں کی حیثیت سے اُپنے تئیں انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں اگر حاضر ہوں۔ بلاشبہ ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا ـــــ آج تک کبھی کسی نے نہیں دیکھا کہ انگریز نے کسی کا قصور معاف کیا ہو۔"

حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ:

"بیگم میں بڑی حماقت اور قابلیت دکھا دیتی ہے۔ بیگم نے ہمارے ساتھ لگاتار جنگ کرتے رہنے کا اعلان کر دیا ہے۔ ان ..... کی ہمت اور حماقت کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ زنان خانے کے اندر رہ کر بھی یہ کافی زیادہ عملی اور دماغی قوت اپنے اندر پیدا کر لیتی ہیں۔" اودھ کے لوگ "اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے لیے دیش بھگتی کے جذبات سے متاثر ہو کر جنگ کر رہے تھے۔"

بحوالہ: رسل نامہ، ص ۱۶۱ - ۱۸۹ [Russell's Diary, p. 275, p. 75]

ہماری رعایا میں سے کوئی انگریزوں کے اعلان کے دھوکے میں نہ آتے تھے "

— بیگم حضرت محل

Charles Ball :

History of the Indian Mutiny, vol. II

(بحوالہ سن ستاون، صفحہ ۲۳۰-۲۳۲)

۱۔ " لکھنؤ کے زوال کے بعد کمپنی کی فوج نے لکھنؤ کے باشندوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا وہ "کھلے عام لوٹ اور قتلِ عام" ہی لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ لفٹیننٹ ماجنڈی کہتا ہے کہ: لکھنؤ کے اندر اس وقت کے قتلِ عام میں کسی طرح کی تمیز نہیں کی گئی — "

[Lieut. Majendie's up among the Pandies, p. 195—196]

قتل سے پہلے جس طرح کی سخت تکلیفیں لوگوں کو دی گئیں، اس کی کئی مثالیں رسل نے اپنی کتاب میں دی ہیں ان میں سے صرف ایک ہم نیچے نقل کرتے ہیں :

" کچھ سپاہی ابھی زندہ تھے اور اُن پر رحم کر کے انہیں مار ڈالا گیا، لیکن ان میں سے ایک کو کھینچ کر مکان سے باہر ریتیلے میدان میں لایا گیا۔ اُسے ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا گیا، ایک سہولت کی جگہ لایا گیا، وہاں اس کو لِٹا دیا گیا۔ کچھ انگریز سپاہیوں نے اس کے منہ اور جسم میں سنگینیں بھونک کر اُسے لِٹاتے رکھا۔ دوسرے لوگ لاش کو جلانے کے لیے لکڑی جمع کر لاتے۔ جب سب تیار ہو گیا تو اسے زندہ بھون دیا گیا! اس کام کے کرنے والے انگریز تھے اور کئی افسر کھڑے دیکھتے رہے لیکن کسی نے مداخلت نہ کی! اس دوزخی ظلم وستم کی خوفناکی اُس وقت اور زیادہ بڑھ گئی جب کہ اُس بدقسمت ستم زدہ نے اَدھ جلی اور زندہ حالت میں بھاگ کر بچنے کی کوشش کی۔ یکایک کوشش کر کے وہ چِتا سے کود پڑا۔ اُس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے لٹک رہا تھا۔ وہ کچھ گز دوڑا، پھر پکڑ لیا گیا، پھر آگ پر رکھ دیا گیا اور جب تک راکھ نہ ہو گیا، سنگینوں سے دبا کر رکھا گیا — "

[Russell's Diary, Vol., p. 302]

اس کے مقابلے میں انگریز قیدیوں کے ساتھ بیگم حضرت محل کا سلوک بالکل دوسری طرح کا تھا۔ شروع کے دنوں میں جب کہ لکھنؤ کے اندر انقلابیوں کا پلّہ بھاری تھا، کچھ انگریز مرد اور عورتیں لکھنؤ میں قید کر لیے گئے تھے لیکن چھ مہینے تک اُن کی جان پر کوئی حملہ نہ کیا گیا۔ جس وقت کمپنی کی فوج نے شہر میں گھس کر قصور دار اور بے قصور سب کا ایک طرف سے قتلِ عام شروع کیا، کچھ پرجوشیلے انقلابیوں نے محل میں جا کر بیگم سے درخواست کی کہ انگریز قیدیوں کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔ بیگم نے سات یا آٹھ انگریز مردوں کو ان کے حوالے کر دیا۔ انہیں فوراً گولی سے

——— حاشیہ صفحہ گزشتہ:

اڑا دیا گیا۔ لیکن جب کچھ انقلابیوں نے ضد کی کہ قیدی انگریز عورتوں کو بھی مار ڈالا جاتے تو بیگم نے انکار کر دیا۔
مورخ چارلس بال لکھتا ہے:

"عورتوں کے بارے میں بیگم نے اُن لوگوں کی مانگ کو پورا کرنے سے زوردں کے ساتھ انکار کر دیا۔ بیگم نے فوراً محل کے زنان خانے کے اندر ان انگریز عورتوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بیگم کا یہ کام عورتوں کی شان اور اُن کو بڑھانے والا تھا۔"

Charles Ball :
History of the Indian Mutiny, Vol. II, p. 94
(بحوالہ: پنڈت سندر لال، بھارت میں انگریزی راج...) — see note

لال قلعہ دہلی : جہاں کبھی غالب کے شعر گونجا کرتے تھے

ضمیمہ سوم:

نثر از قلم: مرزا اسد اللہ خاں غالب، در باب:

تحسین و تائیدِ سرکارِ انگریزی

"ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلمرو ہند نمونہ گلزار ہو گیا ہے۔
بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے
وہ احمق ہے، وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخوشنود ہے"
—— غالب

مطبوعہ:

[اودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۳۔ اپریل ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۸۱]

اودھ اخبار، لکھنؤ کی اشاعت ۲۳-اپریل ۱۸۶۲ء میں "ہندوستان کی سمجھ" کے تحت اخبا
نے لکھا ہے کہ:

"افغانستان کا روزنامچہ مدت دراز سے سنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوتے کہ صحائف اخبار میں دیکھا جاتا ہے کہ غرض سالہا سال گزر گئے، سنتے سنتے کان بھر گئے کسی امر کا ظہور نہ پایا، افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں۔ چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان، کیا کیا عقلیں ہیں۔ کیسے کیسے انسان نئے نئے باندھو باندھے، تو طبلے اٹھائے محض اپنے گمان پر سینکڑوں قیاس لگائے۔ اے بے فکرو، خدا سے ڈرو، ناحق عالم کو پریشان نہ کرو۔ معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گھڑا کرتا ہے، خصوصاً وقائع نگاران انگریزی کو کون لکھا کرتا ہے ------

آج کل دانائے روزگار، سرآمد اولوالابصار، ارسطو صفت، افلاطون فطنت، جناب والا شان، عالی مناقب، مرزا اسداللہ خاں غالب نے جن کی سلامتِ ذہنِ مستقیم کی قسم کھائیے، استقامتِ رائے سلیم کے صدقے جائیے، نافہموں کی فہمائش میں ایک نثر تحریر فرمائی ہے ہم اس کو درج اخبار کرتے ہیں۔----"

اس ادارتی نوٹ کے بعد "نثر" کے عنوان سے مرزا اسداللہ خاں غالب کا ایک نثر پارہ درج کیا گیا ہے جو سرتاسر حکام کی تائید و وکالت اور انگریزی عملداری کی برکتوں اور نعمتوں کے "اعتراف" میں ہے۔ غالب نے انگریز حکام کو "موید من اللہ" بتایا ہے اور یہ گواہی "دی ہے کہ، "ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے، قلمرو ہند نمونۂ گلزار ہو گیا ہے ---- "اور بہشت جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں موجود ہے ---" فاعتبروا یا اولی الابصار ٥

غالب کی یہ نثر اوّل اوّل اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اپنی زیر ترتیب کتاب "غالبیہ" کے تیسرے باب میں امیر حسن نورانی صاحب (لکھنؤ) کے شکریے کے ساتھ درج کی اور نگار، رامپور شمارہ جون ۱۹۶۳ء صفحہ ۴۱-۴۲ میں شائع ہوئی۔ یہ قطعہ عبارت اکبر علی خاں صاحب کے ایک قیمتی مضمون "غالب اپنے معاصر اخبارات میں" بھی شامل ہے[1]۔ یہاں انقلاب ستاون کے بارے میں غالب کا یہ کم معروف نثری ٹکڑا بلا تبصرہ درج کیا جاتا ہے:

---

[1] نقوش، لاہور، شمارہ ۱۱۱، غالب نمبر، فروری ۱۹۶۹ء صفحہ ۶۴۷-۶۴۸

"یارب! دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں، سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا کج فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں۔ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں۔ گویا اپنے زن و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں، لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں، سینکڑوں بھری کشتیاں اس دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں، یہ عافیت دشمن عبرت نہیں پکڑتے اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں اور پھر اس اخبار پر کیا کیا آثار مرتب کرتے ہیں۔

سرکار انگریزی ازبسکہ توجہ طرف، رفاہِ عام کے ہے، ادھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے بفرضِ محال اگر اس گروہ میں کسی نے کچھ بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبان عالی شان معدلت نشان کا مقابلہ کیا بات صاف صاف ہے، جائے انصاف ہے، جن موید من اللہ حاکموں نے اپنی فوجِ باغی کو صرف اپنے حسنِ تدبیر و ضربِ شمشیر سے زیر کیا ہے، اب جو یہ فوجِ جرّار و لشکرِ بے شمار ساتھ ہے، مخالف کا دفع کرنا مشکل کیا ہے۔

ہندو، مسلمان جو اہلِ ہند اگلے فتنہ و فساد سے بچ رہے ہیں، اور اس کے وبا اور قحط کے دکھ سہے ہیں، وہ اپنی سلامتی و صحت پر خدا کا شکر بجا لائیں نیا پاکیزہ، سستا اناج فراغت سے کھائیں، اگن بوٹ اور ریل گاڑی کی صنعت کو دیکھیں، تار بجلی میں پیام کے پہنچنے کی سرعت کو دیکھیں، مدرسوں کی رونق اور رواجِ علم کی کثرت ملاحظہ فرمائیں۔ حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں۔ ملک سراسر بے خس و خار ہو گیا ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصوّر تھا، اب زندگی میں موجود ہے۔ وہ احمق ہے، وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عملداری سے ناخوشنود ہے۔ حکام کو ملک کی آبادی اور رعیّت

کی آسودگی منظور بہر صورت ہے اگر اچیلا کوئی اپنے حق کو نا پہنچے تو یہ اس شخص کی خوبیٔ قسمت ہے۔ آدمی زحمتِ خاص کو نہ دیکھے، رحمتِ عام پر نظر کرے اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو اپنے بخت وقسمت کا گلہ کرے ——— امن وامان کا طالب، بخت وقسمت کا شاکی، غالب، فقط۔"

[اودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۳-اپریل ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۸۱][1]

---

[1] آپ کے اخبارِ حق نگار، مطبوعہ ۲۳-اپریل سنہ رواں (۱۸۶۲ء) صفحہ ۲۸۱ میں عبارت نثرِ ریختہ قلم جواہر رقم ---- جناب والا مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی ——— کی در باب تہدید و تنبیہ عوام و کج فہمانِ ہند میری نظر سے گزری، جس سے یہ مقصود ہے کہ افواہ جنگ ایرانیاں بہ افغاناں میں خام لوگ کیا کیا خیالِ خام ظاہر کرتے ہیں ——— بہ طبیعتِ مضمونِ خیر اندیشی جناب مرشدنا و استادنا حضرتِ غالب ——— عبادہ تنبیہ ابلہاں، نسبت شہرت جنگِ اہلِ ایراں بہ افغاناں، تحریر جناب ممدوح کی، حق بجانب اور عین خیر اندیشیٔ حاکم و محکوم ہے"

(اودھ اخبار، لکھنؤ، ۱۴-مئی ۱۸۶۲ء)

کلماتِ استقبال:

محمد عبدالرحمٰن چغتائی	لاہور	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	لاہور	مولانا حامد علی خاں	لاہور
ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں	حیدرآباد	ڈاکٹر سید عابد حسین	دہلی	پروفیسر رشید احمد صدیقی	علی گڑھ
خواجہ منظور حسین، علیگ	لاہور	پروفیسر آلِ احمد سرور	علی گڑھ	مالک رام	دہلی
پروفیسر نثار احمد فاروقی	دہلی	مولانا امتیاز علی عرشی	رامپور	ضمیر نیازی	کراچی
مسعود احمد برکاتی	کراچی	متین الرحمٰن مرتضیٰ	کراچی	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	دہلی
عبدالقوی دیسنوی	بھوپال	اکبر علی خاں عرشی زادہ	رامپور	ڈاکٹر عنوان چشتی	دہلی
ڈاکٹر خضیم احمد صدیقی	علی گڑھ	شان الحق حقی	کراچی	ڈاکٹر وحید قریشی	لاہور
ڈاکٹر فرمان فتح پوری	کراچی	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	پشاور	ڈاکٹر جمیل جالبی	کراچی
مشفق خواجہ	کراچی	ڈاکٹر سخی احمد ہاشمی	حیدرآباد	ڈاکٹر ایم-اے عزیز	کراچی
ڈاکٹر عبادت بریلوی	لاہور	ڈاکٹر شکور احسن	لاہور	غلام قادر آزاد	لندن
پروفیسر مشرف انصاری	لاہور	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	لاہور	سلیم اختر	لاہور
عنایت اللہ	لاہور	پروفیسر سید وقار عظیم	لاہور	کشور ناہید	لاہور
ڈاکٹر انور برکت	لاہور	کرامت حسین جعفری	لاہور	انور سدید	سرگودھا
محبوب جمال زاہدی	کراچی	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	دہلی	محمد اکبر الدین صدیقی	حیدرآباد دکن

مصورِ مشرق محمد عبدالرحمٰن چغتائی :

غالب کے انتقال کو ایک صدی سے اُوپر زمانہ گزر گیا۔ یہ غالب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ہر زمانے میں منتخب سخن فہم نصیب رہے۔ کم سن غالب کو میر تقی میر نے پہچانا، پختہ کار غالب سے حالی دوچار ہوئے، حالی کی "یادگارِ غالب" (۱۸۹۷ء) سے مطالعۂ غالب کا ایک مستقل بالشان دور شروع ہوا، پھر اپنے اپنے وقت پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر سید عبداللطیف، تکلف برطرف خود راقم الحروف، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر ایس ایم اکرام، مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مہیش پرشاد، قاضی عبدالودود، مالک رام، پروفیسر حمید احمد خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے غالبیات میں اپنی دھاک بٹھائی۔ ان میں سے دو تین کے علاوہ سب اپنا کام ختم کر چکے اور خود ختم ہو چکے، باقی جو ہیں وہ تیار بیٹھے ہیں[1]

سدا رہے نام اللہ کا

خوشی کی بات یہ ہے کہ نثرادِ نو بھی بڑی حد تک غالب کی اسیر ہے۔ نئی نسل میں غالبیات سے انہماک کی ایک نمایاں اور روشن مثال ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ذات ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے لیے انھوں نے "اشاریۂ غالب" ایسی اہم کتاب لکھی، سندھ یونیورسٹی کے لیے اُنھوں نے غالب پر تحقیقی کام کیا اور سندِ فضیلت پائی اور یہ ایک ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی اُن کا حریف نہیں۔ پاکستان بھر میں معین صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جس نے غالب پر، پی ایچ ڈی کی سطح پر کام کیا ہو ——

اب "غالب اور انقلاب ستاون" کے حساس موضوع پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی زیرِ نظر کتاب سامنے آرہی ہے۔ یہ غالب کا معروضی مطالعہ ہے اور غالب کو ایک بالکل نئے تناظر میں پیش کرتا ہے۔ معین صاحب نے ایامِ انقلاب میں غالب کے رول کو کامیابی کے ساتھ متعین کیا ہے اور انقلاب ستاون کے حوالے سے غالب کے شعری رویے کا احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ :

"اِس انقلاب نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جبکہ نثر نگار غالب نے اس انقلاب کے بعد ظہور پایا ——"

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے اِس موقف کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے اور اس کی تائید میں

---

[1] افسوس کہ اب چغتائی صاحب بھی ہمارے درمیان نہ رہے۔ (تاریخِ وفات ۱۷ر جنوری ۱۹۷۵ء)

ایسی محکم شہادتیں پیش کی ہیں اور اس خوش تدبیری سے نتائج نکالے ہیں کہ اُن کی بات مانے بغیر چارہ نہیں۔ مختصر یہ کہ معین صاحب کی یہ کتاب مواد کی فراہمی، نتائج کے استنباط اور اپنے سلیقۂ اظہار کی بنا پر ادبِ غالب میں بہت قیمتی اور گراں قدر اضافہ ہے۔ اُمید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کا پرجوش استقبال کیا جائے گا۔[1]

—— لاہور، ۱۴ر جون ۱۹۷۴ء

○

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ:

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن غالب شناسوں میں ایک مقام پیدا کر چکے ہیں۔ مُطالعۂ غالب کے سلسلے میں اُن کی تازہ تحقیق "دستنبو" سے متعلق ہے جس کا نام "غالب اور انقلاب ستاون" رکھا گیا ہے۔ اس میں دستنبو کا اُردو ترجمہ ہے اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بارے میں غالب کے شعری اور نثری رویّے کا فرق بھی واضح کیا گیا ہے۔

سید مُعین الرحمٰن کے سابقہ تحقیقی سرمائے کی طرح اِس نئی کتاب میں بھی کاوش اور جُستجو کا پورا اہتمام موجود ہے۔ آخری باب میں جو انقلاب ۱۸۵۷ء کے بارے میں غالب کے شعری رویّے سے متعلق ہے، مُصنّف نے بڑی بے خوفی سے ایسی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے جو غالب پرستی کے اس دور میں بہت کم لوگوں سے متوقع ہے۔ یہ کتاب، غالبیات کے سرمائے میں وقیع اضافے کا درجہ رکھتی ہے۔

چیئرمین، اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ
پنجاب یونیورسٹی، لاہور
—— ۱۴ر ستمبر ۱۹۷۴ء

○

مولانا حامد علی خاں:

ڈاکٹر پروفیسر سید مُعین الرحمٰن نے اُردو اَدب کی ترقی کے لیے آغازِ شباب ہی میں جو تحقیقی اور انتقادی کام شروع کر دیا ہے، اُس کے نتائج اپنی مقدار و رفتار اور اپنے معیار کے لحاظ سے حیرت انگیز ہیں اور اُن کی کامیابی بڑے بڑوں کے لیے قابلِ رشک! "غالب اور انقلاب ستاون" بہ لحاظِ تعداد،

---

[1] چغتائی صاحب کے یہ کلمات "تبصرے" کے تحت ادبِ لطیف، لاہور، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۴ء میں بھی شائع ہوئے۔

ماشاءاللہ ان کی نویں کتاب ہے ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ تازہ کے انبار!

بیسویں صدی کے آغاز میں، غالب اور غالبیات سے از سرِ نو جو دل چسپی پیدا ہوئی، وہ روز افزوں نظر آتی ہے کیونکہ غالب نے موجودہ دَور کے نئے ادیبوں کے دل میں بھی گھر کر لیا ہے۔ چنانچہ خود ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی بھی نو کتابوں میں سے غالبیات پر یہ تیسری کتاب ہے۔

برِعظیم پاکستان و بھارت پر انگریزوں کے غلبے کے بعد، ان علاقوں میں فارسی زبان و ادب سے دل چسپی برابر کم ہوتی چلی گئی، اور افسوس کہ آزادی کے بعد بھی، مشرقی زبانوں کے بجائے ہماری توجہ زیادہ تر انگریزی ہی پر مرکوز ہے۔ اِدھر غالب کے اُردو دیوان اور مکتوبات سے قطعِ نظر اُس کی بیشتر نگارشات کی زبان فارسی ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ ہم غالب پر تو مرتے ہیں مگر اُس کی زبان سے آشنا نہیں ؎

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے "غالب اور انقلاب ستاون" میں غالب کی مشہور کتاب "دستنبو" سے مشتاقانِ غالب کو متعارف کرنے کا فرض بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اُنھوں نے غالب کے اس روزنامچے کی حسرت ناک کہانی بہ تفصیل، کتاب کے متن ہی میں نہیں، حواشی میں بھی بیان کی ہے، اور اس کے ساتھ غالب کے مُتعلقہ اُردو مکاتیب شامل کر کے کتاب کا دل چسپ و دل آویز پس منظر بھی پیش کر دیا ہے۔

ماضیِ قریب میں "دستنبو" کی خاص فارسی زبان پر ڈاکٹر عبد الشکور احسن صاحب نے بھی نہایت بصیرت افروز معلومات جمع کی تھیں اور "انجمن غالب کے صد سالہ یوم وفات کے موقع پر جامعۂ پنجاب کی طرف سے شائع کردہ کتاب "دستنبو" کے مُقدمے میں شامل کیا تھا مگر اس میں "دستنبو" کا اصل فارسی متن ہی ملتا ہے، جو آج کل کے بے شمار نوجوان قارئین کے لیے ایک شیشۂ سربلند سے کم نہیں۔ ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن صاحب نے "دستنبو" کے پورے متن کا سلیس اور بامحاورہ اُردو ترجمہ فراہم کر کے "دستنبو" کی مہر بند خوشبو کو سب کے لیے عام کر دیا ہے۔

کتاب کے مُحققانہ تعارف اور حواشی کے علاوہ بعض اور نکتہ ورانہ اشارات میں ہمارے نوجوان مُصنف نے جو دادِ تحقیق دی ہے، اہلِ نظر، مُطالعۂ کتاب کے بعد خود اس

کی داد دینے پر مجبور ہوں گے۔

ماڈل ٹاؤن، لاہور

—— اگست ۱۹۷۴ء

○

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں :

گرامی نامہ ملا اور کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" بھی —— مَیں کس لائق ہوں کہ انتساب کیا گیا؟ میں آپ کی اعلیٰ شرافت اور خلوص سے بے حد متاثر ہوں اور چاہتا ہوں کہ ایسا انتساب میرے بجائے کسی اور صاحب کے نام کیا جاتے بہرحال۔ اب تو کتاب بھی چھپ چکی ہے اور اب سوائے شکریے کے اور کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ "جزاکم اللہ فی الدارین احسن الجزاء"

پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو، سندھ یونیورسٹی

—— ۲۳ ستمبر ۱۹۷۴ء

○

ڈاکٹر سیّد عابد حسین :

"غالب اور انقلاب ستاون" موصول ہوئی۔ آپ نے یہ کتاب بڑی محنت، تلاش اور سلیقے سے ترتیب دی ہے، آپ کے ذوقِ سلیم، دقتِ نظر اور حُسنِ رقم کی دل سے داد دیتا ہوں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور علم و ادب کی مزید خدمت کا موقعہ دے۔

جامعہ نگر، نئی دہلی

—— ۳، اپریل ۱۹۷۵ء

○

پروفیسر رشید احمد صدیقی :

"غالب اور انقلاب ستاون" پاکر بہت خوش ہُوا، اس کی تالیف و تدوین پر آپ کو مُبارک باد دوں گا..... دونوں ملکوں کے درمیان طویل مدیل مدّت تک مراسلات و مواصلات منقطع رہنے کے سبب سے ایک لمحہ ایسا محسوس ہوا جیسے جو کچھ دیکھ رہا تھا، وہ واقعہ نہیں، واہمہ تھا۔ پھر آپ کی اس غیر معمولی ارادت کا احساس ہوا کہ حالات ساز گار ہونے سے شاید کچھ پہلے ہی سے آپ نے اہتمام کر رکھا تھا کہ اوّلین فرصت میں یہ قیمتی تحفہ میرے لیے بھیج دیں گے۔ خدا آپ

کو صحت بخشے، نامور کرے اور نیک نام رکھے، آمین۔

علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
—— ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

○

پروفیسر خواجہ منظور حسین (علیگ):

"غالب اور سن ستاون پر آپ کی تحقیق و تدقیق کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ اِس مضمون پر اور کچھ کہنے سُننے کی اب شاید ہی گنجائش نکلے —— "دستنبو" کے لکھنے میں "ذاتی تحفظ اور فرد رسی ارباب کی نیت تو صریحاً شامل ہے مگر یہ "سراسر" انگریز حکام کی تائید و تحسین میں نہیں ......" ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ "رکھنے کے باوصف یہ بھی اُس خوں چکاں رُوداد سے خالی نہیں جو خطوں میں بیان ہوئی ہے ——"

—— لاہور ۲۷ر جون ۱۹۷۵ء

○

پروفیسر آلِ احمد سرور:

آپ کی کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" شملے سے ری ڈائریکٹ ہو کر یہاں مجھے ملی۔ مَیں شملے سے کچھ دن کے لیے ایک ذاتی کام سے علی گڑھ آیا ہوا ہوں ...... آپ کی کتاب سرسری طور پر دیکھ سکا ہوں لیکن اس نے مُتاثر کیا۔ آپ نے ان کی تقریباً ہر تحریر کو کھنگال لیا ہے۔ غالب پر آپ کا یہ جُملہ کہ غدر نے اُردو سے ایک شاعر چھین لیا اور ایک بڑا نثر نگار دے دیا، سامنے کی حقیقت کو بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔ یہ باور کیجیے کہ آپ کی اس کتاب سے آپ کی بالغ نظری، تنقیدی صلاحیت اور تحقیقی استعداد، سب کا اندازہ ہوا اور اس کے ساتھ آپ کی اُردو کے لکھنے والوں سے گہری دلچسپی اور تازہ مطبوعات سے شغف کا بھی ——"

—— علی گڑھ، ۱۲ر مئی ۱۹۷۵ء

○

مالک رام:

"غالب اور انقلاب ستاون" آپ کی طرف سے موصول ہوئی بہت مُفید کتاب ہے۔ مَیں آپ سے

اس لیے خوش ہوں کہ آپ کچھ نہ کچھ مفید کام کرتے رہتے ہیں اور وقت ضائع نہیں کرتے، جیسا کہ آج کل کے بیشتر یونیورسٹی کے اساتذہ کی روش ہے۔ غالحمد للہ۔ وقت ضائع کرنے کی چیز نہیں۔ یہ خدائے کریم کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کا ضیاع کفرانِ نعمت کے مُرادف ہے ——

ڈیفنس کالونی، نئی دہلی
۴ مئی ۱۹۷۵ء ——

(۶)

پروفیسر نثار احمد فاروقی :

پاکستان سے کتابوں کی آمد و رفت پر جو پابندی تھی، وہ اب ختم ہو چکی ہے مگر اس کے باوجود کتابوں کا تبادلہ کچھ تیزی سے نہیں ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ کے بحران کی وجہ سے اُدھر بھی کتابوں کی طباعت کی رفتار مدھم رہی ہے اور اچھی علمی و ادبی کتابوں کی رفتار بھی بہت سُست ہے۔ میرے سامنے قابلِ ذکر کتابوں میں صرف دو ہیں اور دونوں میرے دوست ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن صاحب کی تصنیفات ہیں۔

مُعین صاحب اِن دنوں گورنمنٹ کالج، لائل پور میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔ اُنھوں نے غالب صدی کے موقع پر ایک ببلوگرافی بھی شائع کی تھی[۱] اور سید سجاد حیدر یلدرم کے بارے میں بھی ایک اچھی کتاب لکھ چکے ہیں[۲] مگر غالب ان کے اختصاصی مُطالعے کا موضوع ہے اور غالباً وہ پاکستان میں واحد اسکالر بھی ہیں جس نے غالب سے مُتعلق تھیسس لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ اُن کی تحریروں میں مواد کا احاطہ اور طرزِ پیش کش میں سلیقہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اُن کی اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اُن کا علمی و ادبی حلقوں میں شناسانہ اعتراف کیا گیا ہے . . . . .

سن ۱۹۶۹ء عیسوی میں غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر پاکستان میں بہت سی کتابیں چھپی تھیں۔ اس کے بعد پچھلے چھ برسوں میں صرف چھ کتابیں اور آئی ہیں جن میں ایک اہم کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" ہے۔ اس کے مُصنّف ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن ہیں۔ بڑے سائز پر ۲۱۶

---

[۱] اشاریۂ غالب، مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء

[۲] مُطالعۂ یلدرم، مطبوعہ : نذر سنز پبلشرز، سرکلر روڈ، لاہور، ۱۹۷۱ء

صفحوں کی یہ کتاب سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور نے آفسٹ پر چھاپی ہے۔

اِس کتاب میں اُن تمام مباحث کا احاطہ کر لیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء میں غالب کے رول کے بارے میں اب تک متفرق طور پر پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ شروع میں ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں غالب کے روزنامچہ "دستنبو" کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ وہ روزنامچہ ہے جو غدر کے زمانے میں غالب نے خانہ نشینی کے عالم میں لکھا تھا اور بعد کو چھپوا کر انگریز حکام کی خدمت میں تحفے کے طور پر بھیجتے رہے تھے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے سلسلے میں اُن کا نقطۂ نظر کیا رہا ہوگا۔ اس میں ایک کمی یہ رہ گئی کہ غالب نے اِسے اپنی فارسی دانی کے مظاہرے کا اکھاڑہ بھی بنا لیا اور ایسی عبارت لکھنے کی کوشش کرتے رہے جس میں کوئی لفظ عربی کا نہ آنے پائے، حالانکہ اس میں دو درجن سے زیادہ عربی الفاظ گھس آئے ہیں۔ اس التزام کی وجہ سے عبارت اکثر مغلق اور کہیں کہیں بالکل فالتو ہو گئی ہے اور اچھے خاصے فارسی جاننے والے کے لیے بھی اس کتاب سے بے تکلف استفادہ کرنا آسان نہیں رہا تھا۔

"دستنبو" کے اُردو تراجم بھی گزشتہ آٹھ برسوں میں کئی بار ہوئے۔ دو ترجمے پاکستان سے اور دو ہندوستان سے چھپے۔ اب سید معین الرحمٰن صاحب نے بھی زیرِ تبصرہ کتاب میں "دستنبو" کا پورا ترجمہ شامل کیا ہے جو سہل اور بامحاورہ ہے۔ ترجمے پر جا بجا مفید توضیحی حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب اور ۱۸۵۷ء کے متعلقہ مباحث کی تصریحات اور تفسیر کے لیے تمام ممکن مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے وقائع اور حوادث کی تشریح پیش کی ہے۔ تیسرے باب میں ایسے تقریباً کُل اقتباسات جمع کر لیے گئے ہیں جن میں اُس عہد کا حوالہ خطوطِ غالب میں آیا ہے پھر ان کا عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔

ضمیمے میں غالب کا ایک نادر مضمون دربارِ تباہیِ دہلی اور ملکہ وکٹوریہ کا اعلان اور بیگم حضرت محل کا فرمان بھی ہے۔ اس طرح یہ کتاب حُسنِ ترتیب اور تحقیق کا ایک اچھا نمونہ بن گئی ہے اور اسے صرف "دستنبو" کا ترجمہ کہہ کر نہیں گزرا جا سکتا۔ "انقلاب ستاون اور غالب کا شعری ردِ عمل" کے عنوان سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اُن کی نظر کی تہہ رسی اور ذہن کی غیر جانبداری کا شاہد ہے۔ اتنی طویل اور تاریخی حوالوں سے بھرپور اہم کتاب میں انڈکس اور کرانولوجی کا نہ ہونا بہت کھٹکتا ہے۔ اُمید ہے کہ طبعِ ثانی کی نوبت آنے پر معین صاحب یہ کمی ضرور پوری کر دیں گے۔"

آل انڈیا ریڈیو، اُردو سروس، دہلی

—— ۶/ اپریل ۱۹۷۵ء

مولانا امتیاز علی خاں عرشی :

"غالب اور انقلاب ستاون" اکبر سلمہٗ[1] کے ذریعے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ دیکھ کر دل سے آپ کے لیے دُعا نکلی۔ آپ نے محنت کے ساتھ ساتھ بڑے سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ مسالے کی فراہمی میں جیسی کوشش نظر آتی ہے، وہ لائقِ داد ہے۔ آپ جیسے جوانوں کے کام دیکھ کر اُمید ہوتی ہے کہ تحقیق کا مُستقبل روشن ہے۔ خُدا آپ کو اور حوصلہ عطا فرمائے اور مواقع بھی۔

"اشاریۂ غالب" کی تکمیل کو اوّلیت دیجیے[2]، یہ مشورہ مزید ہے۔ اس کی افادیت بیان سے باہر ہے۔ یہ اس واسطے بھی لکھتا ہوں کہ اِس موضوع کے معاملے میں بھی آپ نے تلاش و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ میرے سامنے اور لوگوں کی کوششیں بھی ہیں مگر آپ کا کام بہت بلند و برتر ہے ــــ"

ناظم، رضا لائبریری، رامپور (یو۔پی)

ــــ ۲۰، اگست ۱۹۷۵ء

O

ضمیر نیازی :

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن کی یہ کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" چار ابواب پر مُشتمل ہے۔ پہلا حصہ "دستنبو" (فارسی) کا تعارف ہے۔ "دستنبو" پر حاکمے سے قبل چند حقائق ایسے ہیں جنہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ غالب نے اِس کتاب کا ڈول اُس وقت ڈالا جب اُن کی "زندگی کا باسٹھواں سال شروع ہُوا" (غالب اور انقلاب ستاون، ص ۹۰) اور جسمانی کیفیت کا یہ حال تھا کہ "مَیں بوڑھا اور کمزور...... گوشہ تنہائی میں بیٹھے رہنے...... کا عادی...... (اور) بہرے پن کی وجہ سے بارِ خاطرِ حاضرین...... (ص ۸۱) اور ساتھ ہی ایک بڑے کُنبے کی کفالت کا بوجھ......

اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ داستان، اُس وقت لکھی گئی جب اُن کے چاروں طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی...... اور یہ کہ، یہ روزنامچہ "ذاتی تحفّظ اور فروغِ مراتب" کی غرض سے

---

[1] معروف غالب شناس، اکبر علی خاں عرشی زادہ، اسسٹنٹ ڈائریکٹر، رضا لائبریری، رامپور۔

[2] "اشاریۂ غالب" کی پہلی جلد ۱۹۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور نے شائع کی تھی۔ دوسری اور تیسری جلد کی تکمیل اُس وقت سے زیرِ پیش نظر ہے۔

تحریر کیا گیا تھا۔ لیکن "خاص مصلحتوں" کے باوجود اِس کتاب میں بعض ایسے حقائق بیان ہوتے ہیں جو عام تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ مثلاً، میرٹھ کے سواروں کا دہلی پہنچنے پر استقبال، باغی لشکر اپنے ساتھ جو سونا چاندی لایا تھا، اُس کی شاہی خزانے میں منتقلی، بغاوت میں توسیع، عوام کی آخری دم تک مزاحمت اور بلند حوصلگی، دہلی میں غارت گری اور قتلِ عام، مُسلمانوں کا دہلی سے مکمل انخلا، دو سال تک مُسلمانوں کے دہلی میں داخلے پر پابندی وغیرہ ـــــ اِن حقائق کے پیشِ نظر ڈاکٹر کنور محمد اشرف کی یہ رائے بے بنیاد نہیں ہے کہ "بغاوت سے متعلق بعض واقعات کے لیے مُعتبر اور مُستند مآخذ کی حیثیت سے "دستنبو" کی وقعت کم نہیں ہوتی ـــــ" (انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۲۵۵)

تیسرے باب میں ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے غالب کے خُطوط کی روشنی میں انقلاب کے بارے میں غالب کے "غیر رسمی نُقطۂ نظر" کو پیش کیا ہے۔ یہ "غیر رسمی" نُقطۂ نظر اس ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہونے والے اُس درد و کرب کی عکاسی کرتا ہے جس میں غالب مبتلا تھے۔ مرزا نے "احتیاط و مصلحت" کے نام پر "دستنبو" کی جو نقاب اوڑھ رکھی تھی، ڈاکٹر مُعین نے اس باب کا اضافہ کر کے، اُسے اُتار پھینکا ہے، جس سے غالب کا اصلی چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ غالب نے "شہرِ خموشاں" (دہلی) کی تباہی و بربادی، ادبی و تہذیبی اقدار کی پائمالی، یاروں اور پیاروں کے بیمانہ قتل پر جو آہ و بکا کی ہے، وہ اس باب کے ہر صفحے اور ہر سطر سے عیاں ہے۔ اُن کا انسانیت دوست دل ہر شخص کے بچھڑنے پر ماتم کناں ہے، چاہے وہ کالا ہو یا گورا۔

کتاب کے آخری باب میں ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے انقلاب کے حوالے سے غالب کے شعری رویّے کا جائزہ لینے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے: "انقلاب ستاون کی غارت گری کے اس المیے کی طرف غالب شناسوں کی نظر بالعموم نہیں گئی کہ اس نے ہم سے شاعر غالب کو بالعموم چھین لیا ـــــ" (ص ۱۲۸) ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے اس کی تائید میں شیخ اکرام اور نظ۔ انصاری کے بیانات کا حوالہ دیا ہے، نظ۔ انصاری "غالب شناسی" (ص ۸۰) میں لکھتے ہیں: "اس زمانے میں (۱۸۵۷ء) میں اور اس کے بعد جب تک وہ (غالب) زندہ رہے، اُن کی توجہ نثر پر رہی، فارسی میں کم، اُردو میں زیادہ ـــــ" ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے مندرجہ بالا نتائج کو خود غالب کے خُطوط کی روشنی میں مُستحکم شہادتیں پیش کر کے آگے بڑھایا ہے۔

کتاب کی ایک اور خُصوصیت برِصغیر کے نامور غالب شناس، محمد عبدالرحمٰن چغتائی مرحوم کا ابتدایہ ہے۔ جو "کلماتِ استقبال" کے نام سے شاملِ اشاعت ہے۔ یہ غالباً مُصورِ مشرق کی آخری

تحریر ہونے کی حیثیت سے تاریخی اہمیت کی حامل ہے ـــــ"

سہ ماہی غالب، کراچی، شمارہ ۳،

ـــــ جولائی ستمبر ۱۹۷۵ء ص ۱۹۳ـــ۱۹۶

O

مسعود احمد برکاتی :

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کی تازہ تصنیف "غالب اور انقلاب ستاون" غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے جس میں سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بارے میں غالب کے رویے کو واضح کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

غالب اپنی زندگی میں ناقدری کے شاکی رہے اور حق یہ ہے کہ قدر جیسی ہونی چاہیے تھی، ویسی نہ ہو سکی اور غالب کو زندہ رہنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے، لیکن اُن کی وفات کے بعد حالی سے لے کر ضیائی تک بہت سے غالب شناسوں نے غالب کو غالب کرنے میں فکر و تحقیق کے نئے نئے گوشے نُمایاں کیے اور آج غالب کا مُطالعہ اپنے اَدبی ذوق کا اعتبار پیدا کرنے کے مُترادف ہے لیکن غالبیات کی اس کثرت کے باوجود، اَب بھی مُطالعہَ غالبؔ کے بہت سے پہلو تشنۂ توجہ ہیں۔

"غالب اور انقلاب ستاون" اُن کتابوں میں سے نہیں ہے جو محض غالبیات کی تعداد میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ یہ کتاب غالب کی زندگی اور فن کے مُتعلق نیا انداز فکر بخشتی ہے۔ "رُستخیزِ بے جا" کے دوران غالب کے رویے کی صحیح تعیین میں غالب پرستی مانع ہوتی ہے لیکن ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے پرستش کی سطح سے بلند ہو کر غالب شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ مُعین صاحب نے غالب کی "دستنبو" خطوط اور شاعری کے بالاستیعاب مُطالعے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ "دستنبو" میں غالب نے حالات کو جہاں تہاں نہ صرف کچھ کم کر کے بلکہ رنگ آمیزی کے ساتھ بڑھا چڑھا کر بھی پیش کیا ہےـــ "دستنبو" کا مقصد انگریزوں کی دار و گیر سے اپنی بچت اور اپنی فارسی دانی کا سکّہ جمانا تھا، اس لیے اُنھوں نے "دستنبو" میں دساتیری زبان استعمال کی اور اسی لیے انگریز کے سخت احتسابی نظام کے باوجود یہ کتاب جامۂ طباعت پہن سکی۔ "فارسی ناآمیختہ بہ عربی" نے "دستنبو" کو اہلِ وطن سے پوشیدہ رکھا مگر انگریز حکام کو "نذر کے پارسل" بھیجے گئے۔ کتاب کے شروع میں "ملکۂ معظمہ" کا

قصیدہ بھی شامل کیا گیا اور حکومت سے درخواست بھی کی گئی کہ وہ اس کتاب کو اپنے خرچ پر دوبارہ شائع کرے۔

خواجہ حسن نظامی نے "غالب کا روزنامچہ" میں لکھا ہے: "غالب نے ایامِ غدر میں یہ کتاب لکھی تھی، جب کہ شرفا اور خصوصاً مسلمانوں کا سانس خوف و مایوسی سے گھُٹ رہا تھا۔ اس واسطے اگر اُن کی رائے زنی میں مصلحتِ وقت کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے تو موجودہ نسلوں کو اعتراض نہ کرنا چاہیے کیوں کہ غالب نے باوجود نزاکتِ وقت بعض باتیں ایسی آزادی و بے باکی سے لکھ دیں کہ کوئی دوسرا لکھنا چاہتا تو دارو گیر کے اُس ہولناک وقت میں نہ لکھ سکتا تھا ——" اس میں شک نہیں غالب جیسے بے روزگار، امن پسند اور ضعیف شاعر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اقتدار سے ٹکر لے اور بغاوت میں کوئی نمایاں کردار ادا کرے۔

ہاں، یہ ضرور ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں ایک ضعیف الارادہ انسان، وقت اور احتیاج سے مجبور ہو کر صدہا باتیں اوپری دل سے کر بیٹھتا ہے مگر کچھ اس سے دل کے اصلی محسوسات و جذبات مٹ نہیں سکتے ——" اور غالب کے احساسات اُن کے خطوں میں ظاہر ہوتے خط کے راز رہنے کی اُمید میں اپنے دل کی بھڑاس اپنے مکاتیب میں نکال لیتے تھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس انقلاب نے غالب سے شاعری چھین لی۔ معین الرحمٰن صاحب نے ایک مبسوط و مدلل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انقلاب ستاون نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا، جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اس کے بعد ہوا۔ یہ نتیجہ ایک حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن جس طرح غالب کے کلام کی زمانی ترتیب کو پیش نظر رکھ کر شعری رویّہ واضح کیا گیا ہے، اُس طرح ہمیں غالب کے خطوط کی تاریخی ترتیب ملحوظ رکھ کر تجزیہ کرنا ہوگا کہ مارچ ۱۸۴۸ء سے (جب سے غالب نے اُردو میں خطوط لکھنے شروع کیے) ۱۸۵۷ء تک اور پھر ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۶۹ء تک خطوط کی تعداد اور اُن کا تناسب کیا ہے۔ یعنی غالب نے ۱۸۵۷ء سے پہلے زیادہ خطوط لکھے یا اس کے بعد۔ اگر غالب نے ۱۸۵۷ء سے ہی خطوط اور دوسری نثری تحریریں لکھنی شروع کی ہوتیں تو ہم کہہ سکتے تھے کہ نثر نگار غالب کا ظہور انقلاب کے بعد ہوا۔[1]

---

[1] میرا کہنا یہ ہے کہ اُردو کے نثر نگار کے بطور غالب کا "ظہور" انقلاب ستاون کے بعد ہوا، نہ یہ کہ اُن کی اُردو نثر نگاری کا آغاز اس انقلاب کے بعد ہوا۔ اگرچہ یہ [illegible] بھی کچھ ایسی زیادہ خلافِ حقیقت نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۳۱ پر)

تاہم مُعین صاحب نے جو موقف اختیار کیا ہے، اُس کی بنیاد فکر اور تحقیق پر ہے اور اس میں شک نہیں کہ اِس کتاب کی ترتیب و تالیف میں اُن کو بہت عرق ریزی اور جاں فشانی سے کام لینا پڑا ہوگا اس سے قبل بھی "اِشاریۂ غالب" اور اپنی دوسری کتابیں مُرتّب کرنے میں اُنھوں نے دل چسپی کا ثبوت دیا ہے۔

اِس کتاب کی ایک خُصوصیت "کلماتِ استقبال" کے عنوان سے مُصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کی تقریظ بھی ہے جو مرحوم کی مطبوعہ تحریروں میں آخری ثابت ہوئی۔ افسوس کہ وہ "کارِ چغتائی" کے نام سے دیوانِ غالب کا جو نیا ایڈیشن شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اُس سے ہم محروم رہ گئے۔"

(سہ ماہی "غالب" کراچی، شمارہ ۲

—— جولائی، ستمبر ۱۹۷۵ء ص ۱۹۶—۱۹۹)

O

پروفیسر متین الرحمٰن مرتضٰی[1]:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے ذریعے "غالب اور انقلاب ستاون" ملی، ابھی روز میں نے پڑھ بھی ڈالی۔ غالب کے کردار کے ایک پہلو کا بہت عُمدہ تعارف ہے۔ کتاب اپنے مواد اور موضوع کے اعتبار سے بہت اچھی ہے۔

—— شعبۂ صحافت، کراچی یونیورسٹی، کراچی

⊙

"اُردو نثر میں غالب کی کوئی کتاب سرے سے ماقبل انقلاب شائع نہیں ہوئی۔ اُن کی نثر اُردو کی سب کی سب کتابیں ۱۸۵۷ء کے بعد چھپیں۔ مُباحثۂ بُرہان کے سلسلے کی چار اُردو کتابیں تو لکھی بھی گئیں ۱۸۵۷ء کے بعد۔ یہ ایک سلسلے سے ایّامِ انقلاب میں غالب کی خانہ نشینی کا حاصل ہیں۔ غالب کے اُردو خطوں کے سارے مجموعے بھی انقلاب ستاون کے بعد منظرِ عام پر آئے اور اِن خطوط کا اسی فیصد سے متجاوز حصہ انقلاب ستاون کے بعد کا رقم کردہ ہے۔"

(غالب اور انقلاب ستاون، طبع اول ص ۱۹۶)

اس بنا پر مَیں یہ کہتا ہوں کہ نثر نگار غالب کا ظہور، اس انقلاب کے بعد ہُوا اور اُن کا کُل سرمایۂ نثرِ اُردو کسی نہ کسی سطح پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب ہی کی دین ہے۔ (—— مُعین الرحمٰن)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ :

"آپ کی بہت ہی اچھی کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" ملی۔ کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی۔ آپ کا یہ کام اس لائق ہے کہ آپ کو گلے لگایا جاتے اور آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دے دیا جاتے۔ خدا آپ کی موجِ خرام کو چشمِ بد سے محفوظ رکھے اور آپ اپنی دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا سے تحقیق کی راہوں میں جو گُل کترتے رہے ہیں، ہم تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ اُن کی خوشبو سے ہمارے مشامِ جان بھی مُعطر ہوتے رہیں۔ مَیں آپ کے ایک ایک لفظ کو اپنے استفادے کے لیے پڑھنا چاہتا ہوں۔ بابائے اُردو اور غالب پر آپ کی دوسری کتابیں بھی اگر کہیں سے ہاتھ آجائیں تو اُنھیں اپنی دولت میں شمار کروں گا ——"

صدر شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

—— یکم مئی ۱۹۷۵ء

O

پروفیسر عبدالقوی دیسنوی :

"آپ کی کتاب آئی جس نے غالب کی یاد دلائی اور انقلاب ستاون کی بھی۔ دلی مُبارکباد قبول کیجیے، اس خوب صورت کام کے لیے۔ ظاہر بھی خوب اور باطن بھی خوب۔ دل سے دُعا نکلتی ہے کہ آپ "غالبیات" کے کام کو نہایت بہتر طور سے آگے بڑھا رہے ہیں ——"

صدر شعبۂ اُردو سیفیہ کالج، بھوپال

—— ۷ر دسمبر ۱۹۷۴ء

O

اکبر علی خاں عرشی زادہ :

"آپ کا مرسلہ تحفہ "غالب اور انقلاب ستاون" ملا۔ آپ کی محنت اور سلیقے کو دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ جزاک اللہ۔ ابّا (مولانا امتیاز علی خاں عرشی) نے کتاب بہت پسند کی ہے ... سب سے پہلے داؤد ادبی انعام پر دلی مُبارکباد قبول کیجیے، ابّا بھی دُعا لکھواتے ہیں ——"

—— رضا لائبریری، رامپور

O

ڈاکٹر عنوان چشتی :

آج کا دن، آپ سے دور ہوتے ہُوتے بھی، آپ کے ساتھ گزُرا ـــــ "غالب اور انقلاب ستاونؔ" کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور آپ کے تنقیدی شعور اور طرزِ پیش کش کی داد دیتا رہا۔ آپ کی تحریر کے خلوص نے اور بھی مُتاثر کیا، غالب پر آپ کا یہ کام بہت اہم ہے ـــــ"

شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
ـــــ ۵ر فروری ۱۹۷۵ء

O

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی :

"غالب اور انقلاب ستاون" اور آپ کی دوسری کتابیں دیکھیں۔ مَیں نے کیمسٹری میں عمر یہاں اور خاصے بڑے عرصے تک باہر بھی پڑھانے میں وقت گزارا ہے اور اب تو پندرہ بیس برس سے ذریعۂ معاش بھی ہے۔ لیکن اُردو کی شُد بد سے بھی واقفیت رکھنے کی ہمیشہ کوشش رہی ہے۔ علی گڑھ میں رہ بس جانے سے ایک "خرابی" یہ ہوئی کہ کس طرح بی گریڈ کی چیز پر نظر نہیں جاتی۔ آپ کی کتابیں چونکا دینے والی لگتی ہیں۔ خدا کرے درس و تدریس کے ساتھ لکھنے کا کام اسی اعلیٰ سطح پر ہوتا رہے ـــــ"

علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ـــــ ۲۸ر مارچ ۱۹۷۵ء

O

شان الحق حقی :

"واقعات ۱۸۵۷ء کی نسبت سے غالب کی نظم و نثر اور اُن کی مُستقل تالیف "دستنبو"، کا ذکر اکثر ہوتا رہا ہے، لیکن زیرِ نظر کتاب اپنے موضوع پر سب سے مُفید اور جامع تالیف ہے جس میں نہ صرف غالب کی تمام مُتعلقہ تحریریں بڑی محنت سے جمع کی گئی ہیں بلکہ "دستنبو" کا مکمل ترجمہ بھی شامل ہے اور اس پر سیر حاصل محاکمہ بھی۔ یہ غالب کی سیرت کا ایک ایسا ہی ناقابلِ فراموش باب ہے، جیسے کہ ہماری اپنی تاریخ کا ـــــ مگر ایک ناقد یا مورخ کے لیے اس کے سوا چارہ کار بھی کیا ہے کہ

حقائق کو جوں کا توں تسلیم کرے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے حقائق کے بیان میں غالب کی طرفداری نہیں کی اور طعن و تعریض سے بھی پرہیز کیا ہے۔ وہ ایک منجھے ہوئے ناقد اور محقق ہیں، انھوں نے اپنی سلجھی ہوئی تنقید اور کار آمد حواشی سے کتاب کو نہایت دل چسپ اور قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر دوسرے ناقدین کی تحریروں کے بھی سیر حاصل اقتباسات دیتے ہیں اور ان کو بڑی ژرف نگاہی سے جانچا پرکھا ہے۔ اُن کی اس تمام کاوش کا یہ خلاصہ کہ ۱۸۵۷ء نے ہم سے غالب شاعر کو چھین لیا اور نثر نگار کو جنم دیا ۔ مطالعہ غالب کے سلسلے میں ایک نئی بصیرت کا حکم رکھتا ہے، اور موضوع پر پوری بحث قابلِ مطالعہ ہے۔

کتاب عبدالرحمٰن چغتائی (مرحوم) کے لکھے ہوئے پیش لفظ یا کلماتِ استقبال سے مزین ہے۔ اس میں مزارِ غالب کی نئی اور پرانی تصاویر بھی شامل ہیں، جو اس لحاظ سے بھی موزوں ہیں کہ مصنف نے ۱۸۵۷ء میں شاعر کی معنوی موت کا واقعہ بڑی کاوش سے دریافت کیا ہے ـــ"

(اُردو نامہ کراچی شمارہ ۵۰، مارچ ۱۹۷۵ء ص ۴۴۶)

O

ڈاکٹر وحید قریشی :

"غالب اور انقلاب ستاون" کے شروع کے چوہتر صفحے ابتدائی اوراق کو چھوڑ کر "دستنبو" کے تعارف کو پیش کرتے ہیں، پھر ترجمے کا متن مع حواشی ہے۔ کتاب کے آخر میں انقلاب ۱۸۵۷ء سے متعلق وہ اقتباسات ہیں جو غالب کے خطوط سے یک جا کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد انقلاب ۵۷ء اور غالب کا شعری ردِ عمل شریکِ اشاعت ہے۔ دو ضمیموں میں کچھ اور متفرق معلومات درج ہیں ـــ

ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ "دستنبو" کی اشاعتوں، موضوع، تجویزِ طباعت، ترسیل کتاب، انگریزوں سے مراسلت، پنشن کے اجرا کی امید، ملکہ وکٹوریہ کی مدح، طبع کا سرورق اور خاتمہ، قطعاتِ تاریخ، دستنبو کی زبان، استعمال کی حکمت، جمع و ترتیب، طبع اول کا انکاس، مندرجات کی کیفیت، غرضِ تصنیف، تین اشاعتوں اور قلمی نسخے کو حاوی ہے ......

"حیاتِ غالب" از : شیخ محمد اکرام میں دہلی کی جانکنی کے عنوان سے غالب کے بعض بیانات کی تردید مسز سانڈرسن کے خط کے حوالے سے کی گئی ہے۔ معین صاحب نے اس موقع پر ۱۸۵۷ء سے متعلق معاصر شہادتوں سے اس استدلال کو آگے بڑھایا ہے اور مقدمے کا یہ حصہ پرانے معلومہ مواد

میں اضافے کا باعث ہُوا ہے .....

انقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویہ کا بنیادی نتیجہ اگرچہ نیا نہیں مُعین صاحب کے علاوہ اور کتنی غالب شناس اس کے قائل رہے ہیں، لیکن مواد کی فراہمی اور کلامِ غالب کے ساتھ اس کی کڑیاں ملا کر غالب کے آخری دور کے کلام کو سمجھنے کے لیے مُعین صاحب کے زاویۂ نظر سے بصیرت ضرور ملتی ہے، اس لحاظ سے اس حصّے کو کتاب کا حاصل سمجھنا چاہیے .....

ڈاکٹر مُعین الرحمٰن کی یہ کاوش دورِ حاضر میں غالب کو عوام میں روشناس کرانے کا موقع فراہم کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب غالبیات پر ڈگری لے چکے ہیں، موضوع کی مُناسبت سے اُن کے سامنے مواد کا ذخیرہ وافر طور پر موجود ہے ..... وہ جواں سال ہیں، جواں ہمت ہیں، ان میں وہ صبر اور محنت ہے جو اچھی تحقیق کا پیش خیمہ ہُوا کرتی ہے۔

ریڈیو پاکستان ۰ لاہور
—— اکتوبر ۱۹۷۴ء

O

ڈاکٹر فرمان فتح پوری :

غالب اور غالبیات پر ایک دو نہیں سینکڑوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ لکھنے والے تھکتے ہیں، نہ پڑھنے والے سیر ہوتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ غالب کا ہر بالغ نظر نقاد، اُس کی شخصیت اور کلام سے کوئی نہ کوئی ایسا اچھوتا پہلو اپنی گفتگو کے لیے نکال لیتا ہے کہ وہ علم و ادب کے قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے، کم از کم زیرِ نظر کتاب کی یہی صورت ہے۔ اس میں ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن نے غالب کی زندگی اور فکر و نظر کے بارے میں بعض ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے جو ابھی تک غالب کے عام قاری ہی نہیں خاص سے بھی پوشیدہ تھیں۔

ہر چند کہ کتاب کی اساس غالب کی مشہور کتاب "دستنبو" پر قائم ہے لیکن مُصنّف نے "دستنبو" کے حوالے سے غالب کے مُتعلق اتنا قیمتی اور نیا مواد اس کتاب میں جمع کر دیا ہے کہ جو لوگ غالب کے ذہن کو فی الواقع پڑھنا چاہتے ہیں، اُن کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ غالب نے "دستنبو" کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران روزنامچے کے انداز میں لکھا تھا، لیکن کچھ ایسے پیشتر

کے ساتھ کہ ایک طرف وہ اپنے ہم وطنوں میں سُرخرو بنے رہ سکیں اور دوسری طرف فرنگی حکمرانوں کی خوشنودی بھی حاصل کر سکیں۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لیے اُنھوں نے "دستنبو" کو کس انداز سے مُرتب کیا تھا اور اس کے لیے فارسی کا کونسا اسلوب اختیار کیا تھا اُس کی تفصیل اس جگہ ممکن نہیں، مُعین صاحب کی کتاب کے مُطالعے ہی سے اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے ـــــ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن نے "دستنبو" کے اُردو ترجمے کو ضروری حواشی و تعلیقات اور مقدمے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کردیا۔ اس طرح "دستنبو" کے مطالب و مباحث تک عام و خاص، سب کی رسائی ہوگئی اور غالب کے بارے میں کئی ایسی باتیں سامنے آگئیں جو صرف نئی نہیں بلکہ بعض وجوہ سے حیرت انگیز بھی ہیں "دستنبو" کے نکات کو سمجھنا، اس کے منظر اور پس منظر پر وثوق سے گفتگو کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی، لیکن مُعین صاحب چونکہ غالبیات کے پی ایچ ڈی ہیں اور غالب کا مُطالعہ اُن کی ادبی زندگی کا محبوب مشغلہ رہا ہے، اس لیے وہ اس مشکل کام سے باآسانی گزر گئے ہیں اور غالب پر ایک ایسی کتاب دے دی ہے جو غالب کے سلسلے میں کئی کتابوں کی محرّک بن سکتی ہے۔"

(نگار پاکستان، کراچی، جنوری فروری ۱۹۷۵ء، ص ۶۳ - ۶۴)

O

ڈاکٹر شمس الدین صدّیقی :

ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن کی کتاب "غالب اور انقلاب ستاون" سنگِ میل پبلی کیشنز نے لاہور سے شائع کی ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔ مجلد مع خوبصورت گرد پوش، ضخامت ۲۱۶ صفحات، قیمت پندرہ روپے۔

یہ کتاب چار حصّوں میں مُنقسم ہے۔ پہلے حصّے میں غالب کے فارسی روزنامچے "دستنبو" کا مُفصّل تعارف کرایا گیا ہے۔ دوسرے حصّے میں دستنبو کا اُردو ترجمہ مع حواشی ہے۔ تیسرے حصّے میں غالب کے خطوط سے وہ اقتباسات یکجا کیے گئے ہیں جو سن ستّاون اور اس کے بعد کے واقعات کے بارے میں کچھ کہتے ہیں اور آخری حصّے میں سن ستّاون کے تعلق سے غالب کے شعری ردّیے سے بحث کی گئی ہے۔ دو ضمیمے بھی شاملِ کتاب ہیں۔ پہلا ضمیمہ بعنوان "تباہی شہر دہلی" اُس مضمون پر مشتمل ہے۔ جو غالب نے دہلی سوسائٹی کے لیے ۱۸۶۵ء میں لکھا تھا اور رسالہ دہلی سوسائٹی کے شمارہ اوّل میں

شائع ہُوا تھا۔ دوسرے ضمیمے میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کا اعلان جاری کردہ نومبر ۱۸۵۸ء اور اس پر لکھنؤ کی بیگم حضرت محل کا تبصرہ شامل ہے۔ غالب کے مزار کی دو تصویریں اور انقلاب ستاون سے متعلق غالب کی چار نادر قلمی تحریروں کے عکس بھی شامل کتاب ہیں

غالب کی تصنیف "دستنبو" قدیم فارسی زبان میں لکھے ہوئے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اسرجولائی ۱۸۵۸ء تک کے روزنامچے پر مشتمل ہے۔ "دستنبو" پہلی بار نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپی تھی۔ اس کی اشاعت سے غالب کا مقصد یہ تھا کہ قلعۂ معلّی سے اپنے تعلق کے داغ کو مٹایا جاسکے اور انگریز حکام کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر پنشن اور خلعت وغیرہ کو دوبارہ جاری کر دیا جائے چونکہ انگریز حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے غالب نے اپنے حقیقی تأثرات، مشاہدات اور واقعات کے اظہار میں مصلحت کوشی اور موقع شناسی کو پیش نظر رکھا تھا اس لیے ڈر تھا کہ عام قارئین غالب پر انگشت نمائی کریں گے۔ اسی لیے اُس نے ایسی قدیم فارسی زبان اختیار کی جس میں عربی الفاظ نہ ہونے کے برابر تھے، تاکہ عام قارئین اسے سمجھ ہی نہ سکیں۔ ہُوا بھی یہی کہ غالب کے ہم عصر عام طور پر "دستنبو" کے مطالب سے نا آشنا ہی رہے۔ آج جب کہ فارسی کا ذوق، اُس زمانے کے مقابلے میں بہت ہی کم رہ گیا ہے "دستنبو" کو سمجھنا قارئین کے لیے اور بھی دُشوار ہو گیا ہے۔ فاضل مؤلف نے "دستنبو" کا جو اُردو ترجمہ جو رسالہ "اُردوئے مُعلّی" دہلی میں فروری ۱۹۶۱ء میں شائع ہُوا تھا، اپنے مُحققانہ حواشی کے ساتھ شامل کتاب کر کے غالب کے اس روزنامچے کو آج کے عام قاری کی دسترس میں کر دیا ہے، جس کے لیے ہمیں اُن کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

"دستنبو" کی اشاعت، اس کے موضوع، اس کی غرض تصنیف اور اہمیت وغیرہ کے بارے میں مُعین صاحب نے تمام ممکنہ معلومات بطور تعارف یک جا کر دی ہیں ...... "دستنبو" تو غالب نے ذاتی تحفظ اور فروغ مراتب کی غرض سے لکھی تھی، اس لیے اس میں انگریز حکام کی تائید و تحسین بھی ہے اور ان کی وکالت بھی لیکن غالب کے نجی خطوط سے اُس کے حقیقی جذبات اور سوز دروں کا خوب پتا چلتا ہے۔ مُعین الرحمٰن صاحب نے بڑی محنت سے وہ سب اقتباسات غالب کے خطوط سے نکال کر ترتیب دیے ہیں جن کا تعلق سن ستاون اور اس کے بعد کے واقعات سے ہے ......

کتاب کے آخری حصے میں ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن نے یہ ثابت کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا سانحہ جس پر غالب نے اپنے خطوط میں بہت کچھ لکھا ہے، اُس کے ذوق شعر گوئی کے لیے مہلک ثابت ہُوا، اور اُس نے شعر گوئی تقریباً ترک ہی کر دی۔ اگر کچھ لکھا بھی تو اپنی مدافعت اور نئے نظام

کی مدحت میں، چنانچہ اس میں سن ستاون کی داستانِ الم کا کچھ انعکاس نہیں ملتا۔"

ڈاکٹر سید محمود نے دیوانِ غالب کے نظامی ایڈیشن پر جو ۱۹۱۹ء میں شائع ہُوا تھا۔ ایک مُقدمہ لکھا تھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انقلابِ ستاون نے غالب پر بہت اثر کیا تھا؛ چنانچہ اس کی تائید میں غالب کے تیس سے زیادہ اُردو شعر بھی پیش کیے تھے، لیکن بعد میں غالب کے کلام کی توقیت کا کام ہُوا تو معلوم ہُوا کہ وہ سب شعر غالب نے ۲۴ سال کی عمر تک لکھ لیے تھے۔ مُعین صاحب نے اَسناد کے ساتھ ڈاکٹر سید محمود کے خیالات کی تردید کر دی ہے۔ سن ستاون کے بعد سے وفات تک بارہ سال کے عرصے میں غالب کی اُردو اور فارسی شعری تخلیقات صرف یہ ہیں: ستاّ غزلیں، گیارہ قطعات، چار قصائد، تین رُباعیات، ایک مرثیے کے تین بند، ایک مثنوی کے تین شعر اور چند مُفرد اَبیات، ان میں بھی کئی چیزیں فرمائشی اور وقتی نوعیت کی ہیں۔

غرض فاضل مُحقق نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ انقلاب ستاون نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا جبکہ نثر نگار غالب کا ظہور سن ستاون کے بعد ہوا۔ اس نکتے کو سب سے پہلے شیخ محمد اکرام نے واضح کیا تھا لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اس کے لیے جو تائیدی اور استدلالی بحث کی ہے، اُس کی اہمیت بہر حال تسلیم کی جانی چاہیے ——— "غالب اور انقلاب ستاون" بلاشبہ غالبیات کے سرمائے میں ایک وقیع اضافے کا درجہ رکھتی ہے ———"

ریڈیو پاکستان، پشاور

——— ۱۳ر مارچ ۱۹۷۵ء، ساڑھے دس بجے شب

○

ڈاکٹر جمیل جالبی :

اِس تصنیف "غالب اور انقلاب ستاون" میں ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن۔ نے غالب کی تصنیف "دستنبو" کا اُردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ ابتدا میں "دستنبو" کا تعارف ہے اور پھر ترجمے کے بعد خطوطِ غالب کی مدد سے ۱۸۵۷ء کے حالات و عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے اگلے باب میں غالب کے شعری رویے اور انقلاب ستاون کا ربط و فرق دکھایا گیا ہے۔ آخر میں دو ضمیمے بھی شامل کتاب ہیں جن میں سے ایک میں غالب کے ایک نادر مضمون "درباب تباہی شہر دہلی" کو پیش کیا گیا ہے اور دوسرے میں ملکہ وکٹوریہ کا اعلان اور بیگم حضرت محل کا فرمان شامل کیا گیا ہے۔ غالب کے

سلسلے کی یہ ایک قابلِ توجہ کتاب ہے۔

نیا دور، کراچی
—— شمارہ ۶۵—۶۶، خاص نمبر ۱۹۷۵ء

○

مشفق خواجہ :

ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن کو غالب سے ایک خاص خصوصیت ہے۔ "غالب اور انقلاب ستاون" غالب پر مُعین صاحب کی تیسری کتاب ہے۔ غالب پر اُن کی پہلی کتاب "اِشاریۂ غالب" تھی جسے غالب صدی کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی نے شائع کیا تھا۔ غالب پر یہ اتنا عمدہ کام ہے کہ اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں۔ "اشاریہ ساز" تو کتنی ایک ہیں لیکن مُعین صاحب ایسی نفاست اور سلیقہ مندی کسی میں نہیں۔ یہ اشاریہ بذاتِ خود غالبیات میں اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔ اچھا کام تو اپنا انعام خود ہوتا ہے، لیکن کام کا اعتراف بھی ایک نعمت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ "اشاریۂ غالب" پر ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور نے مُعین صاحب کو تین ہزار روپے کے انعام سے سرفراز کیا ——

"غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مُطالعہ"، غالب پر مُعین صاحب کا دوسرا اہم اور ضخیم کام ہے۔ جس پر اُنھیں سندھ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند عطا کی جو بجائے خود مُعین صاحب کی محنت اور کاوش کا اعتراف اور انعام ہے ——

"غالب اور انقلاب ستاون" ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن کی تازہ تحقیقی کاوش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب لوگ محض صاحبِ کتاب بننے کے شوق میں کتابیں لکھتے ہوں، مُعین صاحب کے ذوق و شوق، انہماک اور محنت کو دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے۔ یہ کتاب لکھ کر مُعین صاحب نے موضوع ہی سے نہیں، اُن لوگوں سے بھی اِنصاف کیا ہے، جو مُعین صاحب سے نیک توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ یہ کتاب حقیقتاً غالبیات میں اہم اضافہ ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح خود مُعین صاحب کی ذات، ماہرینِ غالبیات میں۔

—— ناظم آباد، کراچی

○

ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی :

"غالب اور انقلاب ستاون" پر داؤد ادبی انعام ملنے کی خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مُبارک و مسعود فرمائے آمین۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ آپ نے اس کتاب پر حسب مزاج محنت بھی بہت کی ہے۔ مجھے یہ بے حد دل چسپ معلوم ہوئی ——"

صدر شعبۂ اُردو سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد

—— ۱۴؍مئی ۱۹۷۵ء

○

ڈاکٹر ایم - اے - عزیز :

"غالب اور انقلاب ستاون" بہت خوب ہے۔ مَیں نے اسے نہایت دل چسپی کے ساتھ پڑھا یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ مجھے یہ اس لیے بھی بہت پسند آئی کہ بعض باتوں کے متعلق میرا بھی وہی نقطۂ نگاہ ہے جن کی اس کتاب میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس کتاب پر ۱۹۷۴ء کے داؤد ادبی انعام کے اعزاز پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

—— کراچی، مئی ۱۹۷۵ء

○

ڈاکٹر عبادت بریلوی :

"غالب اور انقلاب ۵۷ء" مل گئی تھی میں نے اسے بہت شوق سے پڑھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے کہ آپ کام کرتے رہتے ہیں —— اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ ایک زمانے سے مُلاقات نہیں ہوئی، ملنے کو جی چاہتا ہے، لاہور آئیے تو ضرور وقت نکالیے ——"

پرنسپل یونیورسٹی اورنٹیل کالج، لاہور

—— ۲۴؍جنوری ۱۹۷۴ء

○

ڈاکٹر عبدالشکور احسن :

پچھلے ہفتے ایران سے لوٹنے پر آپ کا گرامی نامہ ملا ۔ یادآوری اور محبت کا بے حد ممنون ہوں "غالب اور انقلاب ستاون" کا منتظر رہا ۔ آج ایک صاحب اسے مرحمت فرما گئے ۔ اس گراں قدر تحفے کا ہی شکریہ ادا نہیں کرتا بلکہ کتاب میں خاکسار کو یاد رکھنے کی بھی سپاس گزاری لازم ہے۔ انشاءاللہ کتاب سے پورا استفادہ کروں گا ـــــ"

صدر شعبۂ فارسی ، ڈین فیکلٹی آف اسلامک اینڈ
اورنٹیل لرننگ ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور
ـــــ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

O

غلام قادر آزاد :

"... اسی دوران میں سید معین الرحمٰن صاحب کا خط مع "غالب اور انقلاب ستاون" کے ملا ۔ اب معلوم ہوا کہ وہ جس قدر خوش فکر ہیں ، اُسی قدر زرّیں رقم بھی ۔ کتاب سے بھی اُن کا ذوقِ حسن نمایاں ہے ۔ ایسے معنوی شاگرد جن کے فکر و نظر کو مولانا غلام رسول مہر ایسے فاضل اجل بھی داد دیں کسی بھی اُستاد کے لیے مایۂ صد فخر ہیں ، ایسے نیاز مندوں پر آپ کو جس قدر ناز ہو کم ہے ....." (بنام پروفیسر سید وقار عظیم صاحب)

خراب آباد ، لندن
ـــــ ۷ مئی ۱۹۷۵ء

O

پروفیسر مشرف انصاری :

"غالب اور انقلاب ستاون" کو مزے لے لے کر پڑھ رہا ہوں ۔ غالب کی "ابن الوقتی" تو بہر حال مُسلّم تھی لیکن "دستنبو" کے مندرجات سے استدلال کر کے آپ نے اسے جس طرح ثابت کیا ہے، یہ بلاشبہ آپ ہی کا حصّہ ہے ۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ـــــ مجھے اس سلسلے میں غالب کا وہ

تعزیت نامہ یاد آ رہا ہے جس میں اُنہوں نے یوسف مرزا کے والد محمد نصیر مرحوم کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے :

"..... دوسرا امر، یعنی تبدیلِ مذہب، عیاذاً باللہ ! علی کا غلام کبھی مُرتد نہ ہوگا
ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ حضرت چالاک، سخن ساز اور ظریف تھے۔ سوچے ہوں گے کہ ان
دموں میں اپنا کام نکالو اور رہا ہو جاؤ، عقیدہ کب بدلتا ہے ——"

مَیں سمجھتا ہوں کہ یہی مسلک غالب کا بھی تھا۔ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ قلعۂ معلّیٰ سے بے تعلق اور نئے حکام کی مدح سرائی کی جاتے اور وہی اُنہوں نے کیا۔ اس ضمن میں آپ نے جس بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کیا، اور نتائج نکالے ہیں، وہ لائقِ تحسین ہے۔ افسوس! مرحوم حمید احمد خاں نہ ہوتے، ورنہ بے محابا خوش ہوتے اور دل کھول کر داد دیتے ——

شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور
—— ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۴ء

ڈاکٹر تبسم کاشمیری :

"آپ کی عنایت سے "غالب اور انقلاب ستاون" کا ایک نُسخہ مجھ تک پہنچا ہے۔ کتاب پڑھ رہا ہوں۔ آپ نے جس محنت، عرق ریزی اور تحقیقی خلوص کا صفحے صفحے پر ثبوت دیا ہے، اُس کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ بہت اچھا کام ہُوا ہے۔ اس سے پہلی بار انقلاب ستاون میں غالب کا کردار اتنی وضاحت سے سامنے آیا ہے ——"

شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور
—— ۵ اکتوبر ۱۹۷۴ء

سلیم اختر :

"ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ۱۹۷۴ء کی داؤد ادبی انعام یافتہ کتاب، "غالب اور انقلاب ستاون" ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بارے میں غالب کے شخصی، نثری اور شعری رویّوں سے متعلق ہے۔ غالب کے خطوط کی روشنی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بارے میں غالب کے کردار کو کامیابی سے اُجاگر کیا گیا ہے (صفحہ ۲۷۸) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی کتاب تنقید و تحقیق میں نئی جہات کی نشاندہی کرتی ہے (صفحہ ۲۷۷)۔"

(اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، طبع چہارم، ستمبر ۱۹۷۵ء)

"غالب اور انقلاب ستاون" "دستنبو" کے ترجمے اور اس سے وابستہ دیگر مباحث پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے "دستنبو" کے تجزیاتی مطالعے میں غالب کے خطوط اور دیگر ہم عصر اور معتبر تاریخی شواہد کی امداد سے غالب کی جو تصویر پیش کی ہے، وہ شاید غالب کے مداحوں کے لیے قابل قبول نہ ہو ....."دستنبو" کے ضمن میں ڈاکٹر معین نے کمال محنت سے حواشی وغیرہ تحریر کیے ہیں۔

کتاب کا آخری حصہ بعنوان "انقلاب ستاون اور غالب کا شعری رویہ" غالب کے فن کا ایک خاص زاویے سے جائزہ لینے کی تنقیدی کوشش ہے اور ڈاکٹر سید محمود کے ۱۹۱۹ء میں مطبوعہ مقدمے میں کیے گئے اعتراضات(؟) کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ نتیجے میں ڈاکٹر محمود کے اعتراضات(؟) کی کامیاب تردید، اس کتاب کا سب سے زوردار حصہ ثابت ہوا ہے ـــــ "دستنبو" اور اس سے وابستہ اہم مباحث سے دلچسپی رکھنے والے "غالبین" کے لیے یہ ایک مفید کتاب ہے ـــــ'

(ماہنامہ کتاب، لاہور فروری ۱۹۷۵ء ص ۲۷ ـ ۲۸)

عنایت اللہ (مدیر) :

"غالب اور انقلاب ستاون" ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کی، غالب پر تیسری کتاب ہے جتنا کام ڈاکٹر صاحب نے غالبیات میں کیا ہے، بہت کم لوگوں نے اس انداز میں لکھا ہے۔ غالب کے متعلق پہلی تخلیق ("اشاریۂ غالب") پر انہیں ثانوی تعلیمی بورڈ نے تین ہزار کے انعام سے نوازا۔ دوسری تصنیف "غالبیات کا تحقیقی مطالعہ" پر سندھ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند دی۔

"غالب اور انقلاب ستاون" ڈاکٹر صاحب کی تازہ تحقیقی کتاب ہے۔ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ غالب نے "دستنبو" کے نام سے ایک کتاب ۱۸۵۸ء میں لکھی تھی۔ یہ فارسی زبان میں تھی ـــــ "غالب اور انقلاب ستاون" کا پہلا حصہ "دستنبو" کے تعارف کے متعلق ہے۔ دوسرا حصہ "دستنبو" کا ترجمہ ہے۔ تیسرے حصے میں غالب کے چند خطوط ہیں جو وہ ۱۸۵۷ء کے بارے میں اپنے دوست احباب کو لکھتے رہے۔ آخری اور چوتھے حصے میں ستاون کے انقلاب اور غالب کے شعری رویے پر بحث کی گئی ہے اور غالب کی شخصیت پر جو اثر ستاون کی جنگ آزادی کا ہوا، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ اس انقلاب کے بعد غالب، وہ غالب نہیں رہے تھے، جو مقام، اُن کا ایک شاعر کی حیثیت سے تھا، وہ کھو بیٹھے تھے اور اس شاعر کے بعد ایک نثر نگار پیدا ہوا ـــــ غالبیات میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔"

(ماہنامہ حکایت، لاہور، اپریل ۱۹۷۵ء، ص ۵۱ ـ ۵۲)

PTV

پروفیسر سیّد وقار عظیم	کشور ناہید	ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن
––– مبصر	––– میزبان	––– مہمان

کشور ناہید : ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی نئی تصنیف "غالب اور انقلاب ستاون" ہمارے پیش نظر ہے اور خوش قسمتی سے کتاب کے مُصنّف ہمارے اسٹوڈیوز میں تشریف رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ پروفیسر سید وقار عظیم صاحب بھی تشریف فرما ہیں جو کتاب پر اپنی رائے دیں گے۔

اس کتاب میں یہ تھیسس بنایا گیا ہے کہ غالب نے اپنے زمانے میں، خاص طور سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے زمانے کو اپنی نثر میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے لیکن شعر میں جنگِ آزادی کے کچھ اثر یا اثرات نہیں ––– پھر "دستنبو" میں بات "دستخیز بے جا" کے انداز میں بیان ہوئی ہے ––– وقار بھائی، پہلی چیز جو میں آپ سے پوچھوں گی جو ترجمہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن صاحب نے اپنی تصنیف میں شامل کیا ہے، کیا یہی سب سے فصیح ترجمہ تھا، جو آپ کی نظر سے کبھی گزرا ہو؟

وقار عظیم : بات یہ ہے کہ جیسا ڈاکٹر معین الرحمٰن صاحب نے اپنی کتاب کے مُقدّمے میں لکھا ہے۔ "دستنبو" کے چار ترجمے ہوئے اور اگر وہ چاروں ترجمے عام طور پر ملتے تو پھر اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ یہ دوبارہ چھپتا۔ اصل میں ترجمے ہوئے، لیکن وہ ملتے نہیں اور عام لوگوں کی دسترس میں نہیں۔

کشور ناہید : لیکن محمود سعیدی کا ترجمہ تو دستیاب ہے۔

وقار عظیم : جی ہاں وہ چھپا، لیکن نایاب نہ سہی، عام طور پر وہ بھی دستیاب نہیں۔

کشور ناہید: اچھا، "دستنبو" کیا بہت اہم کتاب سمجھی جاسکتی ہے؟

وقار عظیم : "دستنبو" اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑی اہم کتاب ہے۔ کوئی کتاب جو ۱۸۵۷ء کے

انقلاب سے متعلق لکھی جائے اہم ہے ، بلاشبہ ، عام برِ عظیم کے رہنے والوں کے لیے اور مُسلمانوں کے لیے خصوصاً ۔ اس میں نقطۂ نظر کوئی بھی اختیار کیا گیا ہو ۔ کیوں کہ وہ انقلاب مُسلمانوں کی تہذیبی ، معاشی ، معاشرتی ، اخلاقی زندگی کا ایک ایسا انقلاب تھا کہ اس کے بعد مُسلمانوں کو نئے سرے سے اپنی زندگی مرتب کرنی پڑی ـــــ جو کچھ بھی لکھے کوئی ، اس کے متعلق ، وہ اہم ہے ـــــ لیکن ایسا شخص جو کہ دلّی میں بیٹھا ہے اور دلّی میں بیٹھ کر سال ، سوا سال کی رُوداد لکھتا ہے ، اور وہ شخص ہے غالب ، تو ظاہر ہے وہ کتاب اہم ہو گی ، خواہ نقطۂ نظر اس میں کوئی بھی اختیار کیا گیا ہو ۔

کشور ناہید : ایک بات اور ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن صاحب نے کہی ہے کہ وہ بند ہو کے ، گھر میں بیٹھ کے کتاب لکھ رہے ہیں[1] ـــــ تو کیا صورتِ حال کی نشاندہی گھر میں بیٹھ کے ـــــ اور جس طرح وہ کہتے ہیں کہ گھر سے باہر نکلنا ممکن نہیں ۔ کیا عینی شواہد جو موجود ہیں ، کیا دُرست ہوں گے ؟

وقار عظیم : دیکھیے ناں ، سو فیصد یہ کہنا کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے وہ اُن کا مشاہدہ ہے ، یہ تو ظاہر ہے کہ نہیں ہے ۔ اُس زمانے میں ، وہ سال سوا سال کی مدّت جس میں اُنہوں نے لکھا ہے ، یہ نہیں تھا کہ لوگ آپس میں ملتے جُلتے نہ ہوں اور بالکل شہر میں نکلتے ہی نہ ہوں ۔ خود غالب نے ، اُن کی جو ذہنی کیفیت تھی ، اُس کی وجہ سے اور کچھ دیگر اسباب و حالات ، گوشۂ تنہائی اختیار کیا ، لیکن غالب مُرجعِ خلائق تھے ، غالب کے پاس تو ہر طرح کے آدمی آتے تھے ۔ یہ ہر طرح کے آدمی آ کر اپنی رُوداد بیان کرتے تھے ، شہر میں جو کچھ ہوتا تھا ، بیٹھ کر اُسے سنتے تھے ۔ آس پاس جو ہُوا اُن کے گھر کے ، وہ بہر حال غالب کے مشاہدے کی حیثیت رکھتا ہے ـــــ اسے اُنہوں نے فارسی میں لکھا اور یہ کتاب ایک ایسی فارسی میں چھپی ، جسے عام آدمی نہیں سمجھ سکتا ۔

کشور ناہید : کیا وہ جواز دُرست ہے ، اُس فارسی کا جو ڈاکٹر مُعین الرحمٰن صاحب نے بھی

---

[1] یہ بات مَیں نے کہیں نہیں کہی کہ غالب نے یہ کتاب "بند ہو کے ، گھر میں بیٹھ کے" لکھی ہے بلکہ میرا نقطۂ نظر تو اس کے بالکل برعکس ہے دیکھیے : کتاب ہٰذا ، صفحہ ۲۵ (حاشیہ)

(ـــ ڈاکٹر سیّد مُعین الرحمٰن)

دیا اور باقی ناقدین بھی دیتے رہے[۱] کہ اس لیے اس مشکل پسند فارسی میں لکھی گئی کہ عام لوگوں کی دسترس سے باہر رہے اور وہ چیز، کہ چھپانا چاہتے تھے عام مسلمانوں سے، وہ چھپی رہے؟

وقار عظیم: اصل میں دو باتیں تھیں: ایک تو غالب کی جو اَنا تھی، غالب کو اپنی فارسی دانی پر، اور فارسی میں ایک خاص درجے کی مہارت رکھنے پر جو فخر تھا، اس کا اظہار وہ زندگی بھر کرتے رہے۔

کشور ناہید: شعر میں بھی کیا ہے۔

وقار عظیم: جی ہاں —— یوں تو کسی کو نہیں بخشا ہے جس نے اس حیثیت کو تسلیم نہیں کیا اور یا اس میں تھوڑا سا بھی فرق رکھا —— ایک ایسے اسلوب کا اختیار کرنا جو اُس زمانے میں رائج نہیں ہے، وہ اس لیے بھی ہے کہ مُصنّف اپنا اور اپنی قُدرتِ بیان کا اظہار کرنا چاہتا ہے —— لیکن یہ بات غالباً زیادہ دُرست ہے کہ انہیں معلوم ہے کہ جو سوادِ اعظم ہے آبادی کا وہ، وہ نقطۂ نظر نہیں رکھتا، انقلاب کے متعلق جو اُن کا ہے اور اس لیے اگر صاف اور سیدھی زبان میں کتاب لکھی تو بہت سے لوگ مجھے مطعون کریں گے —— کتاب لکھنے کا اصل مقصد، اُن کی مالی پریشانیاں تھیں۔ ان پریشانیوں کو دور کرنے کی جو مختلف تدبیریں کیں، اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ان پر —— قصّہ اصل میں یہ ہے کہ بہادر شاہ سے اُن کا اتنا قریبی تعلق تھا کہ اس دار و گیر میں بے قصور بھی پکڑے گئے اور جس کا بہادر شاہ سے اور قلعۂ مُعلّیٰ سے تعلق ہے، اُس کا پکڑا جانا تو اغلب ہے۔

کشور ناہید: لیکن ڈاکٹر مُعین الرحمٰن صاحب ہمیں تو اختلاف کرتے ہیں کیوں ڈاکٹر صاحب آپ فرماتے ہیں کہ چاہے صدر الدین ہوں، چاہے کوئی ہو، وہ معافی مانگ لے تو ان کے لیے وہ بے جا نہیں، لیکن غالب جس کی انا کا آپ تذکرہ کر رہے ہیں، اگر وہ اسی درجے پر آ کے اپنے لیے وہ خانے ڈھونڈے کہ جہاں پہ پناہ ہو، تو وہ ان کو گراں گزرتا ہے[۲]

---

[۱] کن دوسرے ناقدین نے یہ "جواز" کبھی پیش کیا یا عام طور پر "دیتے رہے"؟ (ڈاکٹر سید مُعین الرحمٰن)

[۲] میرا کہنا یہ ہے کہ اُس زمانے کے بے دریغ اور بہیمانہ قتلِ عام کو ذہن میں رکھیں تو انگریزوں سے غالب کو سوچی سمجھی وفاداری کے اظہار کی نوعیت کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا —— غالب نے ظفر اور

(باقی صفحہ ۲۴۷ پر)

وقارعظیم: پناہ کا سوال اس میں نہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ صرف معاشی مسئلہ ہے۔ معاش کا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا اُس زمانے میں سوائے اس کے کہ سرکار دربار سے تعلق ایک قائم کیا جائے۔ ایک دفعہ وہ قید کی صعوبتیں بُھگت چکے تھے چند مہینے، اور اب اسے بھگتنے کو تیار نہیں۔ موت کا ہر وقت خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں لیکن قید میں رہنا، اُن کی عزّتِ نفس کو گوارا نہیں۔

کشور ناہید: وقار صاحب، اس سے پہلے کہ معاشرتی زندگی کی طرف غالب کی جائیں، ڈاکٹر معین صاحب سے یہ پوچھوں گی کہ یہ جو ترجمہ آپ نے اس میں "دستنبو" کا شامل کیا ہے تو کیا اس کی لفظی صحت مندی کو دیکھ کر آپ نے اس کا اعتبار کر کے اسے شاملِ کتاب کیا ہے؟

مُعین الرحمٰن: اصل میں صورت یہ ہے کہ یہ کتاب صرف "دستنبو" کے ترجمے ہی پر مبنی نہیں جبکہ آپ کی گفتگو سے اس غلط فہمی کے راہ پا جانے کا امکان ہے ـــــ حقیقتاً اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ ترجمہ، کتاب کا ایک جُزو ہے ـــــ کتاب کا پہلا حصّہ "دستنبو" کے تفصیلی تعارف پر مشتمل ہے کہ اس سے پہلے یک جا، کہیں اور کبھی اتنی باتیں اس کے بارے میں سامنے نہیں آئیں۔ اس میں جو مباحث آتے کہ اس کی زبان جناتی ہے ـــــ یا یہ کہ خاص طور پر اُنھوں نے اسے ایک ایسی زبان میں لکھا جس میں عربی کا لفظ نہ آنے پائے ایک بھی ـــــ اور ایسی مثال موجود ہے کہ کتاب کی طباعت کے دوران میں انہیں احساس اور اندازہ ہو گیا کہ عربی کا ایک لفظ اُن کے قلم سے نکل گیا ہے تو اُنھوں نے آٹھ دس خط لکھے کہ اس لفظ کو نکال دو، مسودے میں بھی درست کر دو، اسے چھیل دو اور وہاں بھی باقی نہ رہنے دو ـــــ ورنہ میرے کمال پر دھبہ لگ جائے گا اور کتاب نکمی ہو جائے گی۔ وہ حصّہ چھپ چکا تھا تو اُنھوں نے تہیدستی کے باوجود ہدایت کی کہ چھپے ہوئے سب کاغذ ضائع کر دو، کاغذ کا جو نقصان ہوگا، وہ مَیں بھر دوں گا ـــــ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بارہ خاص بہت حسّاس تھے اور اس پس منظر میں کہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۶ سے)

دربار سے اپنی بریئت اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے اور انگریزی پنشن کے لیے اپنا استحقاق جتانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہر عام آدمی، ان حالات میں یہی کرتا، غالب سے ہمیں روشِ خاص کی توقع تھی۔ وہ پوری نہیں ہوئی اور حالات اُن کے لیے ناساز گار ہوتے تو اُنھوں نے اپنے بہت سے دوسرے احباب کی طرح ذاتی مدافعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دی اور اسی موقع پر کسی تفرد کا ثبوت نہیں دیا۔ (ـــــ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن)

جو عام فہم نہیں، غیر مُروّج اور نامانوس فارسی میں ہے، ایک ایسی زبان میں جس کے بارے میں
خود غالب کا احساس تھا کہ ہندوستان کا تو کیا مذکور ایران میں بھی اس کا سمجھنے والا کوئی نہ ہوگا
یہ بالکل لاجیکل معلوم ہوا کہ کتاب میں "دستنبو" کا اُردو ترجمہ شامل کر لیا جائے ـــ میں پھر
کہوں گا کہ "دستنبو" غیر مُروّج نامتعارفہ فارسی میں ہے، اس کتاب کا غالب کی زندگی میں
ترجمہ نہیں ہُوا، بعد میں بھی پچاس سال تک کوئی ترجمہ نہ ہُوا ـــ

کشور ناہید: پتا پانی ہوتا ہے!

مُعین الرحمٰن: جی ہاں ـــ کتاب کے لکھے جانے کے بعد ساٹھ پینسٹھ برس تک کسی نے اس
کتاب کے ترجمے کی طرف توجہ نہیں دی۔ پہلا ترجمہ ۱۹۲۰ء کے بعد مرزا محمد یعقوب بیگ نجمی
صاحب نے کیا، لیکن یہ صرف چند اجزا کا ترجمہ ہے، دس بارہ صفحات ہیں۔ خواجہ حسن نظامی
نے اسے شائع کیا اور بہت تعریف کی اور لکھا کہ دو دن کے اندر مرزا صاحب نے کتاب
کا ترجمہ کر ڈالا، جیسا مزاج ہے، اس کتاب کا، کیسا بھی عالم اور صاحبِ نظر ہو، اس کام کے
لیے دو دن کافی نہیں ہیں ـــ اس ترجمے کے کوئی چالیس برس بعد ۱۹۶۱ء میں دو نئے
ترجمے آگے پیچھے سامنے آئے، دہلی سے ـــ ایک مخمور سعیدی صاحب کا جو رسالہ "تحریک"
میں چھپا، دوسرا شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کے علمی مجلّے "اُردوئے معلّیٰ" کے غالب نمبر
میں ـــ مؤخر الذکر پر کسی مُترجم کا نام درج نہیں، یہ کسی ایک کا ہے یا مُترجمین زیادہ
ہیں، کسی ٹیم کا ہے ترجمہ، یہ معلوم نہیں، لیکن اس رسالے کی مجلسِ ادارت میں ڈاکٹر
خواجہ احمد فاروقی، جناب رشید حسن خاں، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر قمر رئیس وغیرہ
ایسے اسما ہیں جو بہت اعتباری ہیں اور اس ترجمے پر بھروسا نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں
اور بلا وجہ کسی نئے متن کو تعمیر کرنے اور نئے ترجمے کو مُرتب کرنے کی ضرورت نہیں تھی
ـــ پھر اس ترجمے کا میں نے اصل سے تقابل بھی کیا ہے ـــ اس لیے کتاب کے
دوسرے حصّے کے طور پر میں نے اسے شامل کیا۔ اس ترجمے پر جہاں جہاں حواشی کی ضرورت
تھی، یہ خدمت میں نے انجام دی، حواشی وغیرہ اس میں ہیں ـــ یہ کتاب کا دوسرا
حصّہ ہے۔

کشور ناہید: دوسرا حصّہ تو شعری روّیے کا ہے۔

مُعین الرحمٰن: جی نہیں، پہلا حصّہ تعارف ہے "دستنبو" کا، یہ مُقدمہ کتاب سمت ....

صفحات ہیں۔ دوسرا حصہ " دستنبو " کا اُردو ترجمہ ہے یہ چالیس ۴۰ صفحات ہیں۔
کشور ناہید: تیسرا حصہ شعری ردیف سے متعلق ......

مُعین الرحمٰن: جی نہیں ..... تیسرا حصہ ۱۸۵۷ء سے متعلق غالب کے خطوط پر مبنی ہے، اور اسی کی " دستنبو " کے اُردو ترجمے، یعنی کتاب کے دوسرے حصے کے بعد منطقی ضرورت تھی ۔ کیوں کہ " دستنبو " میں جو کچھ غالب نے کہا، وہ بعض مصلحتوں، اُن کی بعض ضرورتوں کے زیر اثر ہے جس سے مجبور ہو کر اُنھوں نے اس طرح کی باتیں .....

کشور ناہید: جس کی طرف وقار صاحب نے اشارہ کیا، معاشی ......

مُعین الرحمٰن: جی ہاں معاشی مشکلیں ـــــ واقعی، ایک ایسا شخص جس کا بہادر شاہ ظفر کے دربار سے تعلق ہو اور دربار سے بھی کیسا تعلق کہ غالب نے خود لکھا ہے دربار میں تین بڑے عہدے یا منصب تھے، غالب کی توقیر ان تین سے کسی طرح کم نہیں تھی، تو ایسے شخص کا، اس نے عملاً انقلاب میں کچھ حصہ لیا ہو یا نہ لیا ہو، پکڑا جانا بالکل بدیہی بات تھی ـــــ ذرا ذرا سے شبے میں لوگ پکڑے گئے تو غالب کا پکڑا جانا تو یقینی سا تھا، اس مشکل میں اُنھوں نے یہ صورت اختیار کی۔

کشور ناہید: لیکن غالب کا یہ پکڑا جانا بھی بالکل یقینی تھا کہ وہ جو خط لکھ رہے تھے تو وہ چھپنے لازمی تھے، کیوں کہ اُن کی تو ہر سطر چھپتی تھی، کسی نہ کسی نے محفوظ کرنی تھی لیکن آپ نے ایک جگہ یہ کہا ہے کہ خطوط جو لکھے ہیں، اُس میں اُنھوں نے کھُل کر طبیعت کا بیان کیا ہے، شاید اِس لحاظ سے کیا ہے کہ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ یہ خط چھپ جائیں گے۔

مُعین الرحمٰن: یہ ایک عام غلط فہمی ہے۔ جنھوں نے زمانی ترتیب سے غالب کی نثر یا نظم کا مُطالعہ نہیں کیا، یہ اُلجھن ہوتی ہے اُنھیں ـــــ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی، اُس زمانے میں غالب کے خطوں کے چھپنے کا کوئی تصور نہیں تھا ـــــ اب تو ہمارے مُطالعۂ ادب کا یہ اتنا لازمی حصہ ہیں کہ عام قارئین کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ کسی وقت چھپے رہے ہوں گے۔ غالب کے جو اُردو خط ہیں، وہ " دستنبو " کے بعد کے ہیں اور " دستنبو " ـــــ بلکہ اس کتاب میں کہا بھی ہے میں نے کہ میں تو ان خطوں کو " دستنبو " کا ایک حصہ، ایک سلسلہ، بلکہ اس کی برکت مانتا ہوں کہ اگر وہ " دستنبو "

نہ لکھ رہے ہوتے اور خاص حالات میں اس کی طباعت عمل میں نہ آئی ہوتی تو خطوط[1]...

کشور ناہید: ان خطوں کو، اسے آپ ری ایکشن بھی کہہ سکتے ہیں۔

مُعین الرحمٰن: جی نہیں، کبھی نہیں کہوں گا۔

وقار عظیم: دراصل ری ایکشن ایک اور بات ہے .....

کشور ناہید: ڈاکٹر صاحب، ایک سوال، گستاخی ہو گی، وہ یہ کہ آپ نے تقابل کیا ہے، اُن کی نثر کا دونوں انداز میں "دستنبو" کے حوالے سے اور خطوں کے حوالے سے "دستنبو" کے حوالے سے آپ بتانا چاہتے ہیں کہ انگریزوں کے ایما پر .....

وقار عظیم: ایما پر تو نہیں۔

کشور ناہید: تقریباً ایسے حالات تھے اور وہ چیزیں "رستخیزِ بے جا" کے انداز میں لکھی گئیں تھیں، اور دوسری طرف وہ دلّی کے آشوب اور مسلمانوں کی ابتلا کا حال بیان کرتے ہیں خطوں میں ــــ گویا ذہن اُن کا دو حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک طرف وہ نثر لکھنی اور دوسری طرف یہ تذکرۂ دلّی اور آشوب کا بیان کرنا ــــ تو آپ غالب کو بتانا گیا چاہتے ہیں: بطور دانشور، بطور اُس زمانے کے ایک بہت بڑے دانشور، اور اُس شاعر کے کہ جو وقت کی آواز کو پہچانتا تھا؟

مُعین الرحمٰن: میرے سامنے تو اُمورِ واقعہ کی صداقتوں کا تعین کر دینا تھا۔ غالب ہمارے بڑے شاعر ہیں اور آئیڈیل بھی، لیکن ایک وقت گڑا جب آتا ہے تو وہ اُس آزمائش سے کس طرح گزرتا ہے ــــ؟ یہ کہنا صحیح نہیں، جیسا آپ نے کہا کہ "دستنبو" انگریزوں کے ایما پر لکھی گئی ــــ میرا کہنا تو یہ ہے کہ "دستنبو" انگریزوں کی تائید اور سرپرستی حاصل کرنے کے لیے لکھی گئی۔ مشکل یہ تھی کہ معاش کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ سب مسدود تھے .....

کشور ناہید: کتاب لکھ رہا ہوں کہ خلعت اور پنشن دوبارہ جاری ہو جاتے اور وہ دوبارہ جاری بھی ہو گئے ــــ

مُعین الرحمٰن: میرا تو احساس ہے کہ اِس میں کتاب کا دخل تھا ــــ غالب کا ایک

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: "غالب اور انقلابِ ستاون" صفحہ ۷، ۵۸، ۵۸

اجتماعی یا سماجی رویّہ ہے۔ معاشرے میں ایک بڑا شخص تھا، معاشرہ اسے نہیں پہچانتا، قدر نہیں کرتا جیسی وہ چاہتا ہے —— اُس کی معاش کی کچھ مجبوریاں ہیں، اس نوبت کو پہنچ گیا کہ وہ اپنی بچت کے لیے جسم وجان کی سلامتی کے لیے، جو سانس ہیں، انہیں باقی رکھنے کے لیے ایک ایسے امر پر مجبور ہُوا، ایسی رائے کے اظہار پر جو مجموعی طور پر شاید اُس کی حقیقی رائے نہیں تھی، یہ ہے "دستنبو" —— نجی خطوں میں انقلاب کے بارے میں وہ جس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں، وہ ایک بالکل مختلف صورت ہے "دستنبو" سے —— ان خطوں میں بہت حزن اور دُکھ کے ساتھ بڑی دردمندی کے ساتھ اظہارِ خیال ہُوا ہے —— غالب کا سوزِ درون، اُن کے خطوں میں چھلکا پڑتا ہے۔

کشور ناہید: تو کیا وقار بھائی، یہ ہمارے معاشرے کا اور معاشرت کا ایک دلسوز رویّہ نہیں ہے کہ ہر زمانے میں شاعروں، دانشوروں، ادیبوں کو اپنے معاشرت اور معیشت کو پورا کرنے کے لیے اِس قسم کے رویّے اختیار کرنے پڑتے رہے ہیں۔ یہ میرؔ کے زمانے سے لے کر اور آج تک زندگی گزارنے کے جتن کرنے کو، شاعروں اور ادیبوں کو یہ پاپڑ بیلنے ہی پڑتے ہیں[1]

وقار عظیم: اصل میں ہماری اردو شاعری کی جو تاریخ ہے، جو لوگ دربار سے وابستہ رہے، وہ خوش رہے۔

کشور ناہید: دربار اُس وقت تھا، اب دربار کے کُلیے اور پیمانے بدل گئے۔

وقار عظیم: ظاہر ہے، اصل مسئلہ اگر آپ دیکھیے، تو یہی کہ ہر آدمی ذراسی آسائش کی زندگی گزارنا چاہتا ہے .....

O

کشور ناہید: اچھا شعری رویوں کے بارے میں غالب کے جب ڈاکٹر مُعین الرحمٰن گفتگو کرتے ہیں تو .....

مُعین الرحمٰن: جو کچھ سرمایہ شعری موجود اور محفوظ ہے، اُس کی بنیاد پر ہم کچھ نتائج نکالتے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، اور اس کتاب میں وضاحت سے اس کا اظہار بھی کیا ہے کہ شاعر غالب ۱۸۵۷ء میں ہم سے رُخصت ہوگیا، جبکہ نثر نگار غالب کا ظہور، اِس انقلاب کے بعد ہُوا، غالب کی کم وبیش ساری اُردو نثر اس انقلاب کے بعد کی ہے —— اس میں دوستوں اور بزرگوں کو اختلاف بھی ممکن ہے، ہو، لیکن میرے نزدیک بات یہی ہے کہ شاعر غالب ختم ......

---

[1] "بیلنے ہی پڑتے ہیں" والی بات کُل شاعروں اور ادیبوں پر نہیں صادق آتی۔ ایسے بھی ہیں اور ہوتے ہیں کہ جھکے نہ بکے (مُعین الرحمٰن)

کشور ناہید: ابھی وقار بھائی سے پوچھ لیتے ہیں۔

وقار عظیم: بات یہ ہے —— بلکہ میں چاہتا بھی تھا کہ اس پر مُعین صاحب سے تھوڑی سی بات کروں —— کہ اس بیان کی صداقت، بڑی حد تک تو دُرست ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے شعر اور غالب کو ایک دوسرے سے دور کر لیا، لیکن یہ بات تو حقیقت میں "غدر" سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی —— (غدر، میں اپنے جذبے کا اظہار نہیں کر رہا ہوں، عام لفظ ہے انقلاب کے لیے)، جب کلکتے میں اُن کی تھوڑی سی رُسوائی ہوئی، اُن کی فارسی دانی پر اعتراض ہوتے اور گئے تھے اپنے مُقدمے کے سلسلے میں (اُس کا فیصلہ اُن کے حق میں نہیں ہُوا) اس کے بعد کے، فوراً بعد کے جو بعض خط ہیں، اُس میں ایک خط میں خاص طور پر غالب نے لکھا ہے "اب قافیہ سخن سنجی تنگ است" تو اسی وقت سے غالب، میری رائے ہے کہ شعر کی طرف مائل نہیں تھے اور اس کے بعد سے ہیچ جانتے ہیں، جب کوئی اُن سے شعر گوئی کا تقاضا کرتا ہے، قیصدے کے لیے کہتا ہے ......

کشور نا: علائی کے نام خط ہے، مُعین صاحب نے اسے دیا ہے، مَیں نے نشان لگایا تھا صفحہ ۱۹۲:

"اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کُفر کو، گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح، ہزل و ہجو میرا آئین نہیں، پھر کہو کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف جوانب سے اشعار آ جاتے ہیں، اصلاح پا جاتے ہیں۔ یاد رکھنا اور مطابق واقعہ جاننا ——"

وقار عظیم: دو تین خط کے ٹکڑے ہیں میرے سامنے بھی: ۱۸۳۶ء، ۱۸۴۰ء، ۱۸۴۲ء اور ۱۸۴۴ء کے۔ ان میں اپنے بارے میں غالب نے یہ لفظ استعمال کیے ہیں ایک تو یہی کہ:

قافیہ سخن سنجی تنگ است، پھر: جاں گدازی، آشفتگی، تنگ دلی، افسردہ دلی، غمزدہ اور بُجھے ہُوتے اور ٹوٹے ہُوتے دل ......

شعر گوئی سے اُن کا تعلق حقیقت میں ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا —— اور واقعات بھی ایسے ہیں، کلکتہ کا واقعہ، قید کا واقعہ، سوائے شیفتہ کے کسی نے ساتھ نہیں دیا —— وہ سوچ رہے تھے کہ یہاں ہندوستان ہی میں نہ رہوں، کہیں بھی نکل جاؤں

——— اس پس منظر میں مُعین صاحب اپنے موقف میں ذراسی ترمیم کرلیں اور اگر اس طرح کہا جاتے کہ یہ بات پہلے ہی شروع ہو چکی تھی، لیکن ۱۸۵۷ء کی غارت گری نے ......

معین الرحمٰن : اگر یہ مان لیں کہ کلکتے کے ہنگامے (۱۸۲۸ء) اور اس کے بعد قید کے واقعے (۱۸۴۱ء) اور بار دیگر قید کے سانحے (۱۸۴۷ء) نے شاعر غالب کو ختم کر دیا تو پھر ہمارا مسئلہ تو یہ رہ جاتا ہے کہ شاعر غالب ختم ہو چکا تھا کہ ہم اُس سے دو چار ہوتے ——— اس لیے کہ :

غالب کا اُردو دیوان پہلی بار ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا، دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں چھپا، اس میں ایک ہزار ایک سو گیارہ (۱۱۱۱) شعر ہیں، دیوان کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا، اور اس میں طبع دوم کے مقابلے میں ۶۸۵ شعر زیادہ ہیں، یعنی شعروں کی کل تعداد ۱۷۹۶ ہو گئی۔ "ارمغان غالب" میں اکرام صاحب نے ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کے اشعار کی تعداد ۴۱۶ بتائی ہے۔ جبکہ "غالب نامہ" میں اکرام صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کے چودہ برس میں غالب نے ایک قطعہ اور ایک غزل فقط دو نظمیں اُردو میں لکھیں ——— خود غالب نے انتقال سے کوئی اڑھائی برس پہلے ۱۰ ستمبر ۱۸۶۶ء کو نواب کلب علی خاں کو لکھا ہے کہ :

" بعد غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہو گیا۔ دو تین غزلیں فارسی اُردو کی لکھی ہیں ——— "

اس لیے شاعر غالب میرے نزدیک حقیقتاً انقلاب ۱۸۵۷ء ہی کی نذر ہوا ———

وقار عظیم : وہی جوہر پر وگرام میں ہوتا ہے کہ وقت ہمیں پریشان کرے گا ——— مُعین صاحب کی یہ تفصیلات بہت دلچسپ ہیں ——— مُعین صاحب کتاب کے اگلے ایڈیشن میں دو ایک باتیں ضرور کریں، جس کاوش سے اُنھوں نے کام لیا ہے، جس وقتِ نظر سے اُنھوں نے یہ کام انجام دیا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ، کتاب کا ایک اشاریہ ہونا ضروری ہے، وہ آئندہ یہ کام ضرور کریں۔ فارسی متن اور ترجمے کو غور سے پھر ملالیں اور غالب کا جو غیر مطبوعہ کلام ہے ۱۸۵۷ء کے بعد کا اُسے بھی آخر کتاب میں جمع کر دیں تو کتاب اور

بھی زیادہ مُفید ہو جائے گی [1]

کشور ناہید: ظاہر ہے ایک تو انقلاب ستاون کی باتیں اور غالب کے حوالے سے اور وہ بھی آپ ایسے غالب شناسوں کے ساتھ، اس کی کوئی حد نہیں، جہاں بات چھٹی ہے، وہیں ختم کرتے ہیں ——"

پاکستان ٹیلی وژن، لاہور، کراچی، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ

—— جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۷۵ء

○

ڈاکٹر انور۔ ایم۔ برکت:

اجازت دیجیے کہ داؤد ادبی انعام ملنے پر آپ کو مبارک باد دوں جو آپ کی قابلِ قدر کتاب " غالب اور انقلاب ستاون " پر حال ہی میں دیا گیا ہے۔ آپ ہر طرح اس انعام اور اعزاز کے مستحق تھے۔ اس غیر معمولی عزت اور مسرت میں جو آپ کو حاصل ہوئی ہے یہاں ہم سب کو اپنا شریک جانیے۔ آپ کے عالمانہ انہماک اور انکسار کو دیکھتے ہوئے، مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کا تحقیقی اور علمی سفر جاری رہے گا۔

پرنسپل ایف سی کالج، لاہور

—— ۶۔مئی، ۱۹۷۵ء

○

پروفیسر سیّد کرامت حُسین جعفری:

داؤد ادبی انعام بہ: " غالب اور انقلاب ستاون " پر میری طرف سے دِلی مبارک باد قبول فرمائیں —— اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، آمین۔ کاش! آپ "میرے زمانے" میں طالب ہوتے لیکن " یہ نہ تھی ہماری قسمت ——"

—— لاہور، ۳ مئی ۱۹۷۵ء

---

[1] اشاریۂ کتاب، زیرِ نظر اشاعت میں شامل کر دیا گیا ہے، زرِ امتثالِ امر فارسی متن اور ترجمے پر بھی ایک دوسری نظر ڈال لی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے "غیر مطبوعہ کلام" کی فراہمی، اختیاری نہیں، ۱۸۵۷ء کے بعد سے تا آخر غالب کے کُل موجود اور دستیاب اردو اور فارسی کلام کو بطور ضمیمۂ کتاب کسی اگلی اشاعت میں شامل کر لینے کا قصد ضرور ہے۔ (مُعین الرحمٰن)

انور سدید :

آپ کی موقر تالیفات "غالب اور انقلاب ستاون" اور "ذکرِ عبدالحق" ان دنوں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آپ نے جس وسعتِ نظر اور جاں کاہ محنت سے یہ کتابیں مرتب کی ہیں، اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ان کے ایک ایک صفحے سے آپ کی دیدہ ریزی اور تحقیقی شرف نگاہی عیاں ہے۔

——— سرگودھا ۱۰ اگست ۱۹۷۵ء

اردو ادب میں ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مصنف کو اس کی تصنیفات کے حوالے سے دریافت کرنے کی نئی طرح ڈالی ہے۔ وہ مصنف کی سب تخلیقات کو اکٹھا کرتے ہیں اور پھر ان کی تدوین اس طرح کرتے ہیں کہ مصنف کی پوری زندگی اور شخصیت کا خاکہ مرتب ہو جاتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے غالب کی سوانح اس کے خطوط کی مدد سے ترتیب دی تھی، کچھ یہی انداز سید معین الرحمٰن نے "غالب اور انقلاب ستاون" میں اختیار کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مہر صاحب نے پورا غالب دریافت کرنے کی کوشش کی اور معین صاحب نے اس کتاب کو صرف انقلاب ستاون تک محدود رکھا ہے۔

اردو تنقید میں اب تک انقلاب ستاون کے بارے میں غالب کا تعریضی رویہ پیش کرنے کے لیے جو اشعار پیش ہوتے ہیں، زیرِ نظر کتاب میں، ان میں سے بیشتر کو قبل از انقلاب تخلیقات تصور کیا گیا ہے۔ اور آخر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کی شاعری پر اس انقلاب کے بہت کم اثرات ملتے ہیں انقلاب ستاون کے زیادہ نقوش، غالب کے خطوط میں بکھرے ہوئے ہیں، سو معین الرحمٰن صاحب نے ان سب کو ایک نئی ترتیب دے کر غالب کی ذہنی حالت معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ انقلاب ستاون پر غالب کی تصنیف "دستنبو" کا اردو ترجمہ ہے جو وضاحتی حواشی کے ساتھ شریکِ اشاعت کیا گیا ہے۔ ان سب نے مل کر اس کتاب کی اہمیت اور افادیت میں بہت اچھا اضافہ کیا ہے۔ توقع ہے کہ پاکستان کے غالب شناس اس کتاب کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تحقیقی نظر میں گہرائی ہے اور وہ حقیقت کی دریافت میں ژرف بینی سے کام لیتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں اس کے عمدہ نمونے سید صاحب کے حواشی اور ان کے استنباط میں نظر آتے ہیں، کتاب کی طباعت اجلی ہے۔

(اوراق، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء، ص ۲۷۴-۲۷۵)

محبوب جمال زاہدی :

آپ کی کتاب " غالب اور انقلاب ستاون " پر ۱۹۷۴ء کا داؤد ادبی انعام دیا گیا ہے۔ از راہِ کرم میری انتہائی دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

سیکریٹری جنرل، پاکستان رائٹرز گلڈ ، کراچی

——— ۲۹ - اپریل ۱۹۷۵ء

○

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی :

آپ کی عطا کردہ کتاب " غالب اور انقلاب ستاون " مجھے مل گئی تھی۔ کتاب آئی تو مجھے ایک امتحان کے سلسلے میں حیدرآباد جانا تھا، راستے میں اور وہاں کے قیام میں یہ کتاب پڑھ ڈالی، میں نے ہی نہیں بہت سے احباب نے ! دہلی کی کتابیں تو اب کچھ ایسی ہی ہو گئی ہیں کہ جب آتی ہیں تو تبرک کے طور پر احباب کو بھی ضرور دکھائی جاتی ہیں۔ آپ نے بہت محنت اور سلیقے سے ، بڑا قابلِ ستائش کام کیا ، یقین ہے کہ ادب شناسوں میں کتاب کی پذیرائی ہوگی۔

صدر شعبۂ اردو ، دہلی یونیورسٹی، دہلی

——— ۲۱- جولائی ۱۹۷۵ء

○

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی :

" غالب اور انقلاب ستاون " کا قیمتی تحفہ ملا۔ اس عنایت اور عطیے کے لیے ممنون ہوں۔ آپ نے یہ کام بھی خوب کیا، بقامت کہتر، لیکن بقیمت بہت بہتر اور بھرپور ——— میری دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

شعبۂ اردو ، عثمانیہ یونیورسٹی ، حیدرآباد دکن

——— ۱۵ ستمبر ۱۹۷۵ء

○

اِشاریہ :

INDEX:

۱- اسمار الرجال : صفحہ ۲۵۸
۲- اسمار الکتب : ۲۶۹
۳- اخبارات و رسائل : ۲۷۳
۴- ابیات : ۲۷۵
۵- ادارے : ۲۷۷
۶- اماکن : ۲۷۹
۷- اسمار اللسان : ۲۸۴
۸- کتب انگریزی : ۲۸۵

اَسماءالرّجال:

آرام، شیو نرائن: ۱۵، ۱۹، ۲۴، ۲۶، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۹، ۵۰، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۹، ۷۲، ۸۷، ۸۸، ۱۱۹، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۸، ۱۶۹، ۱۹۲، ۱۹۴، ۲۰۷۔

آزاد، ابوالکلام: ۱۴، ۸۷، ۱۳۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۷۸، ۱۷۹، ۲۳۰۔

آزاد، غلام قادر: ۲۱۹، ۲۴۱۔

آزردہ، صدرالدین: ۱۷۹، ۱۹۲، ۱۹۸، ۲۴۶۔

آغا باقر: ۱۴۹۔

آغا سلطان: ۱۹۱۔

ابوبکر (شہزادہ): ۱۶۰۔

ابوسلمان شاہجہانپوری: ۱۷۷۔

اجرٹن، (مجسٹریٹ دہلی): ۱۳۳، ۱۴۷۔

اجنٹ (قلعہ دار دہلی): ۸۲۔

احسن اللہ خاں، حکیم: ۸۶، ۸۸، ۱۲۸، ۱۵۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۹۔

احسن، عبدالشکور، ڈاکٹر: ۵۲، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۴۱۔

احسن علی خاں، صاحبزادہ: ۱۸۵۔

احمد حسن، سید: ۱۹۳۔

احمد حسین، منشی، میر: ۱۲۸۔

احمد علی خاں: ۱۰۴، ۱۹۷۔

احمد میرزا: ۱۹۰۔

ارتضیٰ خاں: ۱۵۰، ۱۹۰۔

ارسطو: ۲۱۶۔

اسداللہ الغالبؒ: ۱۳۳۔

اسداللہ خاں، نواب، دیکھیے: غالب۔

اسفندیار: ۸۷۔

اظہار حسین خاں، منشی، مولوی: ۱۳۰، ۱۳۷، ۱۳۸۔

اظہر علی، ڈاکٹر: ۱۶۳۔

اعظم الدولہ: ۱۹۰۔

افلاطون: ۲۱۶۔

اقبال: ۲۰۔

اکبر اعظم: ۱۶۴۔

اکبر شاہ (بادشاہ): ۱۲۸، ۱۷۸۔

اکبر میرزا: ۱۵۵، ۱۵۹۔

اکرام، ڈاکٹر ایس-ایم: ۲۰، ۲۱۷، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۲۰، ۲۲۸، ۲۳۸، ۲۵۳۔

الفنسٹن، لارڈ: ۹۲۔

ایلن برا، لارڈ : ۳۳، ۹۷ -
الٰہی بخش، میرزا : ۱۳۹، ۱۴۰ -
امجد، ریاض الدین : ۱۷۶، ۲۰۲ -
اُمراؤ بیگم : ۹۶، ۱۱۳ -
امید سنگھ، رائے بہادر، مشیر الدولہ، منشی : ۱۶، ۲۰،
۳۱، ۳۲، ۳۵ -
امیر علی، امیر : ۵۱ -
امین الدین احمد خاں : ۱۰۳، ۱۵۹، ۱۶۷ -
انور برکت، ڈاکٹر : ۲۱۹، ۲۵۴ -
انور سدید : ۲۱۹، ۲۵۵ -
ایاز : ۱۲۲ -
ایڈمنسٹن، جارج فریڈرک : ۳۴، ۳۹، ۱۱۸،
۱۹۲ -
ایلن برون، لارڈ : ۵۵، ۱۹۴ -
بابائے اردو، دیکھیے : عبدالحق، ڈاکٹر، مولوی -
بابر : ۱۶۴ -
بادشاہِ اودھ : ۱۶۴، ۱۶۵ -
بادشاہ لکھنؤ : ۱۶۴ -
باقر علی خاں : ۹۶ -
بالمکند : ۱۱۲ -
بجنوری، ڈاکٹر عبدالرحمٰن : ۲۰، ۲۲۰ -
بڈھے صاحب، دیکھیے : غلام محی الدین -
برجیس قدر : ۲۱۰ -
برکاتی، مسعود احمد : ۲۱۹، ۲۲۹ -
برنس : ۲۹ -
برون، کرنل : ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۴۵ -
بستی بیگم، نواب دلھن : ۹۶ -
بلاقی بیگم : ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۶۰ -
بندہ علی خاں، میر : ۱۲۳ -
بنسی دھر : ۳۵ -
بنیادی بیگم : ۹۶ -
بہادر جنگ : ۱۱۰، ۱۶۷ -
بہادر شاہ ثانی : ۱۷۰ -
بہادر شاہ، سراج الدین، دیکھیے : ظفر -
بہولو شاہ : ۱۳۲
بے خبر : ۱۵، ۳۸، ۴۱، ۵۴، ۵۵، ۱۲۲،
۱۲۶، ۱۳۰، ۱۳۱ -
بیگم حامد علی خاں : ۱۶۴
پھُندن لال، منشی : ۲۴، ۷۲ -
پھول سنگھ، منشی : ۱۳۷ -
پیشوا : ۲۰۸ -
تاج محل (بیگم ظفر) : ۱۶۹ -
تبسم کاشمیری، ڈاکٹر : ۲۱۹، ۲۴۲ -
تفتہ، منشی ہر گوپال : ۱۱، ۱۳، ۱۶، ۱۷، ۲۳،
۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰،
۳۱، ۳۲، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸،
۴۲، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹،
۵۰، ۵۱، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۰،
۷۲، ۷۳، ۷۴، ۸۸، ۹۰، ۹۳، ۱۱۲،
۱۱۴، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸،
۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۴،
۱۴۶، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۶۹، ۱۷۰،

۱۹۲، ۱۹۵ ـ

تفضّل حسین خاں : ۸۹، ۱۴۹، ۱۶۸ ـ

تلارام : ۱۰۱ ـ

تمنّا مرزاپوری : ۱۹۱ ـ

تیمور : ۱۲۴ ـ

ٹامسن، گابرے : ۶۴ ـ

ٹامسن، مشکاف : ۱۶۱ ـ

ثاقب : ۱۲۰، ۱۶۷، ۱۹۰، ۲۰۱ ـ

جان جاکوب، میجر : ۱۶۱ ـ

جاں نثار خاں : ۱۵۰، ۱۵۱ ـ

جاوید اقبال، ڈاکٹر جسٹس : ۱۸۹ ـ

مہر جمال کی بی بی : ۱۵۲ ـ

جعفری، سید کرامت حسین : ۲۱۹، ۲۵۴ ـ

جمشید : ۷۹، ۹۰، ۱۱۴، ۱۱۵ ـ

جمیل الدین بید : ۵۱ ـ

جمیل جالبی، ڈاکٹر : ۲۱۹، ۲۳۸ ـ

جنوں بریلوی : ۱۲۷، ۱۴۴، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۵ ـ

جواں بخت مرزا : ۱۶۹، ۱۷۰ ـ

جہانگیر : ۱۶۸ ـ

جیاجی راؤ : ۱۱۱ ـ

جیون لال، منشی : ۱۳۲ ـ

چارلس بال : ۶۶، ۲۰۹، ۲۱۲، ۲۱۳ ـ

چارلس سانڈرس : ۱۰۸ ـ

چغتائی، عبدالرحمٰن : ۸، ۱۹، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۴ ـ

چیف سکرٹری : ۳۸، ۶۱، ۷۰، ۱۱۸، ۱۳۰،

۱۳۹، ۱۴۰ ـ

چیف کمشنر : ۳۴، ۳۸ ـ

حافظ ممّوں، دیکھیے : محمد بخش، حافظ ـ

حالی، الطاف حسین، خواجہ : ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۹ ـ

حامد اللہ ندوی : ۱۷۵ ـ

حامد علی خاں (مولانا) : ۲۱۹، ۲۲۱ ـ

حامد علی خاں، نواب : ۱۵۲، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۸ ـ

حسن علی خاں : ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۵۲، ۱۹۱، ۱۹۸، ۱۹۹ ـ

حسن نظامی، خواجہ : ۱۹۱، ۲۳۰ ـ

حُسین علی خاں : ۹۶ ـ

حُسین مرزا : ۸۸، ۱۰۵، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۸۱، ۱۹۱ ـ

حضرت محل، بیگم : ۳، ۱۹، ۲۰۸، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۲۶، ۲۳۷، ۲۳۸ ـ

حقیر، منشی نبی بخش : ۱۶، ۲۴، ۳۲، ۳۳، ۴۲، ۴۷، ۴۸، ۵۱، ۵۶، ۵۷ ـ

حقی، شان الحق : ۲۱۹، ۲۳۳ ـ

حکیم کالے، عبدالحکیم خاں : ۱۰۶ ـ

حمید احمد خاں، پروفیسر : ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۱۸۱، ۲۲۰، ۲۴۲ ـ

خان بہادر خاں : ۸۹ ـ

خان چند : ۱۵۰، ۱۵۱ ـ

خانِ دوراں خاں : ۱۶۰ ـ

خسرو : ۱۱۵ ـ

خواجہ قاسم : ۱۹۵ -
خورشید الاسلام، ڈاکٹر : ۹ -
دارا : ۷۹ -
داؤد : ۲، ۹، ۷۱، ۲۳۲، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۴۴، ۲۵۰، ۲۵۱ -
دور آفریدی : ۱۸۶ ، ۱۸۸ -
ڈپٹی کمشنر، دہلی : ۳۲ ، ۱۲۶ ، ۱۳۷ ، ۱۵۸ ،
۲۰۷ ، ۲۰۹ ، ۲۱۰ -
ذکار اللہ، منشی : ۶۳ -
ذکا، حبیب اللہ، منشی : ۱۳۶ ، ۱۹۰ -
ذوق : ۸۱ ، ۱۲۸ ، ۱۲۹ ، ۱۳۰ -
رابرٹس، لارڈ : ۹۳ ، ۹۴ -
رابرٹ منٹگمری : ۳۹ -
راس مسعود، سر سید : ۱۸۰ -
رالف رسل : ۹ -
رام جی داس : ۱۵۲ -
رزنگٹن : ۹۷ -
رستم : ۸۷ -
رسل : ۹۷ -
رسل، سر ولیم : ۶۴ ، ۶۵ ، ۲۱۱ ، ۲۱۲ -
رشید حسن خاں : ۲۴۸ -
رضی الدین خاں، حکیم : ۱۶۰ -
رفعت بھوپالی : ۱۹۴ -
رکن الدولہ : ۱۹۶ -
روشن الدولہ : ۱۶۵ -
روشن علی خاں میر : ۱۲۸ -

ریڈ، ہنری اسٹوارٹ : ۳۸ ، ۵۹ ، ۶۰ -
زاہدی، محبوب جمال : ۲۱۹ ، ۲۵۴ -
زہرا معین : ۲۰ -
زینت محل : ۱۶۰ -
ساسان ششم : ۱۱۶ -
سانڈرس : ۱۳۲ -
سانڈرسن، مسز : ۲۳۳ -
سبزواری، ڈاکٹر شوکت : ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۳۰ -
سجاد مرزا : ۱۵۵ ، ۱۵۹ -
سراج الدین، بہادر شاہ، دیکھیے : ظفر -
سر سید احمد خاں : ۸۷ ، ۱۴۳ ، ۱۶۹ -
سرفراز حسین، میر : ۴۳ ، ۱۵۹ ، ۱۶۰ -
سرور، آلِ احمد، پروفیسر : ۲۱۹ ، ۲۲۴ -
سرور، عبدالغفور، چودھری : ۱۳ ، ۲۵ ، ۳۹ ،
۵۰ ، ۱۱۳ ، ۱۲۳ ، ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۲۸ ،
۱۲۹ ، ۱۳۳ ، ۱۳۵ ، ۱۴۳ ، ۱۴۵ ، ۱۵۰ ،
۱۵۲ ، ۱۵۳ ، ۱۵۴ ، ۱۸۹ ، ۱۹۱ ، ۱۹۲ ،
۱۹۳ ، ۱۹۴ ، ۱۹۵ -
سعادت خاں : ۱۵۲ -
سعدی : ۱۰۹ ، ۱۱۱ -
سکرز صاحب : ۱۳۶ ، ۱۴۰ -
سکندر : ۷۹ ، ۹۵ ، ۹۷ ، ۱۱۱ ، ۱۱۴ -
سلیم اختر : ۲۱۹ ، ۲۳۲ -
سلیمانؑ : ۷۹ ، ۱۱۵ -
سلیمان شکوہ، مرزا : ۱۶۹ -
سمتھ باسورتھ : ۶۳ ، ۶۵ -

سندر لال، پنڈت: ۶۳، ۶۵، ۲۰۹، ۲۱۰۔
سنجر (بادشاہ): ۱۱۴۔
سیّاح: ۱۲۲، ۱۴۳، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۶۲۔
سیّد مہدی: ۷۴۔
سیّد محمود، ڈاکٹر: ۱۷۹، ۱۸۹، ۲۲۰، ۲۳۸، ۲۴۳۔
سیف الدین حیدر خاں، مظفر الدولہ: ۱۰۵، ۱۵۵۔
شاہِ اودھ: ۱۴۹۔
شاہ ایران: ۱۰۴
شاہ بولا: ۱۵۰۔
شاہ جہاں: ۱۰۷، ۲۰۱۔
شاہ روم: ۱۱۴۔
شاہ عالم ثانی: ۱۶۹۔
شجاع الدولہ: ۱۴۳، ۱۸۶۔
شرف الدولہ: ۸۹
شریف خاں، حکیم: ۹۳۔
شفق، انور الدولہ، نواب محمد سعد الدین احمد خاں: ۱۳، ۲۵، ۳۰، ۴۹، ۸۸، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۶۶، ۲۰۷۔
شمس الدین، نواب: ۲۰۸۔
شوکت سبزواری، دیکھیے: سبزواری ڈاکٹر شوکت۔
شیرانی، حافظ محمود خاں: ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۸، ۱۸۹۔
شیفتہ، نواب مصطفٰے خاں: ۱۶۲، ۱۶۳، ۲۵۲۔
شیوجی رام: ۱۱۲۔
شیو نرائن، دیکھیے: آرام۔
صابر، قادر بخش، مرزا: ۱۹۰۔
صاحب رام: ۱۵۲۔
صاحب عالم مارہروی: ۱۳۰، ۱۹۱۔
صدر الدین، مولوی، دیکھیے: آزردہ۔
صدیقی، رشید احمد، پروفیسر: ۴، ۲۱۹، ۲۲۳۔
صدیقی، شمس الدین، ڈاکٹر: ۲۱۹، ۲۳۶۔
صدیقی، ظہیر احمد، ڈاکٹر: ۲۱۹، ۲۵۶۔
صدیقی، عبدالستار، ڈاکٹر: ۲۰، ۴۳، ۲۰۰، ۲۲۰۔
صدیقی، محمد اکبر الدین: ۲۱۹، ۲۵۶۔
صدیقی، محمد عتیق: ۱۰، ۱۴، ۲۹، ۱۳۰، ۱۴۴، ۱۴۸، ۱۶۸۔
صفدر: ۱۶۳۔
صفدر مرزا پوری: ۲۶۔
ضحاک: ۷۹۔
ضمیر نیازی: ۲۱۹، ۲۲۷۔
ضیاء الدولہ: ۱۶۶۔
ضیاء الدین خاں: ۱۰۳، ۱۵۰، ۱۶۱، ۱۶۷، ۱۷۲، ۱۹۱، ۱۹۲۔
ضیاء اللہ خاں: ۱۵۰۔
ضیائی (مسلم): ۲۲۹۔
طالب: ۱۹۰۔
طالع یار خاں: ۱۶۰۔
ظ۔ انصاری، ڈاکٹر: ۴۰، ۱۷۸، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۲۸۔
ظفر، بہادر شاہ: ۱۱، ۱۴، ۲۵، ۲۹، ۴۰، ۵۳، ۷۰، ۸۱، ۸۶، ۱۰۵، ۱۲۳،

۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۴۳، ۱۵۳،
۱۶۱، ۱۶۶، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۵،
۱۷۸، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۹،
۱۹۰، ۲۰۳، ۲۴۶، ۲۴۹۔
عابد حسین، ڈاکٹر سید: ۲۱۹، ۲۲۳۔
عابد علی عابد: ۱۹۔
عارف، زین العابدین: ۹۶۔
عاشور بیگ میرزا: ۱۶۰۔
عبادت بریلوی، ڈاکٹر: ۲۱۹، ۲۴۰۔
عباس بیگ میرزا: ۱۳۷، ۱۴۰۔
عباس شاہ مرزا: ۱۷۰۔
عبدالحق، ڈاکٹر مولوی: ۶، ۲۲، ۱۸۹، ۲۳۲،
۲۵۵۔
عبدالرحمٰن: ۱۰۴، ۱۶۷۔
عبدالقوی دسنوی، پروفیسر: ۲۱۹، ۲۳۲۔
عبدالکریم: ۱۹۷۔
عبداللطیف: ۲۵۔
عبداللطیف، ڈاکٹر سید: ۲۲۰۔
عبداللطیف، منشی: ۱۶، ۳۳، ۴۸، ۵۶،
۵۷۔
عبدالودود، قاضی: ۱۰۰، ۲۲۰۔
عبداللہ بیگ خاں: ۹۵۔
عبداللہ، ڈاکٹر سید: ۲۱۹، ۲۲۱۔
عرشی، احمد حسن: ۱۲۷۔
عرشی، امتیاز علی خاں: ۱۳۱، ۱۰۱، ۱۹۳، ۲۱۹،
۲۲۰، ۲۲۶، ۲۳۲۔
عرشی زادہ، اکبر علی خاں: ۱۰۰، ۱۸۱، ۱۸۳،
۱۸۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۲۱۶، ۲۱۹،
۲۲۷، ۲۳۲۔
عُرفی: ۱۱۸، ۱۹۸۔
عزیز الدین، مولوی: ۱۵۰۔
عزیز النساء بیگم: ۱۶۹۔
عزیز، ڈاکٹر ایم اے: ۲۱۹، ۲۴۰۔
عزیز، یوسف علی خاں: ۱۳، ۲۵، ۵۰، ۵۱،
علائی، نواب علاء الدین احمد خاں: ۱۳۵، ۱۴۲،
۱۴۳، ۱۶۱، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۸۶، ۱۸۹،
۱۹۳، ۲۵۲۔
علی بخش خاں: ۱۳۳، ۱۹۰۔
علی رضا (حضرت): ۷۴، ۱۲۲، ۱۹۰، ۲۴۲۔
عنایت اللہ: ۲۱۹، ۲۴۳۔
عنوان چشتی، ڈاکٹر: ۲۱۹، ۲۴۳۔
غالب: ۱، ۳، ۶، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲،
۱۳، ۱۵، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲،
۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹،
۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۵، ۳۷، ۳۸، ۴۰،
۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۹،
۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۸،
۵۹، ۶۱، ۶۲، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹،
۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۵، ۸۱، ۸۷، ۹۰،
۹۱، ۹۲، ۹۵، ۹۸، ۱۰۰، ۱۰۲،
۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۲۸، ۱۲۹،

۱۳۰، ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۵،
۱۵۱، ۱۵۵، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴،
۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳،
۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹،
۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵،
۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱،
۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸،
۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۷،
۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۸، ۲۲۰، ۲۲۱،
۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷،
۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳،
۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸،
۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴،
۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰،
۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶ -

غلام اللہ خاں، حکیم : ۹۳ -
غلام حسین خاں : ۱۰۱، ۱۳۳، ۱۵۰ -
غلام فخر الدین : ۱۶۶ -
غلام محی الدین، عرف بڈھے صاحب : ۱۶۶ -
غلام مصطفےٰ خاں، پروفیسر ڈاکٹر : ۵، ۲۱۹، ۲۲۳ -
غلام نجف خاں : ۱۳، ۲۶، ۸۸، ۱۱۰، ۱۲۰، ۱۲۱،
۱۲۳، ۱۲۶، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۶۰، ۱۶۲،
۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۹۴ -
غیاث الدین رامپوری : ۵۱ -
فاروقی، خواجہ احمد، ڈاکٹر : ۲۴۸ -

فاروقی، نثار احمد، پروفیسر : ۲۱۹، ۲۲۵ -
فاضل لکھنوی، سید مرتضیٰ حسین : ۲۶، ۴۴ -
فتح اللہ بیگ : ۱۵۰ -
فتح محمد ملک : ۱۸۹ -
فخر الدین، مولانا : ۱۶۰ -
فردوسی : ۴۳ -
فرمان فتح پوری، پروفیسر، ڈاکٹر : ۲۱۹، ۲۳۱، ۲۳۵ -
فریدوں : ۹۷، ۱۱۴ -
فضل حق خیرآبادی : ۱۶۲ -
مضنو : ۱۵۶ -
فلاطون، دیکھیے : افلاطون -
فیض اللہ، قاضی : ۱۶۰ -
فیض محمد خاں، نواب : ۱۶۸ -
قاسم جان : ۱۲۹ -
قدر بلگرامی : ۸۱، ۱۳۶ -
قطب الدین، حافظ : ۱۰۰ -
قطب الدین، صاحبزادہ : ۱۹۰ -
قمر رئیس، ڈاکٹر : ۲۴۸ -
کاٹن، مسٹر ہنری : ۶۴ -
کاشف : ۱۵۴ -
کالے صاحب، پیرزادہ : ۱۱۳، ۱۵۰، ۱۶۵ -
کاؤس : ۱۱۴ -
کشن لال، دیوان : ۱۳۳ -
کشور ناہید : ۲۱۹، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷،
۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳ -

کلب علی خاں، نواب: ۸۱، ۸۲، ۱۰۲، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، ۲۵۳ -
کلو: ۱۲۲، ۱۳۳ -
کلیان: ۱۲۲ -
کلیم اللہ شیخ جہاں آبادی: ۱۹۰ -
کمشنر حصار: ۱۶۷ -
کمشنر دہلی: ۱۱، ۴۴، ۳۹، ۴۵، ۷۱، ۱۰۴، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۷، ۱۴۰، ۱۵۸، ۲۰۰، ۲۰۳، ۲۰۷ -
کمشنر لکھنو: ۳۰، ۱۱ -
کے، مہ بار: ۹۰، ۶۳، ۶۶، ۹۷، ۲۱۰ -
کمی، [illegible]: ۲۶ -
کینڈنگ، لارڈ: ۱۰، ۱۱، ۲۹، ۳۱، ۶۷، ۹۷، ۱۲۶، ۱۸۰، ۲۰۰، ۲۰۸ -
گورنر جنرل، نواب: [illegible]، ۳۰، ۳۴، ۳۸، ۴۰، ۶۷، ۱۰۱، ۱۰۶، ۱۳۰، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۳۹، ۱۳۹، ۱۴۶، ۱۶۷، ۱۹۳، ۲۰۷، ۲۰۸ -
گوری دیال: ۱۱۸
گوری شنکر: ۱۲۹، ۱۳۰ -
گھمن میاں: ۱۲۲
گیان چند، ڈاکٹر: ۱۰۹ -
لارنس، سر جان: ۶۲، ۶۳، ۶۵، ۱۰۶، ۱۰۷ -
لے یارڈ: ۶۸ -
لیفٹننٹ گورنر: ۳۸، ۳۹، ۵۴، ۷۱، ۱۰۰، ۱۱۸، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۵۳، ۱۵۳، ۱۶۲، ۱۹۴ -
بیک، جنرل لارڈ: ۹۵، ۱۵۲ -
ماجنڈی لیفٹننٹ: ۶۴، ۲۱۲ -
مارٹن مانٹگمری: ۶۳ -
مالسن: ۶۶ -
مالک رام: ۴۴، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۹۶، ۱۰۲، ۱۳۰، ۲۰۰، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۴ -
متین الرحمٰن، دیکھیے: مرتضیٰ متین الرحمٰن۔
مجروح، میر مہدی: ۱۱، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۵، ۳۹، ۴۱، ۸۱، ۱۰۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۵، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۰۱ -
محمدؐ: ۴۵ -
محمد اسد اللہ خاں غالب: ۴۵ -
محمد اشرف، ڈاکٹر: ۷۷، ۲۲۸ -
محمد اکبر شاہ: ۸۰ -
محمد امیر: ۱۱۳ -
محمد باقر، مولوی: ۱۲۸، ۱۷۷ -
محمد بخش، حافظ ممّوں: ۱۵۴، ۱۵۵ -
محمد حسن خاں، حکیم: ۹۳ -
محمد حسین، چودھری: ۱۸۹ -

محمد بین، حکیم دکنی : ۵۱ -
محمد علی بخش : ۱۶۱ -
محمد معین، ڈاکٹر : ۹ -
محمد نصیر، معروف نواب جان : ۱۹۳، ۲۴۰ -
محمود خاں، حکیم : ۹۳، ۱۰۶، ۱۰۹ -
محو، غلام حسن خاں : ۱۳۳ -
مختار الدین احمد، ڈاکٹر : ۱۴۶، ۲۰۰ -
محمود سعیدی : ۷۶، ۲۴۴، ۲۴۸ -
مرتضیٰ خاں، حکیم : ۹۳، ۱۰۶، ۱۵۴، ۱۶۰ -
مرتضیٰ، متین الرحمٰن : ۲۱۹، ۲۳۱ -
مرزا الٰہی بخش : ۱۶۱ -
مرزا فخرو : ۴۰، ۱۲۳، ۱۶۰ -
مرزا قیصر : ۱۹۹ -
مرزا گوہر : ۱۵۱ -
مرزا نوشہ : ۴۴، ۴۵، ۶۱ -
مسرور، غلام حسین خاں : ۱۳۳ -
مشرف انصاری، پروفیسر : ۲۱۹، ۲۴۱ -
مشفق خواجہ : ۲۱۹، ۲۳۹ -
مصطفیٰ خاں : ۱۶۰، ۱۶۸ -
مظفر الدولہ : ۱۶۰ -
معروف، الٰہی بخش : ۱۳۳ -
معین الرحمٰن، ڈاکٹر سید : ۳، ۶، ۵، ۷، ۸،
۲۲، ۱۶۳، ۱۸۶، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۵،
۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲،
۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۴۳،
۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹،
۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵ -
مغل علی خاں : ۱۶۵ -
ملکہ ظفر (بہادر شاہ) : ۹۰ -
ملکہ وکٹوریہ، انگلستان، ملکہ معظمہ : ۳، ۱۱، ۱۲،
۱۹، ۲۲، ۳۰، ۳۳، ۳۸، ۳۹، ۴۰،
۴۱، ۴۲، ۴۵، ۶۰، ۶۱، ۷۳، ۹۶،
۹۸، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۹،
۱۳۲، ۱۵۸، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۶،
۲۰۷، ۲۰۸، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۳۴، ۲۳۶،
۲۳۸ -
مستانہ، [illegible] : ۱۳۳ -
من سیول سنگھ، منشی : ۱۳۸ -
منٹگمری، سر رابرٹ : ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۱، ۱۹۲ -
منظور حسین، خواجہ (علیگ) : ۲۱۹، ۲۲۴ -
مودودی، احمد حسن : ۱۶۲، ۱۹۰ -
مہابت خاں : ۴۳ -
مہاراجہ الور : ۱۵۷ -
مہاراجہ پٹیالہ : ۹۴ -
مہاراجہ ہلکر : ۵۵ -
مہدی علی خاں، نواب : ۱۴۰ -
مہر، مرزا حاتم علی بیگ : ۱۵، ۱۶، ۲۳، ۲۴،
۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۱،
۴۲، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۳، ۵۶، ۵۷،
۶۳، ۷۴، ۱۳۳، ۱۴۷، ۱۵۷، ۱۶۱،

۱۹۶، ۲۰۶ -
مہر، مولانا غلام رسول: ۲۰، ۲۱، ۳۶، ۳۹، ۴۹،
۵۵، ۸۱، ۱۲۰، ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۴۹،
۱۵۵، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸،
۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۹۴، ۲۰۳، ۲۲۰،
۲۴۱، ۲۵۵ -
مہیش پرشاد: ۲۲۰ -
مہیش داس: ۱۱۱، ۱۱۲ -
میاں کالے صاحب: ۱۹۰ -
میر تقی میر: ۲۲۰، ۲۵۱ -
میر چھوٹم: ۱۶۱ -
میر حسن، سید حسن موسوی: ۷۴ -
میر خیراتی: ۱۵۰ -
میر فضل علی: ۱۶۴ -
میر منشی لارڈ صاحب: ۱۳۱، ۱۳۲ -
میرن صاحب: ۱۴۴، ۱۵۹، ۱۶۰ -
میکش، میر احمد حسین: ۱۶۰ -
میکلوڈ صاحب: ۱۳۲ -
میلیسن، جی، بی: ۱۰۰، ۲۱۰ -
نادر شاہ: ۹۳ -
نارنگ گوپی چند، ڈاکٹر: ۲۱۹، ۲۳۲، ۲۴۸ -
ناصر الدین، میر: ۱۹۰ -
ناظم، دیکھیے: یوسف علی خاں، نواب -
نامی، میرزا محمد یعقوب بیگ: ۷۶، ۲۴۸ -
ناناصاحب: ۲۰۶ -
ناہر سنگھ: ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۶۷ -
نجابت علی خاں: ۱۶۸ -
نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا اسد اللہ خاں غالب:
۴۵، ۷۲، ۱۲۳ -
نجم الغنی: ۲۰۹ -
نرندر سنگھ، راجہ: ۹۳، ۱۰۰، ۱۰۶ -
نصر اللہ بیگ خاں: ۹۵، ۲۰۰ -
نصیر الدین، میر: ۱۶۱ -
نظام الدین، میاں: ۱۶۱ -
نظامی، خلیق احمد، ڈاکٹر: ۱۴، ۲۵، ۵۳ -
نظامی، خواجہ حسن: ۲۵، ۷۶، ۲۴۸ -
نظامی گنجوی: ۱۰۱ -
نمرود: ۷۹ -
نواب دلہن، دیکھیے دلبستی بیگم -
نواب جان، دیکھیے: محمد نصیر -
نورانی، امیر حسن: ۲۱۶ -
نولکشور، منشی: ۲۴ -
نیاز احمد: ۲، ۲۰ -
نیتا راجن: ۲۹ -
نیر کاکوروی: ۱۹۵ -
واجد علی شاہ: ۳۰، ۸۹، ۱۷۸، ۲۰۸،
۲۰۹، ۲۱۰ -
والیٔ اندور: ۱۶ -
والیٔ رامپور: ۱۲، ۲۵، ۹۸، ۱۷۷ -
وائسرائے ہند: ۷۱ -

وحید قریشی، ڈاکٹر : ۲۱۹، ۲۳۴ -

وقار عظیم، پروفیسر سید : ۲۰۶، ۲۲۰، ۲۱۹، ۲۳۱، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۹، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳ -

ولایت بیگ، مرزا : ۱۶۹ -

ولیم میور : ۳۸

ویران، حافظ غلام رسول : ۱۳۰ -

ہاڈسن : ۱۴۰ -

ہاشمی، سخی احمد، ڈاکٹر : ۲۱۵، ۲۴۰ -

ہدایت، رضا قلی : ۵۲ -

ہُمایوں : ۱۰۴ -

ہملٹن، کرنیل : ۱۹ -

ہنری اسٹورٹ، دیکھیے : ریڈ ہنری -

ہوپ گرانٹ : ۲۰۶ -

ہوس : ۶۵ -

ہیرا سنگھ : ۱۱۲ -

ہیسٹنگز، لارڈ : ۲۰۹ -

یزدجرد : ۷۹ -

یلدرم، سجاد حیدر : ۶، ۲۲۵ -

یوسف خاں، مرزا : ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۳ -

یوسف علی خاں، نواب : ۱۲، ۴۱، ۵۲، ۸۹، ۱۱۰، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۵۹ -

یوسف مرزا : ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶، ۲۳۲ -

اسماءالکتب:

آپ بیتی — رشید احمد صدیقی - (ڈاکٹر سید معین الرحمن): ۶ -

آثار الصنادید — سرسید احمد خاں: ۸۸، ۱۳۰ -

اٹھارہ سو ستاون اور اخبارات - عتیق صدیقی: ۱۰

اٹھارہ سو ستاون کا تاریخی روزنامچہ — ڈاکٹر خلیق نظامی: ۱۴، ۲۵، ۵۳ -

احوالِ غالب - ڈاکٹر مختار الدین احمد: ۱۷۶، ۲۰۰، ۲۰۲ -

ادبی اقدار - دورا فریدی: ۱۸۶، ۱۸۸ -

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ - سلیم اختر: ۲۴۲ -

اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، جلد ۲: ۱۸۹ -

اردوئے معلّیٰ - غالب، طبع اول: ۴۴، ۵۶، ۱۶۹، ۱۹۷ -

اردوئے معلّیٰ، صدی ایڈیشن - فاضل لکھنوی: ۲۶، ۴۴ -

ارمغانِ غالب — ڈاکٹر ایس-ایم-اکرام: ۲۵۳ -

اشاریۂ غالب - ڈاکٹر سید معین الرحمن: ۱۰۹، ۱۶۹، ۲۲۰، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۳۹، ۲۴۳ -

الہامی کتاب — غالب/چغتائی: ۸، ۲۰ -

انتخابِ غالب (۱۸۶۵ء): ۹۱، ۱۰۰

انشائے نورچشم - رفعت بھوپالی: ۱۹۴ -

انقلاب ۱۸۵۷ء - ڈاکٹر کنور محمد اشرف: ۲۲۸ -

بابائے اردو - احوال و افکار - ڈاکٹر سید معین الرحمن: ۹

برہانِ قاطع: ۱۹۷، ۲۳۱ -

برہانِ قاطع، مرتبہ: ڈاکٹر محمد معین: ۹ -

بہادر شاہ کا روزنامچہ - حسن نظامی: ۱۹۱ -

بیاضِ غالب (۱۸۱۶ء): ۱۸، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷ -

پنج آہنگ: ۴۴، ۷۳ -

پنج آہنگ (قلمی): ۷۳، ۱۹۱ -

پنج آہنگ (۱۸۴۹ء): ۱۹۷ -

تذکرۂ گلستانِ سخن - مرزا صابر: ۱۹۰ -

تاریخِ اودھ، جلد پنجم - نجم الغنی: ۲۰۹ -

تاریخِ سلاطینِ تیموریہ: ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۸۱ -

تاریخِ ہند - ذکاء اللہ: ۶۳ -

تیغِ تیز (۱۸۶۷ء): ۱۹۷ -

حیاتِ غالب - ڈاکٹر ایس-ایم-اکرام: ۲۳۴ -

خطوطِ غالب اردو: ۳، ۱۷، ۱۸، ۲۳، ۵۸، ۱۱۹، ۱۹۰، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۳،

۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۵

خطوطِ غالب ـ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی/ مالک رام: ۴۳۔

خطوطِ غالب، جلد ا، مولانا غلام رسول مہر: ۱۹، ۳۶، ۵۵، ۵۶، ۱۲۰، ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰۔

خطوطِ غالب، جلد ۲ ـ مولانا غلام رسول مہر: ۱۵۵، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۶، ۱۹۴۔

خیالستان یلدرم/ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ۶۔

دستنبو: ۳، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۳، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۳۰، ۳۱، ۳۵، ۴۰، ۴۱، ۴۷، ۴۹، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۵، ۶۹، ۷۰، ۸۱، ۹۸، ۱۱۲، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۸۵، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱۔

دستنبو (مسودہ): ۳۰، ۴۹، ۵۵۔

دستنبو (قلمی): ۲۳، ۲۷، ۴۷۔

دستنبو (ایک خاص نسخہ) ۵۱۔

دستنبو (اُردو ترجمہ): ۱۶، ۷۵، ۷۶، ۲۲۶، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۵۔

دستنبو (زیر طبع ۱۸۵۸ء) ۱۷، ۱۸، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۵۹۔

دستنبو (۱۸۵۸ء): ۲۳، ۲۴، ۳۸، ۳۹، ۴۱، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۲، ۵۴، ۵۷، ۶۰، ۶۱، ۷۰، ۷۲، ۷۶، ۱۹۷، ۲۰۷، ۲۲۳، ۲۲۹۔

دستنبو (۱۸۶۵ء): ۲۳، ۲۴، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۲۰۷۔

دستنبو (۱۸۶۸ء): ۲۳، ۲۴، ۷۳، ۷۴۔

دستنبو ـ ڈاکٹر عبد الشکور احسن: ۵۲، ۲۲۲۔

درفشِ کاویانی (۱۸۶۵ء): ۱۹۷۔

دساتیر: ۱۳، ۲۸، ۴۹، ۵۰، ۵۳، ۷۶، ۱۱۶۔

دیوانِ ریختہ (غالب): ۱۱۷۔

دیوانِ ریختہ، قلمی (غالب) ۱۹۱۔

دیوانِ غالب اُردو: ۱۲، ۱۹، ۴۳، ۵۲، ۱۷۶، ۱۸۶، ۲۲۲، ۲۳۱۔

دیوانِ غالب اُردو طبع اوّل (۱۸۴۱ء): ۲۵۳۔

طبع دوم (۱۸۴۷ء): ۲۵۳۔

طبع سوم (۱۸۶۱ء) ۲۵۳۔

دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی: ۱۸۰، ۱۹۴۔

دیوانِ غالب نظامی ایڈیشن (۱۹۱۹ء) ۲۳۸، ۲۴۳۔

نظامی ایڈیشن (۱۹۲۶ء) : ۱۶۹ -

دیوانِ فارسی، غالب (۱۸۴۵ء) : ۴۴ -

ذکرِ عبدالحق — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ۶، ۲۵۵ ۔

ذکرِ غالب ۱۹۶۴ء ، مالک رام : ۲۰۰۱، ۹۶۷، ۱۳۰ -

سبدِ چین (۱۸۶۷ء) : ۱۶۵ -

سن ستاون، مسند لاول : ۶۳، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۱۳ -

سوالاتِ عبدالکریم (۱۸۶۵ء) : ۱۹۷ -

سید وقار عظیم — سوانحی خاکہ - ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ۶ -

سیرِ دہلی - ریاض الدین امجد : ۱۲۶، ۲۰۲ -

عملِ چغتائی (۱۹۶۸ء) : ۲۰ -

عودِ ہندی (۱۸۶۸ء) : ۵۷، ۵۸، ۱۶۵، ۱۹۷ -

غالب اور ابوالکلام — عتیق صدیقی : ۱۷، ۸۷، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۸، ۱۶۹ -

غالب اور انقلاب ستاون - ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ۱، ۳، ۹، ۸، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۵۰، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۸۹ -

غالب شناسی ۱ - ڈاکٹر ظ - انصاری : ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۲۸ -

غالب کا روزنامچہ — دیکھیے : مرزا غالب کا روزنامچہ -

غالب کی نادر تحریریں - ڈاکٹر خلیق انجم : ۱۹۷ -

غالب نام آورم (۱۹۶۹ء) ۱۰۱ -

غالب نامہ - آثارِ غالب ، اکرام (طبع چہارم) : ۱۹۷ -

غالب نامہ - اکرام (۱۹۳۶ء) : ۱۹۶، ۲۵۳ -

غالبیات کا تحقیقی مطالعہ - ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ۶، ۲۳۹، ۲۴۳ -

غالبیہ - کسریٰ خان عرشی زادہ : ۲۱۹ -

غدر کی دستاویزیں : ۱۳۰ -

غدر کی صبح شام - خواجہ حسن نظامی : ۲۵ -

فرمودات عبدالحق — ڈاکٹر سید معین الرحمٰن : ۶ -

فرہنگِ انجمن آرای ناصری : ۵۲ -

فرہنگِ عامرہ (۱۹۵۷ء) : ۹

قاطعِ برہان (۱۸۶۲ء) ۱۹۷ -

قصائد و مثنویاتِ فارسی، غالب - مجہر : ۸۱، ۲۰۳ -

کارِ چغتائی : ۷۰، ۲۳۱ -

کلیاتِ غالب، فارسی : ۸۱ -

کلیاتِ غالب، فارسی (قلمی) : ۱۹۱ -

کلیاتِ غالب، فارسی (۱۸۶۳ء) : ۱۶۵ -

کلیاتِ غالب، فارسی (لکھنؤ ۱۸۹۳ء) : ۲۰۳ -

کلیاتِ نثرِ غالب، فارسی (۱۸۶۸ء) : ۲۳، ۲۴ -

کلیاتِ نثرِ غالب، فارسی (کانپور ۱۸۷۵ء) ۸۲ -

(کانپور ۱۸۸۴ء) : ۶۴ -

(کانپور ۱۸۸۸ء) : ۴ --

کلیاتِ نثرِ غالب، فارسی (لکھنؤ ۱۸۷۱ء): ۳۔
(لکھنؤ ۱۸۸۵ء): ۷۳۔
لطائفِ غیبی (۱۸۶۴ء): ۱۹۷۔
مرزا غالب کا روزنامچہ۔ خواجہ حسن نظامی:
۷۶، ۲۳۰۔
مرقعِ ادب جلد ۲۔ صفدر مرزاپوری: ۷۶۔
مرقعِ چغتائی (۱۹۲۸ء): ۱۹۔
مطالعۂ یلدرم۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن:
۷۶، ۲۲۵۔
مفہومِ غالب۔ صاحبزادہ احسن علی خاں:
۱۸۵۔
مکاتیبِ غالب۔ عرشی (۱۹۳۷ء) ۱۹۷۔
(۱۹۴۳ء) ۱۸۱۔
(۱۹۴۶ء) ۱۴۱۔
مہرِ نیمروز (قلمی): ۷۴، ۱۹۱۔
مہرِ نیمروز (۱۸۵۴ء): ۴۴، ۱۹۷۔
مہرِ نیمروز (۱۹۶۸ء): ۷۳۔
مئے لالہ فام۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال:
۱۸۹۔
نادراتِ غالب۔ آفاق دہلوی: ۱۹۷۔
نسخۂ حمیدیہ۔ حمید احمد خاں، ۱۹۶۹ء:
۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۹۔
نسخۂ رامپور (۱۸۳۳ء): ۱۸۰۔
نسخۂ رامپور جدید (۱۸۵۵ء): ۱۹۰۔
نسخۂ شیرانی (۱۹۶۹ء): ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴،
۱۸۰، ۱۸۹۔
نسخۂ عرشی، دیکھیے: دیوانِ غالب اردو،
نسخۂ عرشی۔
نسخۂ گیان زادہ، بخطِ غالب (۱۹۶۹ء): ۱۸۰،
۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷۔
نقشِ عبدالحق۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن:
۶۔
نقشِ چغتائی (۱۹۳۵ء): ۱۹۔
ہندوستانی اخبار نویسی۔ عتیق صدیقی: ۲۹۔
یادگارِ غالب۔ حالی: ۲۲۰۔

اخبارات و رسائل :

آفتاب عالمتاب، آگرہ : ۱۶۹ -

احسن الاخبار، دہلی، ۱۳ دسمبر ۱۸۴۲ء : ۱۶۱ -

اخبار مفید خلائق، آگرہ : ۵۹، ۱۵۲، ۱۵۳ -

ادبی دنیا، لاہور، ستمبر ۱۹۳۹ء : ۲۰۰ -

ادب لطیف، لاہور، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۴ء : ۲۲۱ -

اردو نامہ، کراچی، شمارہ ۵۰، مارچ ۱۹۷۵ء : ۲۳۴ -

اردوئے معلّٰی، دہلی (غالب نمبر) فروری ۱۹۶۱ء : ۶۰، ۶۹، ۲۳۶ -

العلم، کراچی، جنوری مارچ ۱۹۶۹ء : ۱۶۶ -

الہلال، کلکتہ، ۱۰ جون ۱۹۱۴ء : ۱۶۴، ۱۶۸ -

اوراق، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء : ۲۵۵ -

اودھ اخبار، لکھنؤ : ۱۶۱ -

اودھ اخبار، لکھنؤ، ۲۳ اپریل ۱۸۶۲ء : ۸۰، ۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۸ -

۴ مئی ۱۸۶۲ء : ۲۱۸ -

تحریک، دہلی، اپریل مئی ۱۹۶۹ : ۶۷، ۲۴۸ -

تصویر جذبات، فروری ۱۹۲۴ء : ۲۶ -

ٹائم اخبار : ۲۴ -

حالاتِ دربار شاہی، آگرہ : ۱۶۹ -

حریت، کراچی : ۱۶ نومبر ۱۹۶۸ء : ۶۷ -

۳۰ نومبر ۱۹۶۸ء : ۶۹ -

۷ دسمبر ۱۹۶۸ء : ۶۹ -

۱۴ دسمبر ۱۹۶۸ء : ۶۹ -

۲۱ دسمبر ۱۹۶۸ء : ۶۹ -

۲۸ دسمبر ۱۹۶۸ء : ۶۹ -

۴ جنوری ۱۹۶۹ء : ۶۹ -

۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء : ۶۹ -

حکایت، لاہور، اپریل ۱۹۷۵ء : ۲۴۳ -

دوربین، اخبار، کلکتہ : ۲۹ -

دہلی اردو اخبار، دہلی : ۱۶۶ -

اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۸۳۵ء : ۱۲۸، ۱۲۹ -

۲۸ اگست ۱۸۵۲ء : ۱۸۶ -

۱۹ نومبر ۱۸۵۳ء : ۸۱ -

رسالہ دہلی سوسائٹی، شمارہ ۱، ۱۸۶۶ء : ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۳۶ -

سراج الاخبار، دہلی، ۱۳ دسمبر ۱۸۴۴ء : ۱۶۱ -

سلطان الاخبار، کلکتہ : ۲۹ -

سماچار سدھا برشن : ۲۹ -

شاعر، بمبئی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء : ۳۰، ۱۶۵، ۱۶۸ -

صادق الاخبار، دہلی، ۱۳ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ : ۱۳۰ -

صحیفہ، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء : ۱۶۹، ۱۸۹-

علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۴۹ء : ۲۰۰-

غالب، سہ ماہی، کراچی، جولائی، ستمبر ۱۹۷۵ء:
۲۲۹، ۲۳۱-

کتاب، لاہور، فروری ۱۹۷۵ء : ۲۲۳-

کوہ نور، لاہور، ۱۵-جولائی ۱۸۵۰ء : ۸۱-

گلشن نوبہار، کلکتہ : ۲۹-

ماہ نو، کراچی فروری ۱۹۵۲ء : ۱۶۵-

معاصر، پٹنہ، حصہ ۲ : ۱۰۰-

نقوش، لاہور، غالب نمبر ۱، فروری ۱۹۶۹ء:
۲۱۶-

نقوش، لاہور، غالب نمبر ۲، اکتوبر ۱۹۶۹ء:
۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶،
۱۸۷-

نقوش، لاہور، غالب نمبر ۳، ۱۹۷۱ء: ۲۱،
۲۹-

نگار پاکستان، کراچی، جنوری، فروری ۱۹۷۵ء:
۲۳۶-

نگار، رامپور، جون ۱۹۶۳ء : ۲۱۶-

نگار، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۰ء : ۷۳-

نوائے ادب، بمبئی :
جنوری ۱۹۵۵ء : ۵۲-
اپریل ۱۹۵۵ء : ۵۲-
جولائی ۱۹۵۵ء : ۵۲-
جولائی، اکتوبر ۱۹۵۶ء : ۵۲-
اپریل ۱۹۵۹ء : ۱۰۲-

نیا دور، کراچی، ۱۹۷۵ء : ۲۳۹-

ہم قلم، کراچی، اگست ۱۹۶۲ء : ۱۸۹-

ابیات :

آتا ہے ایک ..... اثر ہے آج : ۱۸۵۔
آتش کدہ ہے ..... میں آوے : ۱۸۰۔
آہ کو چاہیئے ..... سر ہونے تک : ۱۸۷۔
اسد اللہ خاں ..... چہ دستبو : ۴۶۔
اس طرح کے وصال ..... ہجراں کا : ۱۷۶۔
اہلِ بینش کو ہے ..... استاد نہیں : ۱۸۳۔
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ : ۱۶۰۔
اے تازہ واردان ..... نوش ہے : ۱۸۸۔
بس کہ رو کا ..... گریباں ہوگئیں : ۱۸۷۔
بسکہ فعال ما یرید ..... انگلستاں کا : ۱۷۶۔
بسیار خوباں دیدہ ام ..... : ۵۔
بنام خداوند ..... روز و شب گر : ۷۷۔
بہ زر زد ..... بہادر شاہ ثانی : ۱۲۸۔
پڑیے گر بیمار ..... کوئی نہ ہو : ۱۹۸۔
نہال دوستی ..... تخمے کاشتیم : ۳۸، ۱۵۸۔
تم سلامت رہو ..... پچاس ہزار : ۱۶۲۔
تڑ بیٹھے جبکہ ..... گو ہر ساکرے : ۱۶۸۔
تا بیکہ ستارہ ..... ارزن ارزند : ۹۰۔
تشنہ خوں ..... فروزاں ہوگئیں : ۱۸۶۔
بے طلب ..... توقع امضا : ۱۴۰۔
یک جیب کو کمیں ..... زنداں کا : ۱۷۶۔
چوں جنبش سپہر ..... بما آسمان دہد : ۱۳۰۔
حد چاہیے سزا میں ..... نہیں ہوں میں : ۱۸۴۔
خورشید ز اندیشۂ ..... می لرزد : ۹۰۔
داغِ فراقِ صحبت ..... خموش ہے : ۱۸۸۔
دام ہر موج میں ..... گہر ہونے تک : ۱۸۸۔
در نومیدی ..... سپید است : ۱۳۶۔
دل میں ذوقِ وصل ..... جل گیا : ۱۸۲۔
دل نہیں دکھاتا ورنہ ..... جل گیا : ۱۸۲۔
دیکھو مجھے جو ..... نیوش ہے : ۱۸۸۔
راہ سخن کشودم ..... ستاں دہد : ۹۷۔
روز اس شہر میں ..... کیا ہوتا ہے : ۱۳۵، ۱۶۵۔
روشن اسی کے ..... میں بھی ہے : ۲۰۔
روزگار چراغاں، اشتہار چراغاں : ۲۰۷۔
زبانِ اہل زباں میں ہے ..... زبانی شمع : ۱۸۰۔
زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم : ۲۲۲۔
زندگی اپنی جب ..... خدا رکھتے تھے : ۱۹۴۔
سات جلدوں کا ..... بر محل بیٹھا : ۳۰۷۔
سپس ہر آئینہ ..... در زبانِ قدیم : ۲۰۱۔
سو بھی نہ تو ..... ایک نگہ دیکھنا : ۱۵۹۔
شاہ و ولی عہد ..... ظفر آمد : ۲۰۳۔
شمار یافت، روزگار یافت :

شہرِ دہلی کا .... ہر مسلماں کا : ۱۷۶

ضعف (عشق) نے غالب ... کام کے : ۲۰۲

ظلمت کدے میں .... سو خموش ہے : ۱۸۸

عاشقی صبر طلب ... جگر ہونے تک : ۱۸۷

(عشق) ضعف نے غالب .... کام کے : ۲۰۲

فلا تسئلن .... فی حصر : ۱۶۴

کار دنیا کسے .... مختصر گیرید : ۱۳۸

کارسازِ ما .... آزارِ ما : ۱۳۸

کتابی زدرقم ... جہانی گشت طالب : ۴۶

کم نہیں وہ بھی .... یاد نہیں : ۱۸۴

کوئی داں سے .... یاں کا : ۱۷۶

کیا تنگ ہم .... آسماں ہے : ۱۸۷

کیوں گردشِ مدام سے ... نہیں ہوں میں : ۱۸۱

گاہ جل کر .... پنہاں کا : ۱۷۶

گاہ رو کر ... گریاں کا : ۱۷۶

گر خامشی سے .... محال ہے : ۱۸۱

گلشن میں بندوبست ... درپے آج : ۱۸۵

گمانِ زیست .... گمانِ تونیست : ۱۹۴

گھر سے بازار میں ... انساں کا : ۱۷۶

گھر میں تھا کیا ... اک حسرتِ تعمیر سو ہے : ۱۴۷

مرا زمانۂ طناز ... سے خوار : ۱۱۸

میں نے مانا .... دل و جاں کا : ۱۷۶

میں ہوں اور .... جل گیا : ۱۸۳

نامہ خود سالِ خویش داد نشاں : ۴۷

نامہ خود سال .... چہ دستنبو : ۴۶

نامۂ وکٹوریہ .... آفتاب برآمد : ۲۰۳

نوشتم تفتہ .... دستنبوی غالب : ۴۶

وائے محرومی .... فریاد نہیں : ۱۸۴

ہر داغِ تازہ .... امتحاں نہ پوچھ : ۱۸۶

ہر کہ خواند .... بندہ گنہ گارم : ۴۴

ہستی ہماری .... اپنی فنا ہوئے : ۱۸۱

ہندوستان سایۂ گل ... بتاں نہ پوچھ : ۱۸۵

ہے موجزن اک قلزم ... کیا کیا مرے آگے : ۱۲۵

یاد تھیں ہم کو ... طاقِ نسیاں ہو گئیں : ۱۸۶

یارب زمانہ .... نہیں ہوں میں : ۱۸۱

یا شب کو .... گل فروش ہے : ۱۸۸

یا صبح دم جو دیکھیے .... خروش ہے : ۱۸۸

یوں ہی گر روتا رہا .... ویراں ہو گئیں : ۱۸۶

یہ نہ تھی ہماری قسمت .... : ۲۵۴

اداریے :

آل انڈیا ریڈیو، اردو سروس، دہلی : ۲۲۶ -
اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، لاہور : ۲۲۱ -
اُردو ریسرچ اکاڈمی، رامپور، یو-پی : ۱۸۶،
۱۸۸ -
اسٹوڈیوز پاکستان ٹیلی وژن، لاہور : ۲۴۴ -
اکمل المطابع، دہلی : ۱۶۷، ۲۰۰ -
امام باڑہ، آغا باقر : ۱۴۹ -
انجمن ترقّیٔ اردو پاکستان : ۱۹۰ -
انجمن ترقّیٔ اُردو ہند : ۲۹، ۹۵ -
انگلستان پارلیمنٹ : ۹۸ -
اورئینٹل کالج، لاہور : ۶، ۲۳۰، ۲۴۲ -
ایسٹ انڈیا کمپنی : ۱۱، ۱۹، ۲۹، ۹۳،
۹۵، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۸۳،
۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰،
۲۱۲ -
ایف سی کالج، لاہور : ۶، ۲۵۴ -

برٹش پارلیمنٹ : ۹۷ -
پاکستان ٹیلی وژن (پی ٹی وی) : ۲۴۴، ۲۵۴ -
پنجاب پبلک لائبریری، لاہور : ۴۳ -
پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی : ۲۵۶ -
پنجاب یونیورسٹی، لاہور : ۶، ۲۲، ۳۶، ۵۲،
۱۸۹، ۲۰۳، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲،
۲۲۵، ۲۲۷، ۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۲ -
ترقّیِ اُردو بورڈ، کراچی : ۶، ۲۲ -
ثانوی تعلیمی بورڈ، لاہور : ۶، ۲۳۹ -
جامعہ سندھ، جام شورو : ۶، ۲۳۰، ۲۳۳،
۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۳ -
جامعہ ملّیہ اسلامیہ، نئی دہلی : ۲۳۲، ۲۳۳ -
چھاپہ خانہ گلشنِ نوبہار : ۲۹ -
دارالبقاء (درس گاہ) : ۱۵۰ -
دہلی سوسائٹی : ۱۹، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۳۶ -
دہلی کالج : ۱۶، ۵۵ -
دہلی یونیورسٹی : ۲۴۸ -
رضا لائبریری، رامپور : ۲۲۷، ۲۳۲ -
ریڈیو پاکستان، پشاور : ۲۳۸، لاہور : ۲۳۵ -
سندھ یونیورسٹی، دیکھیے : جامعہ سندھ -
سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور : ۱، ۲۲۶، ۲۳۶ -
سیفیہ کالج، بھوپال : ۲۳۲ -
شعبۂ اُردو، ایف سی کالج، لاہور : ۶ -
پنجاب یونیورسٹی لاہور : ۶، ۲۴۲ -
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی : ۲۳۲،
۲۳۳ -

شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی : ۲۴۸، ۲۵۶ ـ
سندھ یونیورسٹی : ۲۲۳، ۲۴۰ ـ
سیفیہ کالج، بھوپال : ۲۳۲ ـ
عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد : ۲۵۶ ـ
گورنمنٹ کالج، بہاول نگر : ۶ ـ
گورنمنٹ کالج، لاہور : ۲۴۲ ـ
گورنمنٹ کالج، لائل پور : ۱، ۹۱، ۲۲۰، ۲۲۵ ـ
شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور : ۵۲ ـ
شعبۂ صحافت، کراچی یونیورسٹی : ۲۳۱ ـ
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور : ۱۸۹ ـ
عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد دکن : ۲۵۶
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ : ۲۲۴، ۲۳۳ ـ
فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور : ۲۴۱ ـ
کتاب خانہ ضیاء الدین احمد خاں : ۱۷۲ ـ
کتب خانۂ خاص انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان : ۱۹۰ ـ
کتب خانہ مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور : ۱۹۰ ـ
کمپنی بہادر، کمپنی راج، کمپنی، دیکھیے : ایسٹ انڈیا کمپنی ـ
کورٹ آف ڈائرکٹرز : ۱۰ ـ
گورنمنٹ کالج، بہاول نگر : ۶ ـ
لاہور : ۲۴۲ ـ
لائل پور : ۱، ۹۱، ۲۲۰، ۲۲۵ ـ
لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، بریلی : ۲۴، ۷۰، ۶۴ ـ
لیتھوگرافک پریس، کلکتہ : ۱۰ ـ
مجلس ترقیٔ ادب، لاہور : ۲۴، ۹۰ ـ
مدرسہ روشن الدولہ : ۱۶۵ ـ
مسلم یونیورسٹی، دیکھیے : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
مطبع حیدری، آگرہ : ۱۷۶، ۲۰۲ ـ
مطبع سراجی، دہلی : ۲۰۰ ـ
مطبع سید الاخبار، دہلی : ۸۸، ۱۹۳ ـ
مکتبہ میری لائبریری، لاہور : ۱۸۵ ـ
مطبع لٹریری سوسائٹی، روہیل کھنڈ، بریلی : ۲۴، ۷۲، ۷۴ ـ
مطبع مجتبائی، میرٹھ : ۱۷۶ ـ
مطبع محمدی، دہلی : ۱۷۵ ـ
مطبع مرتضوی، دہلی : ۱۹۰ ـ
مطبع مفید خلائق، آگرہ : ۱۰، ۲۴، ۳۰، ۳۱، ۳۸، ۴۳، ۴۵، ۴۶، ۶۰، ۶۲ ـ
مطبع نولکشور، لکھنؤ : ۲۴، ۲۰۳ ـ
ندرت پریس، لاہور : ۲ ـ
ندوۃ المصنفین، دہلی : ۵۳ ـ
نیشنل آرکائیوز آف لندن : ۱۴۰ ـ
نظامی پریس، بدایوں : ۱۴۹ ـ

اماکن:

آسام: ۱۷۳۔

آگرہ: ۱۰، ۱۱، ۱۶، ۲۳، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۵، ۴۳، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۹، ۶۱، ۷۲، ۹۵، ۱۱۱، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۶۱، ۱۷۶، ۲۰۲، ۲۰۷، ۲۰۸۔

اجمیری دروازہ، دہلی: ۹۱، ۱۶۰۔

اُردو بازار، دہلی: ۱۵۰۔

اُڑیسہ: ۲۰۹۔

افریقہ: ۱۷۰۔

افغانستان: ۲۱۶۔

اکبرآباد: ۱۲۸، ۱۶۰۔

اکور: ۱۵۵، ۱۵۷۔

الٰہ آباد: ۳۹، ۶۰، ۱۶۹، ۲۰۸۔

انبالہ: ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۰۔

اندور: ۱۶، ۲۷، ۳۱، ۳۲، ۳۵، ۳۷، ۵۵۔

انڈیمان: ۱۶۲، ۱۶۸

انگلستان، انگلینڈ: ۱۱، ۱۲، ۳۰، ۳۳، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۶، ۴۸، ۷۳، ۹۷، ۹۸، ۱۵۰، ۱۵۸، ۱۷۶، ۲۰۵، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۳۷۔

اودھ: ۱۹، ۴۰، ۸۹، ۹۰، ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۶۴، ۱۶۵، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱۔

اورنگ آباد: ۱۶۵۔

اوقیانوس: ۱۷۰۔

ایران: ۷۹، ۸۰، ۹۷، ۱۰۴، ۲۰۳، ۲۱۸، ۲۴۱، ۲۴۸۔

ایوانِ خان سامانی: ۱۰۴۔

باڈلی: ۱۰۰۔

بجھور: ۲۰۸۔

برطانیہ: ۱۹۔

برِعظیم: ۱۹۔

بریلی: ۲۴، ۷۳، ۸۹، ۱۰۱، ۱۱۰۔

بڑودہ: ۱۶۵

بغداد: ۱۴۳۔

بلاقی بیگم کا کوچہ: ۱۵۱، ۱۶۰۔

بلب گڑھ: ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۹۸۔

بلی ماراں، دہلی: ۱۰۰، ۱۴۴، ۱۵۰، ۱۵۹، ۱۶۸۔

بمبئی: ۴۰، ۹۷، ۱۰۲، ۱۷۵، ۱۷۸،

۱۹۵، ۱۹۷ ۔
بنارس : ۲۰۸
بنگال : ۲۰۹
بہادر گڑھ : ۱۰۵، ۱۹۷، ۱۹۸ ۔
بہار : ۲۰۹ ۔
بہاول نگر : ۷۶، ۸۰ ۔
بھرت پور : ۱۹۹، ۲۰۸ ۔
بھوپال : ۲۱۹، ۲۳۳ ۔
بیگم کا باغ : ۱۵۰ ۔
بیلی گارد، لکھنؤ : ۸۹ ۔
پاٹودی : ۱۰۵، ۱۳۰، ۱۹۷ ۔
پارس : ۱۳، ۱۴، ۲۹، ۴۹، ۵۳، ۶۷ ۔
پاکستان : ۱۹، ۱۹۰، ۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۵،
۲۲۹، ۲۵۵ ۔
پاک و ہند : ۱۰ ۔
پانی پت : ۱۹۹ ۔
پٹنہ : ۱۰۰، ۱۶۹ ۔
پٹیالہ : ۹۳، ۹۴، ۱۰۲، ۱۰۹، ۱۲۵ ۔
پشاور : ۹، ۲۱، ۲۳۸، ۲۵۴ ۔
پنجاب : ۳۸، ۳۹، ۶۰، ۶۹، ۷۱، ۷۲،
۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷،
۱۳۹، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۹۲ ۔
پنجابی کٹرا، دہلی : ۱۵۲ ۔
پورب : ۶۰، ۶۹ ۔
پونا : ۲۰۸ ۔
تہران : ۹، ۲۷۵ ۔
ٹونک : ۱۹۰ ۔
جامعہ نگر، نئی دہلی : ۲۲۳ ۔
جان نثار خاں کا چھتہ، دہلی : ۱۵۰، ۱۵۱ ۔
جمنا : ۱۴۱، ۱۶۴ ۔
جھانسی : ۶۸ ۔
جہانگیر آباد : ۱۹۳ ۔
جھجر : ۸۷، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۹۷، ۱۹۸ ۔
جے پور : ۱۹۹ ۔
چاوڑی، دہلی : ۱۹۰ ۔
چوک، چاندنی چوک، دہلی : ۹۳، ۹۱، ۱۰۳،
۱۴۱، ۱۵۰ ۔
حجاز : ۱۶۸ ۔
حصار : ۱۹۷ ۔
حیدرآباد (دکن) : ۱۹۵، ۲۱۹، ۲۵۶ ۔
حیدرآباد (سندھ) ۲۱۹، ۲۴۰ ۔
خاص بازار، دہلی : ۱۵۰ ۔
خان چند کا کوچہ، دہلی : ۱۵۰، ۱۵۱ ۔
خانم بازار، دہلی : ۱۵۰ ۔
دارا گنج الہ آباد : ۲۰۸ ۔
دریائے شور : ۱۹۲ ۔
دریبہ دہلی : ۱۹۰ ۔
دجانہ : ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۳۰، ۱۹۷ ۔
دہلی : ۳، ۱۴، ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۵، ۳۳،
۳۹، ۴۵، ۵۳، ۵۵، ۵۶، ۶۱،

۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۸،
۶۰، ۶۱، ۶۴، ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۶،
۸۶، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۳،
۹۵، ۹۶، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶،
۱۱۳، ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰،
۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶،
۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۶، ۱۴۷،
۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۶،
۱۵۰، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۳، ۱۶۶، ۱۶۷،
۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۸۰،
۱۸۰، ۱۸۲، ۱۸۵، ۱۸۶،
۱۹۰، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۴، ۲۰۷، ۲۱۹، ۲۲۳،
۲۲۵، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۶،
۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۵، ۲۴۸، ۲۵۰ -

دہلی دروازہ، دہلی: ۹۱، ۱۶۰ -
دھوبی واڑہ: ۱۵۲ -
دیوانِ خاص، دہلی: ۸۱ -
دیوانِ عام، دہلی: ۱۰۳ -
ڈیفینس کالونی، نئی دہلی: ۲۲۵ -
راج گھاٹ دروازہ، دہلی: ۱۵۱ -
راس اُمید: ۱۶۰ -
رامپور: ۱۲، ۲۵، ۳۲، ۳۳، ۶۱، ۷۶،
۷۲، ۸۹، ۹۸، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۶۶،
۱۸۰، ۱۸۶، ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۲۶، ۲۳۳ -
رام جی گنج، دہلی: ۱۵۲ -

راولپنڈی: ۲۵۳ -
رچمن اسٹریٹ، سیادون نگر: ۹ -
رنگون: ۱۶۰ -
روس: ۱۱۵ -
روم: ۹۶، ۱۱۳ -
روہیل کھنڈ: ۲۴، ۶۲، ۶۳ -
ریواڑی: ۱۰۱ -
ستارا: ۲۰۸ -
سرکلر روڈ، لاہور: ۲۲۵ -
سرگودھا: ۲۱۹، ۲۵۵ -
سعادت خاں کا کٹرا: ۱۵۲ -
سلطان جی، دہلی: ۱۹۸، ۱۶۱ -
سولنا: ۲۰۰ -
سونک: ۲۰۰ -
سونہہ: ۱۰۱ -
شاہ بولا کا بڑ، دہلی: ۱۵۰ -
شاہ جہاں آباد: ۱۶۴ -
شمالی ہند: ۴۰ -
شملہ: ۲۲۴ -
شیراز: ۱۰۹، ۱۱۰ -
علی گڑھ: ۷، ۱۰، ۲۹، ۴۳، ۶۵، ۱۶۹،
۲۰۰، ۲۰۳، ۲۰۹، ۲۲۳، ۲۲۹، ۲۳۳ -
غرب وشمال: ۳۹، ۵۴، ۵۹، ۱۹۲ -
فتح اللہ بیگ کا پھاٹک، دہلی: ۱۵۰ -
فرخ نگر: ۸۹، ۱۰۱، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۲۸،
۱۶۷، ۱۶۸ -

فلک پیرا، دہلی : ۱۵۱ -

فیروز پور جھرکہ : ۸۷ -

فیل خانہ، دہلی : ۱۵۰، ۱۵۱ -

قاری کا کنواں، دہلی : ۱۵۱ -

قاسم جان کی گلی، دہلی : ۱۴۹ -

قلعہ دارا گنج، الہ آباد : ۲۰۸ -

قلعہ معلّی، دہلی : ۱۲، ۱۵، ۲۵، ۲۸، ۴۰، ۵۴، ۶۳، ۶۹، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۹۱، ۹۲، ۹۸، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۱۰، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۸، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۶۰، ۱۶۶، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۴، ۱۸۱، ۱۸۶، ۱۹۰، ۲۰۱، ۲۱۴، ۲۳۷، ۲۴۲، ۲۴۶ -

قلعہ کا لاہوری دروازہ : ۱۵۱ -

کابل : ۱۷۴، ۲۱۷ -

کابلی دروازہ : ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۵۲ -

کالپی : ۱۲۸ -

کانپور : ۶۸، ۷۴ -

کراچی : ۹، ۱۶، ۱۰، ۲۲، ۷۶، ۱۰۱، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۸۹، ۱۹۰، ۲۱۹، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۵۴، ۲۵۶ -

کرنال : ۱۱۰ -

کشمیری دروازہ دہلی : ۹۰، ۹۱، ۱۵۲ -

کشمیری کٹرا، دہلی : ۱۵۱ -

کلکتہ : ۲۹، ۳۸، ۴۵، ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۵۲، ۱۶۲، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۸، ۲۵۲ -

کلکتہ دروازہ، دہلی : ۱۵۲ -

کوٹ قاسم : ۱۶۶ -

کوچہ بلاقی بیگم، دہلی : ۱۵۰ -

کوئٹہ : ۲۵۴ -

کیپ آف گڈ ہوپ : ۱۷۰ -

گنجہ : ۱۰۱ -

گنگا : ۳۵ -

گوالیار : ۶۵، ۱۱۱ -

گوڑگانوہ : ۱۵۵ -

لال ڈگی، دہلی : ۱۵۰، ۱۵۱ -

لال کنواں، دہلی : ۱۵۰ -

لاہور : ۱، ۲، ۹، ۲۱، ۴۴، ۴۹، ۵۲، ۶۰، ۷۳، ۸۱، ۱۱۰، ۱۳۹، ۱۵۶، ۱۶۲، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۵، ۱۸۹، ۲۰۰، ۲۰۸، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۵۴، ۲۵۵ -

لاہوری دروازہ، دہلی : ۶۳، ۱۳۵، ۱۴۷، ۱۵۱، ۱۵۷ -

لائل پور : ۱، ۹، ۲۲، ۲۱۵، ۲۲۵ -

لکھنؤ : ۸، ۲۳، ۷۳، ۷۳، ۸۹، ۱۰۱، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۳۳، ۱۵۱، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۸۶، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۰، ۲۱۲، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۸، ۲۳۷ -
لندن : ۹، ۳۰، ۷۷، ۹۷، ۱۷۰، ۲۰۸، ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۴۴ -
لوہارو : ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۳۰، ۱۵۰، ۱۹۷، ۱۹۱ -
ماڈل ٹاؤن، لاہور : ۷۳، ۲۲۳ -
مارہرہ : ۱۲۸ -
مرادآباد : ۱۱۰ -
مرشدآباد : ۱۲۸، ۱۲۹ -
مکۂ مکرمہ : ۱۹۸ -
ممالکِ مغربی : ۳۸، ۶۰ -
مہرولی : ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۹۷ -
میرٹھ : ۷۶، ۸۲، ۹۱، ۱۱۲، ۱۲۰، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۶، ۱۴۵، ۱۵۳، ۱۹۳، ۱۶۸، ۱۷۶، ۲۲۸ -
میرخیراتی کا پھاٹک، دہلی : ۱۵۰ -
ناظم آباد، کراچی : ۲۳۹ -
نوح : ۱۰۱ -
نیل کا کٹرہ، دہلی : ۱۱۲ -
ولایت : ۳۳، ۳۴، ۴۱، ۴۵، ۶۰، ۹۱، ۱۲۶، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۸، ۱۵۵، ۱۶۲، ۱۷۰، ۲۰۲ -
ہانسی : ۱۹۷ -
ہند، ہندوستان، بھارت، انڈیا : ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۲۸، ۲۹، ۲۷، ۲۹، ۳۰، ۴۲، ۴۳، ۴۹، ۵۳، ۵۴، ۶۴، ۶۵، ۶۷، ۶۹، ۷۰، ۷۵، ۷۶، ۸۰، ۸۴، ۸۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۱، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۴۱، ۱۴۳، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۱، ۱۶۹، ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۷، ۱۸۸، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۲۹، ۲۴۸، ۲۵۲ -
یو۔ پی : ۲۲۷ -
یورپ : ۱۹ -

اَسماءُاللسان :

اُردو : ۱، ۶، ۹، ۱۶، ۱۹، ۲۳، ۲۹، ۳۳، ۴۶، ۵۹، ۱۲۲، ۱۳۲، ۱۵۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۹، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۰۸، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶۔

انگریزی : ۱۳، ۲۸، ۲۹، ۴۹، ۶۹، ۱۱۲، ۱۳۱، ۱۳۲، ۲۰۸، ۲۱۶، ۲۲۲۔

ترکی : ۲۲۲۔

ریختہ (اُردو) : ۱۹۳۔

عربی : ۹، ۱۳، ۲۶، ۲۸، ۴۲، ۴۳، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۶۹، ۱۱۲، ۲۲۶، ۲۲۹، ۲۳۷، ۲۴۷۔

فارسی : ۹، ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۲۶، ۲۷، ۲۹، ۳۲، ۴۳، ۴۴، ۴۹، ۵۱، ۵۳، ۵۴، ۶۹، ۱۲۸، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۰۷، ۲۲۲، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۴۔

فارسی قدیم، خالص فارسی : ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۲۳، ۲۶، ۲۸، ۴۲، ۴۳، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۶۷، ۶۹، ۱۱۲، ۱۱۶، ۲۲۹، ۲۳۷، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۸۔

ہندوستانی : ۱۶۸۔

ہندی : ۱۳، ۲۸، ۱۱۲۔

ہندی (اُردو) ۱۶۲، ۱۸۹، ۱۹۲، ۱۹۳۔

•

Books etc., (*English*)

A History of the Indian Mutiny, by Holmes : 65

A Lady's Escape from Gwalior: 65.

Bombay Telegraph : 63.

Forty Years in India, by Lord Roberts : 64.

Ghalib . Life and Letters, by Ralph Russel and Khurshid-ul-Islam : 9.

History of Indian Jouroalism, by Natarajan : 29.

History of the Indiao Mutiny, Vol. I, by Charles Ball : 66, 209.

History of the Indian Mutiny, Vol. II, by Charles Ball : 212, 213.

History of the Indiao Mutioy, Vol. II, by Kay & Malleson . 66, 100.

History of the Sepoy War, Vol. II, by Sir John Kay : 67

History of the Sepoy War, Vol. III, by Sir John Kay : 210.

Indian aod Home Memories, by Sir Henry Cotton : 64.

Iadian Empire, by Barns : 29.

Life of Lawrence, Vol. II, by Baswarth Smith : 63, 65.

My Diary in India in the Year 1856-59, Vol. I : 64.

Narrative of the Indian Revolt 66.

Parliamentary Papers, Vol. 44, pt. I : 10.

Red Pamphlet, by G. B. Malleson : 210.

Russell's Diary, 65, 211, 212.

The Chaplain's Narrative of the Seige of Delhi : 63.

The Time, London, 25th August, 1858 : 68

Up among the Pandies, by Lieut. Majendie : 64, 212

بابائے اردو کی حیات اور خدمات پر ہماری اہم کتابیں:

ذکرِ عبدالحق

——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ———

"ذکرِ عبدالحق" دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ ذکرِ عبدالحق کا" اور بیان معین صاحب کا" کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا۔ معین الرحمٰن صاحب نے ان تمام امور کا بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا ہے جن کے بغیر عبدالحق کی داستان مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کام کے لئے معین صاحب، تمام نیاز مندانِ عبدالحق کے شکریے کے مستحق ہیں۔ ——— مشفق خواجہ

"ذکرِ عبدالحق" میں معین صاحب نے عقیدت اور تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ ——— ابن انشا

بابائے اردو — احوال و افکار

——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ———

"بابائے اردو — احوال و افکار" بےحد خوش وقت ہوا۔ یہ کام مستقل تصنیف سے بدرجہا زیادہ مشقت طلب اور صبر آزما تھا۔ معین الرحمٰن صاحب نے اسے نہایت خوش اسلوبی اور جامعیت سے انجام دیا۔ اس کی تحسین کے لئے الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ ——— مولانا غلام رسول مہر مرحوم

نقدِ عبدالحق

——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ———

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، جامع الحیثیات شخص تھے۔ سید معین الرحمٰن صاحب نے مولوی صاحب کی ادبی زندگی کے رخ کے بارے میں مقالات کا انتخاب کیا ہے۔ انتخاب کا مسئلہ نازک ہوتا ہے لیکن فاضل مرتب نے مولوی صاحب کے بارے میں لکھی گئی منتشر تحریروں کو جس سلیقے اور محنت سے کھنگالا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ "نقدِ عبدالحق" حسنِ ترتیب اور موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے ہمارے سرمایۂ علمی میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ ——— ڈاکٹر وحید قریشی

سنگِ میل پبلی کیشنز — اردو بازار — لاہور

آپ بیتی — رشید احمد صدیقی

——— مرتب: ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ———

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب کے ذوق و شوق اور سلیقے نے اس تالیف کو رشید صاحب اور علی گڑھ کا ایک جیتا جاگتا مرقع بنا دیا ہے۔ کیا کیا صورتیں جو دل میں لبسی ہوئی ہیں، پھر آنکھوں میں پھر گئیں! کیا کہیں:

بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو؟

——— (پروفیسر) خواجہ منظور حسین (علیگ)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے جس کاوش اور جانفشانی سے رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی تشکیل دی ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

——— مختار مسعود

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن صاحب نے رشید احمد صدیقی کی مختلف تحریروں کی مدد سے اُن کی ایک خوبصورت مربوط آپ بیتی مرتب کی ہے، اس اعتبار سے یہ آپ بیتی اُردو زبان و ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو اس سے پہلے اس سطح پر کسی نے انجام نہیں دیا۔

——— ڈاکٹر جمیل جالبی

مُطالعۂ یلدرم

——— ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ———

یلدرم کے ساتھ اب تک نقادوں اور ادبی مورخوں نے جو شدید بے انصافی برتی تھی، خوشی ہوئی کہ سید معین الرحمٰن صاحب نے اس کی طرف توجہ کی اور یلدرم کو ریسرچ کا موضوع بنایا۔ معین صاحب نے انتہائی لگن اور خلوص اور محنت کے ساتھ بے حد اہم اور مفید کام کیا اور بڑی ضروری خدمت انجام دی۔ اس کی بے حد ضرورت تھی۔

——— قرۃ العین حیدر

معین صاحب نے ہمارے ادب اور معاشرے میں سجاد حیدر یلدرم کے بلند مقام کو اس خوبی سے نمایاں کیا ہے کہ میری ادبی حس اور قومی ضمیر دونوں اس پر مرحبا کہتے ہیں۔

——— پروفیسر حمید احمد خاں

یلدرم نے اُردو افسانے اور اُردو کے نثری اسلوب کو جو کچھ دیا ہے اُس کے اعتراف اور شکر گزاری کی اس سے بہتر شکل ممکن نہیں تھی جیسی "مطالعۂ یلدرم" کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

——— پروفیسر سید وقار عظیم

سنگِ میل پبلی کیشنز — چوک اُردو بازار — لاہور

"باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ"

——— زہرا معین

"باغ و بہار" کے اس تنقیدی مطالعہ میں زہرا معین نے کرداروں کے تجزیے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ آج اس تجزیہ کو اپنا رہنما بنائیے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے قصے کے ظاہر سے گزر کر اس کے باطن تک رسائی حاصل کی ہے۔ کسی فنی تخلیق کا ایسا تجزیہ جو اُسے پہلے سے زیادہ اہم بنا دے، اسے بہترین مطالعہ کہنا چاہیے اور زہرا معین کی یہ کتاب اس علمی ادبی اور نفسیاتی ضرورت کو قابلِ تحسین انداز میں پورا کرتی ہے۔

——— سید وقار عظیم

محترمہ زہرا معین نے "باغ و بہار" کا ایک بالکل نئے انداز میں تنقیدی اور کرداری مطالعہ پیش کیا ہے اور ہر جگہ اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ تصنیف "باغ و بہار" کے مطالعات میں ایک بڑا وقیع، بہت جاندار اور قابلِ تحسین کارنامہ ہے۔

——— میرزا ادیب

زہرا معین، اسلامیہ کالج برائے خواتین، لاہور میں اُردو کا درس دیتی ہیں۔ شاعرہ اور ادیبہ دونوں حیثیت سے جانی پہچانی ہیں۔ اُنھوں نے جب لکھا ہے، پوری چھان بین اور احتیاط سے لکھا ہے، ذمہ داری اور اعتماد کے ساتھ لکھا ہے۔ "باغ و بہار کا تنقیدی اور کرداری مطالعہ" زہرا معین کا بھرپور تنقیدی اور تحقیقی کام ہے۔ "باغ و بہار" کے کرداروں کا اب تک پوری طرح تحقیقی و تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا تھا۔ اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی۔ زہرا معین نے باغ و بہار کا مطالعہ جس زاویۂ نظر سے کیا ہے، وہ بالکل انفرادی ہے۔ اُنھوں نے بعض ایسی راہوں کی نشان دہی کی ہے جن سے لوگ اب تک بے خبر تھے۔

——— ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ میر امن پر اب تک جو کام ہو چکا ہے، زہرا معین نے اُس سب کو نظر میں رکھا ہے اور اس پر بیشتر عمدہ محاکمہ کر کے اپنی الگ رائے قائم کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ میر امن کے مطالعہ کے کچھ نئے گوشے سامنے لاتی ہیں۔ افسانے کی اہمیت کے اس دور میں یہ کتاب اہلِ ادب پر "باغ و بہار" کی نئی اہمیت بخوبی واضح کرے گی۔

——— انور سدید

سنگِ میل پبلی کیشنز — چوک اُردو بازار — لاہور